محاضراتِ تعلیم

ڈاکٹر محمود احمد غازی

دار العلم والتحقیق
برائے اعلیٰ تعلیم و ٹیکنالوجی

بسم الله الرحمن الرحیم

محاضرات تعلیم

دار العلم والتحقیق

برائے اعلیٰ تعلیم و ٹیکنالوجی

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

مطبوعات: ۱۴

مسلمانوں کے دینی و عصری نظام تعلیم کے حوالے سے بصیرت افروز
اور چشم کشا محاضرات اور تقاریر کا مجموعہ

محاضراتِ تعلیم

ڈاکٹر محمود احمد غازی
رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تدوین
سید عزیز الرحمٰن

نام کتاب: محاضراتِ تعلیم
مؤلف: ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ
ترتیب وتدوین: سید عزیز الرحمٰن
پہلا ایڈیشن: دسمبر ۲۰۰۹ء (بہ عنوان: مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم)
دوسرا ایڈیشن: دسمبر ۲۰۱۳ء
طبع چہارم: مارچ ۲۰۲۱ء
تعداد: ایک ہزار
صفحات: ۳۶۸

اہتمام
دار العلم والتحقیق
برائے اعلیٰ تعلیم و ٹیکنالوجی
info@rahet.org - www.rahet.org
research academy for higher education & technology

ناشر
زوار اکیڈمی پبلی کیشنز
اے-۴/۱۸، ناظم آباد نمبر ۴، کراچی-۷۴۶۰۰، فون: ۳۶۶۸۴۷۹۰
zawwar academy publication

فہرست

پیش گفتار	سید عزیز الرحمٰن	۷
طبع دوم	سید عزیز الرحمٰن	۹
دیباچہ	مولانا زاہد الراشدی	۱۳
عالم اسلام میں تعلیمی تجربات		۱۷
پاکستان میں دینی تعلیم۔ پس منظر و پیش منظر		۳۵
دینی تعلیم اور عصر حاضر میں اس کی معنویت		۴۹
دینی مدارس: مفروضے، حقائق، لائحہ عمل		۷۱
قدیم و جدید تعلیم میں ہم آہنگی		۹۵
دِینی و عصری تعلیم کا اِمتزاج۔ فوائد و نقصانات		۱۰۹
مسلمانوں کی تعلیمی روایت اور عصر حاضر		۱۴۵
اکیسویں صدی میں پاکستان کے تعلیمی تقاضے		۱۵۷
مغرب کا فکری اور تہذیبی چیلنج اور علما کی ذمے داریاں		۲۸۵
دینی مدارس میں تخصص اور اعلیٰ تعلیم و تحقیق		۳۲۹
ضمیمہ		
عصر حاضر میں علما کی ذمے داریاں		۳۴۳
مسلکی اختلاف اور اس کی حدود		۳۵۷

انتساب

ماہر تعلیم، استاد، محقق، ماہر لسانیات اور سیرت نگار

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی رحمہ اللہ

کے نام

پیش گفتار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دینی تعلیم، مدارس اور دینی جامعات کے کردار، برعظیم پاک وہند میں مسلمانوں کی تعلیم کے نقوش اور مسلمانوں کے نظام ونصاب تعلیم کے حوالے سے لکھنے والے عرصے سے مسلسل لکھ رہے ہیں، اور غور و فکر کے مختلف انداز اختیار کر کے نئی تجاویز، نئی آرا، نئے رجحانات تسلسل کے ساتھ سامنے لا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض اداروں اور شخصیات نے اس قدر کام کیا ہے کہ انہیں اس میدان کا متخصص قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ کی شخصیت بھی کچھ اسی قسم کی معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا اصل میدان اختصاص قانون وشریعت اسلامی تھا، اس حوالے سے ان کی تحریریں عوام وخوص دونوں سطحوں پر مقبول ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک طویل عرصے تک جہاں نئے پیش آمدہ مسائل، نئے سوالات اور نئے حالات کے تناظر میں اپنی تحقیقات پیش کیں، وہیں نئے حالات میں دینی تعلیم کے منہج، اسلوب، نصاب اور نظام پر بھی گفت گو فرمائی۔ یہ متفرق گفت گو مفید معلوم ہوئی تو راقم نے ڈاکٹر صاحب سے تذکرہ کیا، اور ان کی اجازت سے مخدوم مکرم مولانا زاہد الراشدی کی سرپرستی میں برادر مکرم مولانا حافظ عمار خاں ناصر کی معاونت سے اسے مرتب کر دیا۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۹ء میں ''مسلمانوں کا دینی و عصری نظام تعلیم'' کے عنوان سے الشریعہ اکادمی گجراں والا سے شائع ہو گیا۔

اس وقت تک ڈاکٹر صاحب کے سلسلۂ محاضرات کی متعدد جلدیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی تھیں۔ اس وقت ڈاکٹر کے مستقبل کے خاکے میں تعلیم پر علیحدہ سے مرتب بارہ محاضرات بھی شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ محاضرات اس مجموعے سے زیادہ مفید ہوتے کہ وہ مرتب اور ایک مربوط خاکے مطابق پیش کیے جاتے۔

بہ ہر کیف اب چوں کہ یہ ممکن نہیں رہا، اور ڈاکٹر صاحب اپنی ذمے داریوں کی تکمیل کے بعد اپنے رب کے حضور حاضر ہو چکے، اس لیے اب اس مجموعے کو مزید اضافوں کے ساتھ محاضرات تعلیم کے عنوان سے پیش کیا جارہا ہے۔

اس مجموعے میں چار خطبات کا اضافہ کیا گیا ہے، اس طرح ڈاکٹر صاحب کے سلسلۂ محاضرات کی تعداد کی مطابق اس مجموعے میں شامل خطبات کی تعداد بھی بارہ ہو گئی ہے، الحمد للہ

اس مجموعے میں درج ذیل امور کا خیال رکھا گیا ہے۔

۱۔ چار خطبات کے اضافے کے ساتھ پوری کتاب کے پروف دوبارہ پڑھے گئے ہیں۔

۲۔ مناسب اور ضروری مقامات پر حواشی اور حوالوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۳۔ حوالے اور حواشی اسی صفحے پر درج کیے گئے ہیں۔

امید ہے یہ مجموعہ بھی ڈاکٹر صاحب کی دیگر کتب کی طرح ہمارے علم اور معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ بہت سی الجھنوں کے ازالے کا باعث ہو گا۔

کتاب میں پہلی اشاعت کا پیش گفتار بھی برقرار رکھا گیا ہے، اور یہ مجموعہ اب الشریعہ اکادمی کی اجازت سے دارالعلم والتحقیق کے تحت شائع ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ صاحب محاضرات کو اپنی شایان شاں اجر عطا فرمائے، اور یہ کاوش ہم سب کی جانب سے قبول فرمائے۔ آمین

بجاہ سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین

سید عزیز الرحمٰن

۱۵ صفر المظفر ۱۴۳۶ھ / ۸ر دسمبر ۲۰۱۴ء

طبع اول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کسی بھی قوم کے عروج وزوال میں تعلیم اور نظام ونصاب تعلیم کا کردار کسی ذی شعور سے پوشیدہ نہیں۔ دینی امور ہوں یا دنیاوی، ہر معاملے میں تعلیم کا کردار نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ خود مسلمانوں کا حال ہمارے سامنے ہے۔ ان کی پوری تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جب تک ان کا نظام تعلیم درست نہج پر استوار اور مستند ہاتھوں میں رہا، اس وقت تک ان کا جھنڈا بلند اور ان کا نام کامیابیوں کی ضمانت سمجھا جاتا رہا، اور جب مسلمان اپنے نظام ونصاب تعلیم کے حوالے سے تساہل پسندی کا شکار ہوئے تو ان کی دنیاوی وجاہت اور دینی وقار دونوں رفتہ رفتہ ان کے لیے اجنبی ہوتے چلے گئے۔

مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں برصغیر پاک وہند کے تجربات نہایت اہم ہیں۔ یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے تاریخ نے ایک نیا موڑ لیا۔ اس نے اس خطے کے مسلمانوں کی تعلیم، ثقافت، تہذیب، تمدن، علوم وفنون، رہن سہن ہر چیز کا جغرافیہ بدل کر رکھ دیا۔ اس کے شواہد بہ کثرت موجود ہیں کہ یہی کچھ مقصود بھی تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں شکوہ ان سے نہیں، اپنے آپ سے ہونا چاہیے۔ وہ تو غیر تھے، وہ یہ کچھ نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ کیا وہ ہمارے مقاصد کی تکمیل کے لیے اس خطے میں

آئے تھے؟ سوال یہ ہے کہ ہم نے کیا کیا؟ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ سوال اہم ہے کہ ہم آج کیا کر رہے ہیں؟ ہم تو آج تک اس بحث بل کہ کج بحثی سے باہر نہیں نکل سکے کہ علی گڑھ تحریک نے کیا کیا غلطیاں کیں اور دار العلوم دیوبند کے فکر و عمل میں کیا کیا کوتاہیاں رہیں۔ ان اداروں کی تاریخ میں جو خوبیاں پنہاں ہیں اور ان اداروں نے ہمیں جو کچھ عطا کیا، اس کی روشنی میں ہم آئندہ کے لیے بل کہ اپنے ''آج'' کے لیے اگر کچھ کر گزریں، پھر ان کی فرو گزاشتوں پر تبصرہ فرمائیں، تب بھی کوئی بات ہے۔ محض بحث برائے بحث اور صدی ڈیڑھ صدی پہلے گزر جانے والوں کی خطا شماری سے، جب کہ مقصد آج بھی ان سے سبق حاصل کرنا نہ ہو، ہمیں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

ہمارے تعلیمی مسائل پر مختلف جہتوں سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس موضوع سے تعلق رکھنے والے مختلف ادارے اور شخصیات اپنی آرا سے قارئین کی رہ نمائی کرتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیمی موضوعات پر ایک وقیع سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے، مگر عام طور پر یہ ہوا ہے (گو اس میں استثنائی صورتیں موجود ہیں) کہ تعلیمی مسائل کے حوالے سے قلم اٹھانے والے فضلا یا تو عصری علوم سے واقفیت رکھتے ہیں اور دینی علوم اور ان کی تعلیم میں مسلمانوں کے منہج اور اس کی تاریخ و روایت سے زیادہ آگاہ نہیں ہوتے، اور یا دینی حوالے سے قلم اٹھاتے ہیں تو محض دینی تعلیم کی اہمیت کا اظہار ان کا مقصود ہوتا ہے۔ یہ صورت حال تحریر کو یک طرفہ بناتی ہے اور ایسی صورت میں حقائق تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔

زیر نظر کتاب کے فاضل مولف جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی کے تعارف کی نہ ضرورت ہے اور نہ راقم اس کا اہل ہے۔ اس کتاب کے مباحث در حقیقت جناب غازی صاحب کے مختلف محاضرات ہیں جو متفرق مواقع پر دیے گئے۔ ان میں سے ہر محاضرہ یا خطبہ اپنی جگہ ایک مستقل کتاب کی اہمیت رکھتا ہے، اور اسی سبب سے یہ الگ الگ کسی نہ کسی شکل میں شائع ہو کر وسیع حلقے میں مقبول بھی ہو چکے ہیں۔ راقم کی نظر میں ان محاضرات کی دو خوبیاں اسے تعلیم کے حوالے سے موجود ذخیرے سے ممتاز کرتی ہیں۔

ایک تو یہ ڈاکٹر صاحب کا تجزیہ نہایت مُحتاط ہے اور انھوں نے اسلاف کی خطا شماری کو مقصود بنائے بغیر ماضی کا بے لاگ تجزیہ کیا ہے اور مستقبل کے لیے ہماری راہیں متعین کی ہیں۔ دوسرے وہ جدید و قدیم، دینی و عصری دونوں طرح کے علوم سے نہ صرف پوری طرح واقف ہیں بل کہ ایک عرصے سے تدریسی ذمہ داریاں بھی انجام دے رہے ہیں۔ اس بنا پر تعلیمی مسائل پر ان کی نظر وسیع بھی ہے اور عمیق بھی۔ وہ مسائل پر بات کرنے سے پہلے ان اسباب پر بات کرتے ہیں جن سے ان مسائل نے جنم لیا اور پھر ان کے حل کے لیے نہ صرف راہیں متعین کرتے ہیں بل کہ اس راستے میں پیش آنے والی ممکنہ رکاوٹوں کا ذکر کر کے ان اقدامات کی بھی نشان دہی کرتے ہیں جو ان رکاوٹوں کو دور کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بعض مقامات پر تنقید بھی کی ہے مگر یہ تنقید تعمیری تنقید ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بات دلیل کے ساتھ ہے، ان کا اسلوب حکیمانہ ہے اور ان کی تنقید ہمیں آگے بڑھنے کی تحریک بھی دیتی ہے۔ ان کا لہجہ ایک دل دردمند کا لہجہ ہے جو حالات حاضرہ پر صرف کڑھنے کو کافی نہیں سمجھتا، بل کہ سوئے ہوؤں کو بیدار کرنے کی تڑپ بھی رکھتا ہے۔ کتاب کا موضوع اہم ہے، مگر اس سے زیادہ دلوں میں اتر جانے والا وہ اسلوب اہم ہے جو ہر سننے اور پڑھنے والے پر اپنا تاثر بھی چھوڑتا جاتا ہے اور عمل کا داعیہ بھی پیدا کرتا ہے۔

راقم نے ان مباحث کی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب سے انھیں مرتب کرنے کی اجازت چاہی اور ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ کی طرح شفقت کا مظاہرہ فرماتے ہوئے اجازت عطا فرمائی جس پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔ راقم نے کوشش کی ہے کہ اس مجموعے کے مندرجات میں تکرار کم سے کم ہو، مگر چوں کہ یہ تمام محاضرات مختلف اوقات میں اور مختلف مواقع پر دیے گئے ہیں، اس بنا پر قدرے تکرار ناگزیر ہے۔ کچھ مقامات پر آیات اور احادیث کے حوالے درج کرنے کی بھی کوشش کی ہے تا کہ یہ مجموعہ قارئین کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکے۔

یہ کتاب الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ سے شائع ہو رہی ہے۔ کتاب کی ترتیب

واشاعت میں الشریعہ اکادمی کے ڈائریکٹر اور ہمارے مخدوم مولانا زاہد الراشدی اور ان کے ساتھ ساتھ الشریعہ اکادمی کے روح رواں برادرم جناب عمار ناصر صاحب کی خصوصی دل چسپی میرے لیے موجب امتنان ہے۔ برادر محترم جناب شبیر احمد خان میواتی کا بھی شکریہ کہ وہ اس کتاب کی ترتیب کے محرک رہے اور انھوں نے بعض خطبات کی فراہمی میں بھی تعاون کیا۔

کتاب اپنا تعارف خود ہے۔ قارئین سے فاضل مولف، گرامی قدر ناشرین اور حقیر مرتب کے لیے دعاؤں کی درخواست ہے۔

سید عزیز الرحمٰن
دارالعلم والتحقیق، کراچی
یکم محرم ۱۴۳۱ھ / ۱۹ر دسمبر ۲۰۰۹ء

دیباچہ

مولانا زاہد الراشدی

نحمدہ تبارک وتعالی ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین

عالم اسلام پر مغربی استعماری ممالک کے تسلط کے گزشتہ دو صدیوں پر محیط دورانیے پر ایک نظر ڈالی جائے تو جہاں ایک طرف یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ سیاست، معیشت، ایڈمنسٹریشن، عسکری قوت، تعلیم، سائنس، ٹیکنالوجی اور اس نوعیت کے دیگر اجتماعی شعبوں میں مسلمانوں کو دنیا بھر میں مغربی استعمار کی یلغار کے سامنے مسلسل سپر انداز ہونا پڑا ہے اور وہ اپنی روایتی شناخت اور امتیاز سے بہ تدریج محروم ہوتے چلے گئے ہیں، وہاں یہ منظر بھی ہمارے سامنے ہے کہ عقیدے اور ثقافت کے محاذ پر مغربی استعمار کی یہ یلغار مسلمانوں کے قدموں کو ڈگمگانے میں کام یابی حاصل نہیں کر سکی، بل کہ دینی تعلیمات اور مذہبی اقدار کی طرف مسلمانوں کی واپسی کی رفتار اور تناسب میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے، جس پر آج کی مغربی دانش کو سخت پریشانی کا سامنا ہے، اس لیے کہ تمام تر خرابیوں کے باوجود ایک مسلمان کی ذاتی اور خاندانی زندگی میں آج بھی مذہب سب سے بڑا حوالہ ہے اور

قرآن و سنت اس کی عقیدت و وفاداری کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ عام مسلمان کی عقیدت اور جذباتی وابستگی میں کوئی فرق نہیں آیا، جس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ قرآن کریم کسی تحریف و تبدل کے بغیر اصلی حالت میں مسلمانوں کے پاس موجود ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اعمال اور حالات و واقعات کا مستند اور جامع ذخیرہ اس کی راہ نمائی کے لیے میسر ہے، لیکن اس کے ساتھ ان افراد و طبقات کی مخلصانہ مساعی بھی اس سلسلے میں کلیدی کردار کی حیثیت رکھتی ہیں جنھوں نے قرآن و سنت اور ان سے متعلقہ علوم کی حفاظت اور ان کی ترویج و تدریس میں بے پناہ ایثار و استقامت کے ساتھ قابل قدر قربانیاں دی ہیں اور تعلیمات کے تحفظ و ترویج کے ساتھ ساتھ ان پر عمل درآمد کے ماحول کو باقی رکھنے کی بھی کام یاب کوشش کی ہے۔

اس میں جہاں مساجد، مدارس اور خدا ترس بزرگوں کی خانقاہوں کا کردار نمایاں ہے، وہاں ان دانش وروں اور اصحاب علم کی خدمات بھی انتہائی اہمیت کی حامل ہیں جنھوں نے دینی علوم کے علاوہ عصری علوم میں بھی مہارت حاصل کی، قدیم و جدید کے علمی ذخیروں پر مکمل دست رس کے ساتھ اسلامی عقیدہ و ثقافت اور علوم و روایات کے تحفظ و ترویج کا محاذ سنبھالا، مغرب کی فکری و ثقافتی یلغار کا پورے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ سامنا کیا اور دلیل و دانش کے ساتھ اسلام کا مقدمہ نئی نسل کے سامنے پیش کر کے اسے گم راہی اور ارتداد سے محفوظ رکھنے میں کافی حد تک کام یاب رہے۔

آج کی مسلمان نسل میں اگر دین کے ساتھ وابستگی کا ذوق موجود ہے بل کہ یہ جذبہ ترقی کرتا نظر آرہا ہے اور اسلامی عقائد و روایات کی طرف اس کے رجوع کا رجحان مسلسل بڑھ رہا ہے تو اس کے پیچھے جہاں مساجد و مدارس کے عمومی ماحول اور دعوت و تبلیغ کے پھیلتے ہوئے دائرے کارفرما ہیں، وہاں ان ارباب فکر و دانش کی سعی و محنت کا حصہ بھی اس میں کم نہیں ہے جو بہ ظاہر عصری تعلیمی اداروں میں عصری علوم

وفنون کی تدریس میں مصروف ہیں، لیکن ایک سچے اور بصیرت وحکمت سے بہرہ ور مسلمان کے طور پر نئی نسل کو فکری گم راہی اور ثقافتی کج روی سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی پوری فکر مندی اور حوصلہ واستقامت کے ساتھ خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ہمارے دور میں اس ذوق کی نمائندگی کرنے والوں میں محترم ڈاکٹر محمود احمد غازی صف اول کے راہ نما اور دانش ور ہیں جو اگرچہ علما کے روایتی حلقے کے نمائندہ نہیں سمجھے جاتے، لیکن دین کی علمی روایت کو آگے بڑھانے اور غیر روایتی حلقوں میں اسلامی تعلیمات وروایات پر استقامت اور پختگی کا ذوق بیدار کرنے میں ان کا کردار اپنی اہمیت وافادیت میں کسی بڑے روایتی ادارے سے کم نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی اس حلقے میں بیٹھ کر منطق واستدلال اور فکر ودانش کے ہتھیاروں کے ساتھ دینی روایت کی جنگ لڑ رہے ہیں، جسے عام طور پر گم راہی اور کج روی کا شکار سمجھا جاتا ہے اور ان کا وجود اس ماحول میں اسلام کی علمی روایت اور دینی اقدار کے ساتھ اپنا شعوری رشتہ قائم رکھنے کے خواہش مند افراد وطبقات کے لیے بہت بڑا سہارا ہے۔

مختلف موضوعات پر ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کے محاضرات، مقالات اور بیانات وخطبات قدیم وجدید دونوں حلقوں کے لیے یک ساں افادیت کے حامل ہیں اور اپنے مواد، قوت استدلال اور ندرت فکر کے حوالے سے اہل علم کے لیے بیش بہا تحفہ ہیں۔ ان کے مقالات وخطبات کا زیر نظر مجموعہ دینی وعصری تعلیم کے موضوع پر جن عنوانات کا احاطہ کرتا ہے، وہ آج کے اہم اور حساس موضوعات ہیں اور ان پر ڈاکٹر صاحب کا اظہار خیال آج کی ضروریات اور تقاضوں کی طرف ارباب علم ودانش کو توجہ دلانے کی ایک کام یاب کوشش ہے جس پر وہ شکریے اور تبریک کے مستحق ہیں۔

عزیز گرامی ڈاکٹر سید عزیز الرحمن نے ان خطبات ومقالات کو ایک مجموعے کی شکل دے کر ایک اہم علمی خدمت انجام دی ہے اور الشریعہ اکادمی کے زیر

اہتمام اسے اس دعا کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے کہ اللہ رب العزت اس مجموعے کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے راہ نمائی کا ذریعہ بنائیں اور ڈاکٹر صاحب موصوف کو صحت وعافیت کے ساتھ زیادہ دیر تک دین اور علم کی خدمت کرتے رہنے کی توفیق سے نوازیں۔

آمین یارب العالمین

ابو عمار زاہد الراشدی
ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی، گجراں والا
۱۹ / دسمبر ۲۰۰۹ء

عالم اسلام میں تعلیمی تجربات

تنظیم اساتذہ پاکستان کے زیر اہتمام

لاہور میں منعقدہ ایک تعلیمی مذاکرے میں خطاب

ماہ نامہ تعمیر افکار، کراچی۔ جولائی ۲۰۱۳ء

عالم اسلام میں تعلیمی تجربات

قابل احترام جناب پروفیسر سید محمد سلیمؒ۔
برادر محترم جناب ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی۔
اساتذہ کرام۔ خواتین و حضرات۔

آج کی اس محفل کا موضوع ہے عالم اسلام میں تعلیمی تجربات اور تعلیم کے میدان میں دنیائے اسلام میں کی جانے والی کاوشیں۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو دنیائے اسلام کے بیشتر ممالک میں تعلیم کے باب میں پاکستان کے تجربے سے مختلف تجربات نہیں ہوئے، بل کہ جن مراحل و مدارج سے ہم اہل پاکستان کو گزرنا پڑا، تقریباً ویسے ہی مدارج و مراحل اور ویسی ہی مشکلات اور ویسے ہی مسائل کا سامنا قریب قریب تمام برادر مسلم ممالک میں تعلیم سے وابستہ لوگوں کو کرنا پڑا ہے، دنیائے اسلام مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک دو سو سال سے زائد مختلف مغربی استعماری قوتوں کے زیر اثر رہی۔ اس پورے علاقے میں مغربی افکار، مغربی تعلیمی تصورات اور استعماری مفادات کے تحت تعلیمی ادارے، تحقیقی منصوبے اور افکار سازی یعنی منفی افکار سازی کے ادارے قائم کئے گئے اور ان کے وہی نتائج سامنے آئے، جن سے ہم اہل پاکستان کو اچھی طرح واسطہ پڑ چکا ہے اور مسلسل واسطہ پڑ رہا ہے۔

جب آغاز میں مختلف مغربی طاقتوں نے دنیائے اسلام پر تسلط حاصل کیا اور اپنے افکار و نظریات کو وہاں تھوپنے کی کوشش کی، تو دنیائے اسلام کے تقریباً تمام

ممالک میں ابتدا میں دو قسم کے رد عمل سامنے آئے:

ایک رد عمل وہ تھا جس کو ہم کہہ سکتے ہیں مغربی افکار سے غیر معمولی مرعوبیت کا رد عمل تھا۔ جنہوں نے یہ محسوس کیا کہ دنیائے اسلام کے مسائل و مشکلات کے حل کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مغربی افکار و نظریات کو، مغربی تصورات تعلیم کو اور مغربی تعلیمی اداروں کو جوں کا توں قبول کرلیا جائے، اور دنیائے اسلام کے مزاج اور تصورات، امنگوں اور آرزوں کا لحاظ رکھے بغیر ان کو اسی طرح قبول کرلیا جائے، جس طرح مغربی ممالک نے انہیں دنیائے اسلام میں بر آمد کیا تھا۔

ہندوستان میں، برصغیر میں بیسیوں ایسے ادارے قائم کئے گئے جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ مغربی تہذیب، مغربی علوم و فنون اور مغربی نظریات کو مسلمان نوجوانوں مین اسی طرح عام کیا جائے جس طرح وہ ہندوؤں میں عام ہورہے تھے۔ جس طرح وہ انگلستان میں عام ہوئے تھے۔ جس طرح وہ دنیائے اسلام کے دوسرے ممالک میں اہل مغرب کے ہاتھوں عام کئے جارہے تھے۔ یہ مثالیں ہندوستان میں بھی ملتی ہیں، مصر میں بھی، ترکی میں بھی، انڈونیشیا اور ملائیشیا میں بھی، مراکش اور الجزائر میں بھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طبقے کے نمائندہ حضرات وہ مصر کے طہٰ حسین ہوں، ہمارے برصغیر کے نواب عبداللطیف ہوں یا اس طرح کی دوسری شخصیتیں ہوں، ان سب نے ایک ہی چشمے سے آب یاری کی ہے، اور ایک ہی چشمے سے یہ سب کے سب مستفید ہوئے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا رد عمل بھی تھا، جو دنیائے اسلام کے ان تمام ممالک میں سامنے آیا۔ یہ رد عمل تھا، غور و فکر کا، حسن و قبیح کو جانچنے اور پرکھنے کا، اس کے تحت مسلمان اہل علم اور ارباب دانش نے کھل کر ان پہلوؤں کی اس طرح نشان دہی کی، جیسے ایک طبیب نبض پر انگلی رکھ کر مرض کی مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کرتا ہے اور بیماری کا علاج پیش کردیتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کو دنیا ایک پرمزاح شاعر کی حیثیت میں جانتی ہے لیکن اکبر الہ آبادی کی زندگی کا یہ پہلو ذرا چھپ جاتا ہے کہ انہوں نے مغربی تہذیب کے ان کم زور پہلوؤں کو امت کے

سامنے رکھا جو عام طور پر مسلمانوں کی مرعوبیت کا ذریعہ بن سکتے تھے۔ اور اس طرح سے عام مسلمانوں کے ایک بہت بڑے طبقے کو اس سیلاب میں بہنے سے محفوظ رکھا، جس سیلاب میں ان کے غیر ہندی بھائی تیزی کے ساتھ بہتے چلے جارہے تھے۔ علامہ اقبالؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور ان جیسے کئی مفکرین نے اتنی قوت، دقت نظر اور بصیرت کے ساتھ مغربی افکار و نظریات پر تنقید کی، جس کی مثال اس وقت بھی دنیائے اسلام بالخصوص دنیائے عرب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس لیے یہ بات کہنا حق بہ جانب ہو گا کہ تعلیم کے میدان میں جو تجربات برعظیم میں ہوئے، ان تجربات کو اولیت کا شرف حاصل تھا اور دنیائے اسلام میں وہ تجربات بہت بعد میں دہرائے گئے۔

باقی مسلم دنیا کافی بعد اس مرحلے سے گزری، جس مرحلے سے جنوبی ایشیا کے مسلمان بہت پہلے یعنی آج سے پچاس، پچھتر سال پہلے گزر چکے تھے۔ یوں تو دنیائے اسلام کے تجربات یک ساں اقسام کے ہیں۔ لیکن بعض ممالک ایسے ہیں جہاں کا تجربہ بڑا نمایاں اور بہت کام یاب رہا ہے۔ ان میں عرب ممالک بھی شامل ہیں، غیر عرب ممالک بھی شامل ہیں۔ اس مختصر گفت گو میں یہ بڑا دشوار رہے کہ دنیائے اسلام کے تمام تجربات کا ذکر کیا جائے، لیکن بہ طور نمونہ چند ممالک کے بعض اہم تجربات مختصر طور پر میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

مصر

ابھی میں نے عرض کیا کہ مصر کو ایک طویل عرصے سے عرب دنیا میں امامت اور فکری قیادت کا مقام حاصل ہے۔ جامعہ ازہر جو دنیائے اسلام کے تین قدیم ترین درس گاہوں میں سے ایک ہے، جو تقریباً ایک ہزار ستر سال سے اسلامی علوم و فنون کی تعلیم اور نشر و اشاعت کا فریضہ سر انجام دے رہی ہے، اس نے اہل مصر کی دینی تربیت میں اور ملی ساخت میں اتنی گہری جگہ بنائی ہے، اور اتنا گہرا کردار ادا کیا ہے کہ اہل مصر کی زندگی سے اس کو دور کر دینا یا اسلامی عناصر سے اہل مصر کو دور کر

دینا اتنا دشوار ہے کہ دنیا کے کسی بھی طاقت کے لیے نہ ممکن ہوا ہے اور نہ شاید آئندہ کسی کے لیے ممکن ہو سکے۔

سن ۱۹۵۲ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک کا دور جبروت، دور استبداد اور تاریکیوں کا دور گزرا ہے، جس میں کوشش کی گئی کہ مصر کی اجتماعی اور ملی زندگی سے اسلام کے تصورات کو خارج کر کے ایک سیکولر، لامذہب، اشتراکی معاشرے کی تشکیل کی جائے، یہ کوشش ناکام رہی۔ اہل مصر آج بھی ویسے ہی مسلمان ہیں جیسے ۱۹۵۲ء سے پہلے مسلمان تھے۔ دینی تصورات اور دینی تحریکات وہاں اتنی ہی طاقت ور ہیں، اتنی ہی با اثر ہیں جتنی ۱۹۵۲ء سے پہلے با اثر تھیں، اس میں اللہ رب العزت کے فضل و رحمت سے جہاں دوسری دینی تحریکات کا دخل ہے، وہاں مصر کے اس مضبوط دینی نظام تعلیم کا بھی بڑا اثر ہے، جو ایک ہزار سال سے وہاں قائم ہے۔ سن ۱۹۵۲ء کے انقلاب کے بعد کوشش کی گئی کہ جامعہ ازہر کے اس کردار کو بدل کر اس کو ایک ایسی سیکولر یونیورسٹی کی شکل دے دی جائے جو اپنا وہ کردار بھول جائے جو ایک ہزار سال سے وہ انجام دیتی چلی آرہی تھی، اور اسی طرح سے عام سیکولر یونیورسٹی بن جائے جیسے مصر کی باقی یونیورسٹیاں تھیں۔ چناں چہ پہلے قدم کے طور پر وہاں خواتین کی دینی تعلیم کے خوش نما نعروں سے مخلوط نظام تعلیم شروع کیا گیا۔ سیدنا علی بن ابی طالب کا مشہور جملہ ہے، جو انہوں نے خوارج کے ایک نعرے کے جواب میں کہا تھا:

كلمة حق يريد بها الباطل

اگرچہ یہ کلمہ تو خیر ہے، کلمہ تو حق کا ہے۔ لیکن مقصد اس کا برا اور باطل ہے۔

یہی نعرہ مصر میں بلند کیا گیا اور خواتین کی دینی تعلیم کے نام پر جامعہ ازہر میں مخلوط تعلیم کو فروغ دیا گیا۔ جامعہ ازہر میں ایسے شعبے قائم کئے گئے، جن کا مقصد بہ ظاہر یہ کہا گیا کہ ایسے دین دار ماہرین طب، ماہرین ہندسہ اور دوسرے فنون کے ماہرین پیدا کرنے ہیں جو دینی تعلیم بھی رکھتے ہوں۔ لیکن مقصد یہ تھا کہ دینی تعلیم اس پورے نظام میں اس طرح کم زور ہو جائے کہ جامعہ ازہر کا وہ مضبوط دینی کردار نہ رہے جس کی وجہ سے وہ ایک چٹان بنا ہوا تھا۔

دینا اتنا دشوار ہے کہ دنیا کے کسی بھی طاقت کے لیے نہ ممکن ہوا ہے اور نہ شاید آئندہ کسی کے لیے ممکن ہو سکے۔

سن ۱۹۵۲ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک کا دور جبروت، دور استبداد اور تاریکیوں کا دور گزرا ہے، جس میں کوشش کی گئی کہ مصر کی اجتماعی اور ملی زندگی سے اسلام کے تصورات کو خارج کر کے ایک سیکولر، لامذہب، اشتراکی معاشرے کی تشکیل کی جائے، یہ کوشش ناکام رہی۔ اہل مصر آج بھی ویسے ہی مسلمان ہیں جیسے ۱۹۵۲ء سے پہلے مسلمان تھے۔ دینی تصورات اور دینی تحریکات وہاں اتنی ہی طاقت ور ہیں، اتنی ہی بااثر ہیں جتنی ۱۹۵۲ء سے پہلے بااثر تھیں، اس میں اللہ رب العزت کے فضل و رحمت سے جہاں دوسری دینی تحریکات کا دخل ہے، وہاں مصر کے اس مضبوط دینی نظام تعلیم کا بھی بڑا اثر ہے، جو ایک ہزار سال سے وہاں قائم ہے۔ سن ۱۹۵۲ء کے انقلاب کے بعد کوشش کی گئی کہ جامعہ ازہر کے اس کردار کو بدل کر اس کو ایک ایسی سیکولر یونیورسٹی کی شکل دے دی جائے جو اپنا وہ کردار بھول جائے جو ایک ہزار سال سے وہ انجام دیتی چلی آ رہی تھی، اور اسی طرح سے عام سیکولر یونیورسٹی بن جائے جیسے مصر کی باقی یونیورسٹیاں تھیں۔ چناں چہ پہلے قدم کے طور پر وہاں خواتین کی دینی تعلیم کے خوش نما نعروں سے مخلوط نظام تعلیم شروع کیا گیا۔ سیدنا علی بن ابی طالب کا مشہور جملہ ہے، جو انہوں نے خوارج کے ایک نعرے کے جواب میں کہا تھا:

کلمة حق یرید بها الباطل

اگرچہ یہ کلمہ تو خیر ہے، کلمہ تو حق کا ہے۔ لیکن مقصد اس کا برا اور باطل ہے۔

یہی نعرہ مصر میں بلند کیا گیا اور خواتین کی دینی تعلیم کے نام پر جامعہ ازہر میں مخلوط تعلیم کو فروغ دیا گیا۔ جامعہ ازہر میں ایسے شعبے قائم کئے گئے، جن کا مقصد بہ ظاہر یہ کہا گیا کہ ایسے دین دار ماہرین طب، ماہرین ہندسہ اور دوسرے فنون کے ماہرین پیدا کرنے ہیں جو دینی تعلیم بھی رکھتے ہوں۔ لیکن مقصد یہ تھا کہ دینی تعلیم اس پورے نظام میں اس طرح کم زور ہو جائے کہ جامعہ ازہر کا وہ مضبوط دینی کردار نہ رہے جس کی وجہ سے وہ ایک چٹان بنا ہوا تھا۔

لیکن اللہ رب العزت کی مشیت یہ تھی کہ اہل مصر اس دینی اساس پر قائم رہیں۔ ان تمام کاوشوں کے باوجود جامعہ ازہر کے اس کردار کو تبدیل نہیں کیا جاسکا بل کہ جامعہ ازہر پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑھتا چلا گیا۔ انہوں نے کوشش کی جامعہ ازہر کی مرکزیت کو توڑ دیا جائے۔ اس کے لیے کہا گیا کہ بہ جائے اس کے کہ ساری کلیات کا ارتکاز قاہرہ میں ہو، پورے مصر میں جامعہ ازہر کے کلیات قائم کر دیے جائیں، چناں چہ وہ جامعہ ازہر جو صرف قاہرہ میں تھا وہ مصر کے ہر گوشے میں پھیل گیا۔ آج مصر کا کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں جامعہ ازہر کا کوئی کلیہ موجود نہ ہو۔ اس کے بعد جب سادات کا زمانہ آیا اور سادات کے چند ابتدائی سالوں میں جس میں اسلامی قوتوں کو تھوڑی سی آزادی ملی اور بعد میں کیمپ ڈیوڈ کے سمجھوتے کے بعد جب سادات نے پھر اسلامی قوتوں کو دبانا شروع کیا اور پھر حسنی مبارک کے دور میں مزید سختی کی پالیسی اختیار کی گئی، اس دور میں جامعہ ازہر کے شیخ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں جگہ دے، مجھے خود بہ راہ راست ان کے کام کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، خود ان کی زبانی اس کی تفصیلات سننے کا اتفاق ہوا۔ عام طور پر اسلامی صحافت میں، اسلامی رسائل و جرائد میں ان کا نام مثبت انداز سے نہیں لیا جاتا۔ شیخ جاد الحق علی جاد الحق۔ انہوں نے اس زمانے میں شیخ الازہر کا منصب سنبھالا، جب سادات اپنے دور عروج پر تھا اور آج سے کچھ عرصے قبل ان کا انتقال ہوا۔ اس بارہ سال کے عرصے میں انہوں نے خاموشی کے ساتھ بغیر کسی پروپیگنڈے کے، بغیر کسی اعلان کے اور حکومت سے بغیر کسی مخالفت کے ایک متوازی اور متوازن پورا نظام کھڑا کیا۔ آپ اس کو ایک پیرالر سسٹم آف ایجوکیشن کہہ سکتے ہیں کہ مصر میں سیکولر تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ ایک پورا نظام انہوں نے بنا دیا، جس کے تحت گاؤں گاؤں، قریہ قریہ انہوں نے پرائمری اسکول، انٹرمیڈیٹ اسکول، سیکنڈری اسکول، پھر کالجز، کلیات اس طرح بنا دیے کہ چند سال پہلے مجھے جامعہ ازہر کے ایک بہت ذمے دار عہدے دار نے بتایا کہ اس وقت پورے سیکولر نظام تعلیم میں جتنے طلبہ تعلیم پا رہے ہیں اتنے ہی طلبہ جامعہ ازہر کے تعلیمی اداروں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ جہاں حفظ قرآن ایک لازمی شرط کی

حیثیت رکھتا ہے۔

آپ اندازہ کریں کہ جہاں چھ لاکھ بچے ہر سال حفظ قرآن کرتے ہوں اور پورے ملک میں قریہ قریہ، گاؤں گاؤں دینی تعلیم دی جارہی ہو۔ آئندہ دس، پندرہ سال بعد جب یہ نسل میدان میں آئے گی تو اس کے کتنے مثبت اثرات ہوں گے۔ اور اسلامی قوتوں کو کتنی افرادی قوت دست یاب ہو گی۔ یہ ایک بڑا چھوٹا سا کام ہے جو ایک ایسے شخص نے کیا، جس نے دس سال خاموشی کے ساتھ تعلیم کی خدمت کی اور ایک ایسے نامناسب اور معاندانہ ماحول میں جہاں اسلامی قوتوں کے لیے اسلام کے نام سے کام کرنا دشوار سے دشوار تر بنایا جارہا تھا، ایسا کارنامہ کر دکھایا جو اللہ رب العزت کی مشیت اور مہربانی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

ترکی

اسی نوعیت کی چیز اس سے زیادہ حیرت انگیز انداز میں ترکی میں نظر آتی ہے۔ ترکی وہ ملک ہے جہاں سیکولرازم اور لامذہبیت کو بہ طور سیاسی پالیسی اور بہ طور مذہب اور دین کے اختیار کیا گیا۔ اور پچھلے ستر، اسی سال میں ریاستی جبر اور قوت کا کوئی ایسا حربہ نہیں چھوڑا گیا جو سیکولرازم اور لامذہبیت کو زبردستی مسلط کرنے کے لیے اختیار نہ کیا گیا ہو۔ ہزاروں افراد کو قتل کیا گیا۔ ہزاروں افراد کو گھر سے بدر کیا گیا۔ ہزاروں افراد کی جائیدادیں نیلام کی گئیں، لیکن اس کے باوجود ایک ترک مسلمان کے دل ودماغ سے اس کے رگ وپے سے اسلامی جذبات واحساسات دور نہیں کئے جاسکے۔ آج بھی وہاں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ حکومت کے اعلی عہدے داروں میں، مسلح افواج کے اعلی افسران میں کوئی دینی حمیت، دینی جذبے کا کوئی عنصر، کوئی شائبہ رہنے نہ دیا جائے۔ ترکی کے بعض ذمے دار حضرات نے بتایا کہ جن میں مسلح افواج کے بڑے بڑے دین دار افسر بھی شامل تھے، جو اندر سے بڑا دینی جذبہ رکھتے تھے۔ انہوں نے خود کہا کہ ایک خاص سطح کے بعد اس بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ کوئی شخص جو شراب نوشی سے احتراز کرتا ہو، جس

کے گھر کی خواتین مخلوط اجتماعات میں مردوں کے ساتھ حصہ نہ لیتی ہوں، جو کسی بھی معاملے میں دینی جذبے یا احترام کا اظہار کرتا ہو، اس کو ایک خاص سطح سے آگے بڑھنے نہیں دیا جاتا۔

اس ماحول میں جہاں ملک کے دستور میں سیکولرازم اور لامذہبیت کا فروغ اس کی اساسی پالیسی کے طور پر لکھا گیا ہو، جہاں دستور کے اس حصے کو ناقابل تغیر اور ناقابل تبدل قرار دے دیا گیا ہو، جہاں آٹھ، دس لاکھ کی مسلح افواج کو اس سیکولرازم کے تحفظ کی ذمے داری دی گئی ہو، اس ماحول میں ایک ایسا متوازی نظام بنادینا جس نے لاکھوں کی تعداد میں دینی درد رکھنے والے جوان پیدا کردیے۔ یہ ایک معجزہ ہے جو اللہ کی مشیت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ آپ نے سنا اور پڑھا ہوگا کہ ۱۹۵۰ء میں وہاں ایک نئی پارٹی برسراقتدار آئی اور یہ پہلے انتخابات تھے جو ملٹی پارٹی بنیاد پر یعنی کثرت جماعت کی بنیاد پر منعقد ہوئے تھے۔ اور وہاں ایک نئی پارٹی اقتدار میں آئی، جس کے سربراہ عدنان میندریس تھے اور انہوں نے جلال بایار کو صدر منتخب کیا۔ انہوں نے پہلی مرتبہ سرکاری انتظام میں امام و خطیب مدارس کے نام سے بعض مدارس قائم کئے۔ جنہوں نے بہت جلد اتنی مقبولیت حاصل کرلی کہ آج ترکی کا کوئی شہر، کوئی قصبہ اور شاید کوئی بڑا گاؤں ایسا نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی امام و خطیب مدرسہ موجود نہ ہو، اور چند برس پہلے ترکی کے وزیر اعظم نے پاکستان کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ ان کے قریبی مشیر جو ہماری بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں، وہ بھی تشریف لائے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت کے اعداد و شمار کے رو سے ترکی کے عام سیکولر تعلیمی اداروں میں جتنے طلبہ زیر تعلیم ہیں تقریباً اتنے ہی طلبہ امام و خطیب مدارس میں زیر تعلیم ہیں، اور ان کو جازت ہے کہ وہ عام اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹیوں میں جاسکیں، تعلیمی اداروں میں جاسکیں یہ فنی تعلیم حاصل کرسکیں، سرکاری ملازمتوں میں جاسکیں، ابھی تک مسلح افواج میں نہیں جاسکتے، لیکن بقیہ تمام سرکاری ملازمتوں اور اداروں میں وہ جاسکتے ہیں۔

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ دینی حمیت اور دینی جذبہ رکھنے والے جب اتنی بڑی تعداد میں اور اتنی کثرت کے ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں میں جائیں گے تو وہاں ان کے اثرات، ان کی کاوشوں کے نتائج و ثمرات کیا ہوں گے؟ آج اگر ترکی میں نجم الدین اربکان کے حامی بائیس اور چوبیس فی صد ہیں تو اس کی بہت بڑی وجہ دینی تعلیم کے وہ ادارے بھی ہیں جو سن ۱۹۵۰ء سے قائم ہونا شروع ہوئے تھے اور تیزی کے ساتھ جن کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔

خود مجھے استنبول اور ترکی کے کئی دوسرے مقامات پر بعض ایسے مدارس میں جانے کا اتفاق ہوا جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ متعلمین ہیں، طلبہ ہیں یا کسی مجاہد کی تربیت گاہ کے تربیت لینے والے ہیں۔ استنبول کے ایک تنگ و تاریک گلی میں ایک آٹھ منزلہ عمارت میں جانے کا اتفاق ہوا، اگلی صبح میری واپسی تھی اور اس مدرسے کے لوگوں کا اصرار تھا کہ میں ضرور اس مدرسے میں جا کر ان سے ملوں، عشا کے بعد کا وقت طے ہوا، اس وقت جب کہ ترکی اور استنبول کی بیشتر آبادی سونے کی تیاریاں کر رہی تھی اس وقت آدھی رات کے قریب اس آٹھ منزلہ عمارت کے کئی ہزار طلبہ دینی تعلیم میں مصروف تھے۔ حفظ قرآن کی کلاسیں ہو رہی تھیں۔ تجوید قرآن کے اساتذہ ان کو تجوید پڑھا رہے تھے، حدیث کے اساتذہ حدیث پڑھا رہے تھے، حتیٰ کہ اسلام اور سیاسیات کے موضوع، اسلام اور جدید معاشی نظریات کے موضوعات، اسلام اور جدید ورلڈ آرڈر جیسے موضوعات پر سینئر اساتذہ ان کو لیکچر دے رہے تھے اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ ایک ایسی تربیت گاہ ہے، جہاں نئے دور کے مجاہدین اور نئے ترکی کے تعمیر کرنے والے معمار تیار ہو رہے ہیں۔ جب اس طرح کی نسلیں آگے نکلیں گی تو کتنے نتائج اور ثمرات ہمارے سامنے آئیں گے؟ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سعودی عرب

تعلیم کے میدان میں شاید سب سے زیادہ کامیاب تجربہ دنیائے اسلام کے جس

ملک میں ہوا وہ سعودی عرب ہے، سعودی عرب کے بارے میں ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ سعودی حکومت ایک خاص اور منفرد نوعیت کی حکومت ہے۔ جس کا آغاز ایک ایسی دینی تحریک کی شکل میں ہوا تھا، جس نے پوری دنیائے اسلام پر اپنے اثرات اور ثمرات چھوڑے ہیں۔ آج کی سعودی حکومت کس حد تک ان دینی تصورات پر قائم ہے جن سے اس کا آغاز ہوا تھا، یہ دوسری گفت گو کا موضوع ہے، لیکن سعودی حکومت کا آغاز جب ہوا تو ایک ایسی دینی تحریک کے سیاسی دست وبازو کے طور پر ہوا تھا، جس نے نہ صرف جزیرہ عرب میں بل کہ عرب دنیا کے بیشتر حصے میں اتنے گہرے نتائج اور ثمرات چھوڑے ہیں کہ آج بھی وہ محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

آپ نے سنا ہوا ہو گا کہ آج سے دو سو سال پہلے وہاں ایک ایسی با اثر اور طاقت ور دینی تحریک نے جنم لیا جس کو اس کے مخالفین نے وہابی تحریک کا نام دیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے عقائد کی اصلاح کی جائے، مسلمانوں میں جو غیر اسلامی عقائد اور تصورات پیدا ہو گئے ہیں، ان کو دھو کر صاف کیا جائے۔ مسلمانوں میں اگر ایسے رواجات پیدا ہو گئے ہیں جو غیر اسلامی رواجات ہیں، ان سے مسلمانوں کو بچانے کی تلقین کی جائے۔ اس سادہ اور مختصر دعوت پر اس تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ جس نے بہت جلد عرب دنیا کو اس طرح اپنے حلقہ اثر میں لیا کہ ان کے بعد کی عرب دنیا کی تاریخ بہت حد تک اس سے متاثر کی تحریک ہے، لیکن یہ تحریک ایک طویل عرصے تک محض ایک فکری اور نظری تحریک رہی اور کوئی علاقہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ اپنے تصورات اور نظریات کے مطابق کوئی حکومت قائم کر سکے۔ بانی تحریک کے انتقال کے تقریباً بیس، پچیس یا تیس سال کے بعد ان کے جانشینوں کے درمیان اور نجد کے علاقے کے ایک بااثر عرب قبیلے آل سعود کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ جس میں یہ طے پایا کہ سیاسی اور انتظامی ذمے داری آل سعود کی ہو گی اور دینی، تربیتی، تعلیمی اور اخلاقی کام کرنے کی ذمے داری آل شیخ یعنی شیخ محمد بن عبدالوھاب کے اولاد کی ہو گی۔ ان دونوں کے درمیان یہ معاہدہ ہوا

تھا جو آج بھی لکھا ہوا ہے اور سعودی عرب کی جدید تاریخوں میں اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اس کے نتیجے میں نجد کے علاقے عیینہ میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم ہوئی، جس نے بہت جلد عرب دنیا کے بیشتر حصے پر قبضہ کرلیا اور ۱۹۲۵ء ۱۹۲۶ء میں اس نے پورے جزیرہ عرب کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ ۱۹۲۵ء ۱۹۲۶ء سے لے کر آج تک کا زمانہ سعودی عرب میں اسلامی نظام تعلیم کے باب میں نہ صرف نئے نئے تجربات کا زمانہ ہے، بل کہ دنیائے اسلام میں تعلیم کے میدان میں جتنی کاوشیں ہوئی ہیں اس میں سعودی اہل علم اور سعودی اصحاب ثروت کے وسائل کا بہت بڑا حصہ ہے۔

سعودی ارباب ثروت کے وسائل اور سعودی اہل علم کے فعال مشاورت کے نتیجے میں دنیائے اسلام نے تعلیم کے بارے میں متعدد کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ۱۹۷۸ء میں ۱۹۷۹ء میں ۱۹۸۰ء ۱۹۸۲ء میں ڈھاکہ میں متحدہ یمن میں، اسلام آباد میں، کوالالمپور میں اور دنیائے اسلام کے کئی ممالک میں اس طرح کی کانفرنسیں منعقد ہوئیں، جس میں اسلامی تصورات جو اس کا بہتر متبادل ہوں، دلائل سے دنیائے اسلام کے سامنے پیش کے گئے یعنی وہ تحریک جو بعد میں اسلامائزیشن آف نالج کی تحریک کہلائی وہ ان کانفرنسوں سے ابھری، ان ہی کانفرنسوں میں یہ تجویز بھی دی گئی کہ پندرھویں صدی ہجری کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دنیائے اسلامی جا بہ جا ایسے بین الاقوامی اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں جہاں دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں کے مسلمان جمع ہو کر نہ صرف دینی تعلیم کو نئے انداز میں حاصل کریں بل کہ جدید علوم وفنون کو اسلام کے سیاق وسباق میں اور اسلام کے پس منظر میں ایک تنقیدی نظر کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں۔ چناں چہ ۱۹۸۰ء میں اسلام آباد میں اور غالباً ۱۹۸۱ء یا ۱۹۸۲ء میں کوالالمپور میں یہ قراردادیں پاس کی گئیں کہ او آئی سی یا ایسے دوسرے اداروں کے انتظام میں بین الاقوامی اسلامی یورنیورسٹیاں قائم کی جائیں۔ اس قراداد پر عمل درآمد کے طور پر اسلام آباد کی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی وجود میں آئی۔ کوالالمپور کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی وجود میں آئی، ایک یونیورسٹی ڈھاکہ کے قریب تنگائن میں وجود میں آئی، ایک اسلامی یونیورسٹی نائیجیر افریقہ میں وجود میں آئی، ایک اسلامی یونیورسٹی یوگنڈا میں وجود میں آئی، ایک اسلامی یونیورسٹی اردن کے شہزادہ حسن نے جامعہ اہل البیت کے نام سے قائم کی، ایک اسلامی یونیورسٹی جامعہ اہل البیت کے نام سے مراکش میں شاہ حسن کے ہاتھوں قائم کی گئی۔ اسی طرح سعودی عرب میں بعض نئے تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ مکہ مکرمہ کے کیمپس کو ایک الگ یونیورسٹی کے طور پر جامعہ ام القریٰ کے نام سے قائم کیا گیا۔ اس میں ہمیں یہ بات بلاخوف تردید تسلیم کر لینی چاہیے اور اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ان قراردادوں اور کانفرنسوں میں جن تصورات اور خیالات کا اظہار کیا گیا تھا، ان پر سب سے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ جس ملک میں عمل کیا گیا وہ سعودی عرب تھا۔ وہاں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک دینی تعلیم کا حصہ اتنا قیمتی اور اتنا مضبوط ہے، ان کی تعلیم کا اسلامی تناظر اتنا مضبوط ہے کہ ایک عام سعودی تعلیم یافتہ اپنے عقیدے میں، اپنے نظریے میں اور اپنے اسلامی تصورات میں جتنا پختہ ہوتا ہے اس کا عشر عشیر بھی پاکستان میں یا کسی دوسرے مسلم ملک میں نہیں ہوتا۔

اس کا اندازہ مجھے وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے آپ حضرات میں سے جن کو سعودی عرب جانے کا اتفاق ہوا ہو، آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں کا ایک ٹیکسی ڈرائیور، وہاں کا مزدور، وہاں کا دکان دار، عام دینی احکام کا جتنی شدت سے پابند ہے، اتنی شدت سے پابندی آپ کو دنیائے اسلام میں نظر نہیں آئے گی، ایک چھوٹا سا ذاتی تجربہ بیان کردیتا ہوں، غالباً سن ۱۹۹۰ء کے مارچ کی غالباً بات ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جارہا تھا اور لباس میں نے یہی پہنا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی سردی تھی تو میں نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور اس سے کچھ معاملہ کرنے کے بعد ۴۵۰ ریال کے بجائے ۴۰۰ ریال پر معاملہ طے ہوا۔ مکہ مکرمہ سے جب ہم روانہ ہوئے تو میں نے جیب سے قرآن مجید نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ میرے قرآن مجید

کے لہجے سے وہ سمجھا کہ یہ کوئی عرب ہے، جب میں پڑھ کر فارغ ہوا۔ قرآن پاک جیب میں رکھا، تو ڈرائیور نے پوچھا۔ماسمك؟ھل انت مصری؟ میں کہاں نہیں۔ کہنے لگا ترکی، میں نے کہا، نہیں۔ کہنے لگا پھر کون؟ میں نے کہا پاکستانی۔ اس نے بہت غصے کے عالم میں بڑی شدت کے ساتھ گاڑی کو بریک لگایا اور سڑک کے ایک طرف گاڑی کھڑی کر دی۔ مکہ مکرمہ سے نکلے ہوئے تقریباً ۱۰۰ یا ۸۰ میل کا فاصلہ گزر چکا تھا اس نے وہاں کے مقامی عربی لہجے میں کہا تمہارے ہاں عورت کیوں حکومت کرتی ہے؟ شرم نہیں آتی ایک عورت حکومت کرتی ہے۔ اب میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ میں اس کا کیا جواب دوں، تو میں نے کہا کہ اسے میں نے نہیں کہا تھا کہ تم حکومت کرو اور میں نے اسے منتخب نہیں کیا تھا۔ اس نے پھر کہا کہ تمہارے ہاں عورت کیوں حکومت کرتی ہے؟ جو زیادہ دل چسپ بات ہے وہ یہ کہ اس نے کہا کہ یا تو میری ٹیکسی سے اتر و یا ۴۰۰ ریال کے بجائے ۴۵۰ ریال مجھے دے دو۔

ممکن ہے اس نے بہانہ بنایا ہو اور ۴۰۰ ریال پر وہ پچھتا رہا ہو اور ۴۵۰ ریال کروانے کے لیے یہ ڈارمہ کیا ہو، لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ایک عام آدمی کے، ایک ٹیکسی ڈرائیور کے، جو باقاعدہ دینی تعلیم نہیں رکھتا، دینی عقائد اور دینی تصورات اتنے پختہ ہیں۔ آپ چھوٹا سا تجربہ کرکے دیکھیں، کوئی ایسی بات آپ کریں کہ جو ایک عام سعودی کے دینی تصور کے خلاف ہو، تو دیکھئے کہ وہ کتنی شدت کے ساتھ ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔

آج سے کوئی بیس سال پہلے کی بات ہے آپ نے ڈاکٹر معروف دوالیبی کا نام سنا ہوا ہوگا۔ جو ایک زمانے میں سعودی عرب کے شاہ خالد اور شاہ فیصل کے مشیر تھے۔ شام کے سابق وزیر اعظم تھے اور بڑے جید اہل علم میں سے ہیں۔ ایک بار وہ ہمارے ہاں ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے تھے اور اہل علم سے گفت گو کر رہے تھے۔ یہ غالباً ۱۹۷۷ء یا ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ اس زمانے میں کوالالمپور میں ایک شخص ہوا کرتا تھا جو

وکیل تھا، ذہنی طور پر کوئی پریشان حال تھا اور اپنے آپ کو عین کوالالمپوری کہا کرتا تھا اور وہ مدعی تھا کہ وہ امام مہدی ہے، بچارے کا ذہن درست نہیں تھا۔ وہ کسی طرح سے وہاں پہنچ گیا، شیروانی پہنی ہوئی تھی ٹوپی اور لباس سے بہت مستند اور ثقہ آدمی معلوم ہوتا تھا، ڈاکٹر دوالیبی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ میں نے پوچھا فرمایے۔ اس نے گفت گو شروع کی، میں امام مہدی ہوں، آپ میری بات سنیں اور یہ کریں وہ کریں۔ میں آپ کو سچ کہتا ہوں کہ ڈاکٹر دوالیبی جیسا سینئر آدمی، سوربون کا پڑھا ہوا یعنی فرانس کا پی ایچ ڈی، شام کا سابق وزیر اعظم، سابق اسپیکر اور پچھلے ۲۰، ۲۵ سال سے سعودی عرب کے مختلف حکم رانوں کا مشیر، انہوں نے اتنے شدید غیظ و غضب اور رد عمل کا اظہار کیا کہ مجھے نہیں اندازہ کہ پاکستان میں کوئی آدمی اس غیر اسلامی حرکت پر اتنے غیر معمولی رد عمل کا اظہار کرے گا، جو اگرچہ ایک پاگل اور غیر سنجیدہ آدمی سے سرزد ہوئی تھی، لیکن اس سے اس دینی جذبے کی شدت کا احساس آپ کرسکتے ہیں جو ایک سعودی عرب میں رہنے والے ایک عام مسلمان کے دل میں پایا جاتا ہے۔ یہ نظام تعلیم کی برکت ہے اور اس مضبوط اور اسلامی تناظر کی برکات ہیں جو وہاں کی نظام تعلیم میں اتنی مضبوطی کے ساتھ قائم ہے۔ آپ وہاں کے کسی اکانومی سے، کسی سعودی افسر سے، اعلیٰ سرکاری عہدے دار سے، کسی سیاسی عہدے دار سے، شاہی خاندان کے کسی آدمی سے گفت گو کریں، دینی معلومات کے بارے میں وہ آپ کو پاکستان کے بہت سے اہل علم سے بہت اونچا نظر آئے گا۔

یہ امر واقعہ ہے جس کا ہم ان تمام کم زوریوں کے باوجود جو وہاں کے نظام میں، وہاں کے معاشرے میں آگئی ہیں، ان تمام خرابیوں کے باوجود جس کے مشاہدہ ہم میں سے بہت سوں کو ہوا ہے۔ اس کے باوجود اس کامیابی کا ہمیں اعتراف کرنا چاہئے۔

اب سوال یہ ہے کہ سعودی عرب کے اس تجربے سے ہم کس حد تک فائدہ

اٹھا سکتے ہیں؟ ہم نے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں کوشش کی ہے کہ اس تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔ انہوں نے اسلامی تعلیم کا ایسالازمی نصاب تیار کیا ہے جو چار بڑے بھرپور نصاب پر مشتمل ہے۔ جو ہر اس طالب علم کے لیے لازمی ہے، جو دینی علوم میں تخصص نہ کررہا ہو، چاہے وہ انجینئرنگ کا طالبعلم ہو یا میڈیکل کا، کسی سوشل سائنس کا طالب علم ہو۔ اس کو لازماً وہ چاروں کورسز پڑھنے پڑتے ہیں۔ جس میں ایک کورس اسلامی عقائد اور تصورات پر، ایک سیرت اور خلفائے راشدین کی تاریخ پر، ایک اسلامی ثقافت اور تہذیب و تمدن پر اور ایک عام اسلامی تعلیمات اور فقہ اور روزہ مرہ زندگی کے احکامات کے بارے میں ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں اسلام کے احکام، تاجر کو تجارت کے میدان میں، مزارع کو زراعت کے میدان میں جن احکامات کی ضرورت پڑتی ہے، ان کی تعلیم کا ہمارے یہاں نہ سرے سے کوئی انتظام ہے نہ اس کی فراہمی کا کوئی بندوبست ہے اور شاید ۹۹فی صد تاجر ہمیں پاکستان میں ایسے ملیں گے جو تجارت کے ابتدائی اسلامی احکام سے بھی واقف نہیں ہوں گے۔ ہمیں کتنے مزارع ایسے ملیں گے جو زراعت کے احکام سے واقف ہیں؟ لیکن سعودی عرب میں شاید ہی کوئی ایسا تاجر ملے، آپ مکہ مکرمہ، جدہ، ریاض کسی بھی شہر جا کر دیکھ لیں جو اسلامی بنیادی تصورات سے واقف نہ ہو، یہ ان اسلامی نصابوں اور ان کے قیمتی اسلامی تناظر کے اثرات ہیں جو وہاں اختیار کیا گیا۔

ہم نے ان چاروں کورسز کو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں اختیار کیا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ ہم نے عربی زبان کو بہ طور لازمی مضمون کے اختیار کیا ہے اور اس وقت ہمارے ہاں ایم بی اے کے پروگراموں میں، ایم اے انگریزی کے پروگراموں میں اور کمپیوٹر سائنس، بی ایس سی، اور ایم ایس سی کے پروگراموں میں، اکنامکس میں یہ چاروں کورسز لازمی ہیں، جن کو ہم نے سہولت کی خاطر مختلف حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ کیا ہم اس میں کام یاب ہوں گے؟ اس میں ہم جزوی طور پر کام یاب ہوں گے، یا کلی طور پر کام یاب ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ

کو ہی بہتر طور پر معتبر معلوم ہے، لیکن یہ تجربہ ایسا ہے جس سے دنیائے اسلام کے ممالک کو فائدہ اٹھایا جانا چاہئے۔

ہمارے سامنے سوڈان کے تجربات بھی ہیں، بتایا گیا ہے کہ یہاں سوڈان کے مندوب پہنچنے والے ہیں، آپ خود ان کے زبان سے ان کے تجربات سن لیں گے۔ اسی طرح کے تجربات صومالیہ اور موریطانیہ میں بھی ہیں۔ افسوس کہ موریطانیہ پر کوئی لٹریچر یا کتابیں ہمارے ہاں موجود نہیں ہیں۔ لیکن موریطانیہ کا تجربہ بھی بہت کام یاب ہے، اور یہ مغربی افریقہ کا ایک ایسا ملک ہے جس کی طرف دوسروں کی نظر میں بھی نہیں ہیں، خود ہماری نظر میں بھی نہیں ہیں اور ہم اس کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتے۔ فقہ مالکی کی پیروی کرنے والے یہ مسلمان اتنے پختہ عقیدے پر قائم ہیں اور ان کے قانون میں، عدالتوں میں اور ان کے سرکاری دفاتر میں اسلامی تصورات اتنے شدت کے ساتھ کارفرما ہیں کہ اس کی مثالیں مسلم ممالک میں کم ملتی ہیں۔

انڈونیشیا اور ملائیشیا

اس طرح کا تجربہ انڈونیشیا اور ملائیشیا کا ہے، انڈونیشیامین سوہارتو کا دور اسلامی قوتوں اور تحریکات کے لیے بڑا نا گفتہ بہ زمانہ رہا۔ لیکن اسلامی تحریکات اور اسلامی قوتوں نے مظلومیت کے اس دور کو بے کار اور بے مصرف جانے نہیں دیا۔ بل کہ تعلیم پر انہوں نے اپنی توجہ صرف کی اور انجمن محمدیہ کے نام سے ایک ایسا نیٹ ورک پورے انڈونیشیا میں قائم کر دیا، جس کے انتظام میں ہزاروں تعلیمی ادارے کام کررہے ہیں۔ درجنوں اسلامی یونیورسٹیاں کام کررہی ہیں اور آج لاکھوں نہیں بل کہ کروڑوں نوجوان وہاں تعلیم پا رہے ہیں۔ آج اگر انڈونیشیا میں تبدیلی نظر آرہی ہے، آج اگر صدر سوہارتو کے مزاج اور رویے میں تبدیلی نظر آرہی ہے، آج اگر ان کی حکومت کی پالیسیوں میں کوئی تبدیلی معلوم ہوتی ہے تو اس میں ایک بہت بڑا حصہ ان دینی تعلیمی اداروں کا ہے جو انجمن محمدیہ نے اور دینی

قائدین نے انڈونیشیا میں قائم کئے۔

انڈونیشیا کے پڑوس میں ملایا یا ملائیشیا ایک ایسا ملک ہے جو طویل عرصے سے اپنے اخلاص اور پر جوش اسلامی جذبے سے سرشار ہے۔ وہاں مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت بڑی معمولی ہے، ان کے اپنے سرکاری اعداد و شمار کی رو سے مسلمان ۵۴ فی صد ہیں لیکن اس ۵۴ فی صد مسلمان نسبتاً کم تعداد ہونے کے باوجود جذبۂ عمل سے سرشار ہیں۔ آپ اندازہ کیجئے کہ ہمارے ہاں مشرقی پاکستان میں ہندو ۲۰ فی صد سے کم تھے ۱۵، ۲۰ فی صد کے درمیان تھے انہوں نے کیا قیامت ڈھائی۔ آپ اندازہ کریں وہاں غیر مسلموں کی تداد ۴۶، ۴۷ فی صد ہے جس میں ۲۰ فی صد کے قریب جنوبی ہندوستان سے جانے والے ہندو ہیں، بقیہ چینی بدھسٹ ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان مفادات کا اتنا اتحاد ہے اور مسلمانوں کے بارے میں یہ اتنے محتاط اور Careful ہیں کہ مسلمانوں کے لیے ذرا بھی پیش قدمی بڑا دشوار ہے، لیکن ملائیشیا کے مسلمانوں نے بہت کامیابی کے ساتھ اتنی پیش رفت کی ہے کہ قوانین کے ذریعے، ملک کے دستور کے ذریعے اور تعلیمی اداروں کے ذریعے وہاں کی دینی زندگی کو اور اسلامی کردار کو اتنی مضبوطی کے ساتھ پختہ بنایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی تھوڑی اکثریتکے باوجود اتنا بڑا کام کیسے ممکن ہوا۔ آپ کبھی ملائیشیا جائیں، سرکاری دفاتر میں آپ کو خواتین کام کرتی نظر آئیں گی۔ لیکن شاید ۵ فی صد خواتین بھی ایسی نہیں ہوں گی جو باقاعدہ اسلامی حجاب اور لباس کے ساتھ نہ ہوں۔ مسجدوں میں نمازیوں کا اوسط پاکستانیوں سے بہت زیادہ نظر آئے گا۔ رمضان میں روزہ رکھنے والوں کا اوسط پاکستان سے بہت زیادہ نظر آئے گا۔ پاکستان میں آج سے چند سال پہلے تک پردے ڈال کر ہوٹل اندر سے بھرے ہوتے تھے۔ آپ ذرا پردہ اٹھا کر دیکھیں تو ایسے ایسے چہرے نظر آتے تھے کہ جن کے بارے میں کوئی توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ بھی یہاں پائے جائیں گے۔ ملائیشیا آپ جائیں تو دن کے وقت کم از کم کوالالمپور کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کوئی ہوٹل آپ کو کھلا نظر نہیں آئے گا، اور اگر نظر آئے تو وہاں کوئی مسلمان

نظر نہیں آتا، سوائے چینیوں کے یا ہندوؤں کے، یہ اس تعلیمی نظام کے برکات و ثمرات ہیں۔ ایک طویل عرصے تک ان کے تعلیمی روابط مصر اور جنوبی ہندوستان کے ساتھ رہے، ملائیشیا کے وہ صوبے جو جنوب کی طرف ہیں ان کے تعلیمی روابط جنوبی ہندوستان، بنگلہ دیش اور برما کے ساتھ رہے ہیں۔ اور جو صوبے شمال کی طرف ہیں ان کے روابط مصر کے ساتھ رہے ہیں۔ انڈونیشیا کی سیاسی اور سماجی زندگی میں جامعہ ازہر کے اثرات آج بھی محسوس ہوتے ہیں۔ جو شخص بھی وہاں جائے گا وہ محسوس کرے گا کہ وہ ایک مسلم ملک میں آیا ہے، اور مسلم ماحول میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں وہ اس کو وہاں ملیں گی۔

تجربات تو دنیا کے ہر ملک میں ہیں اور ملتے جلتے ہی ہیں، کہیں ناکامیاں بھی ہیں اور کہیں کامیابیاں بھی ہیں، لیکن جہاں ناکامیوں کا ذکر ہم کریں، وہاں کامیابیوں کا ذکر بھی کرنا چاہئے۔ میں ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی کے تمام ارشادات سے سو فی صد متفق ہوں کہ ہماری پچاس سالہ تاریخ ناکامیوں اور انحرافات کی تاریخ ہے، یہی حال دنیائے اسلام کے دیگر ممالک کا بھی ہے۔ لیکن ان ناکامیوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں کامیابیوں کے جزیرے بھی ہیں، کامیابیوں کے نخلستان بھی ہیں جہاں جا کر کوئی پناہ لے سکتا ہے، اگر گرمی جھلسا رہی ہو تو اس کو نخلستان میں پناہ مل سکتی ہے، اگر متلاطم سمندر میں وہ تھپیڑے کھا رہا ہو، اس کو پرامن جزیرے بھی مل سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسے جزیرے کتنے ہیں؟ دنیائے اسلام کے دوسرے ممالک میں کتنے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ باہر زیادہ ہیں، ہمارے ہاں کم ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

پاکستان میں دینی تعلیم۔پس منظر و پیش منظر

مشمولہ: پاکستان میں دینی تعلیم، منظر، پس منظر و پیش منظر

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز۔اسلام آباد۲۰۰۹ء

پاکستان میں دینی تعلیم

پس منظر و پیش منظر

دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۸۶۶ء میں عمل میں آیا۔ اس کے چند سال کے اندر اندر اس بات کا احساس کیا جانے لگا تھا کہ دینی تعلیم میں اختصاص پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ علمائے کرام کو کچھ عصری علوم کی تعلیم بھی درکار ہے، تاکہ وہ دین کی تعلیم کو دورِ جدید کی زبان میں بیان کر سکیں۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں "جہاں دل درد مند کی ضرورت تھی وہاں زبانِ ہوش مند بھی درکار تھی"۔ چناں چہ اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ندوۃ العلماء کے ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ صفِ اول کے علما کے ہاتھوں انجام پانے والی یہ پہلی کوشش تھی جس میں دینی تعلیم کو دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی۔

ندوہ کے بعد بھی برصغیر میں کم و بیش گزشتہ سو سال کے دوران تعلیم کے میدان میں سیکڑوں نہیں تو درجنوں ایسے تجربے ہوئے جن کا بنیادی ہدف دینی تعلیم کا ایک ایسا بنیادی نظام اور نصاب وضع کرنا تھا، جس میں دینی متخصصین کو دورِ جدید کے ضروری علوم سے کسی حد تک واقف کرایا جاسکے۔ پاکستان میں ریاست بھاول پور میں ۱۹۲۵ء میں جامعہ عباسیہ قائم ہوئی جس کے قیام اور انصرام میں برصغیر کے صفِ اول کے علمائے کرام نے حصہ لیا۔ جامعہ عباسیہ کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ ایسے دینی

متخصصین پیدا کیے جائیں جو دورِ جدید کے مسائل اور معاملات سے کماحقہ واقف ہوں، تا کہ وہ دین کی تعلیم اور اس کے احکام کو دورِ جدید کی زبان میں بیان کر سکیں۔

پاکستان بننے کے بعد بھی وقتاً فوقتاً سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر اس ضرورت کا احساس کیا جاتا رہا۔ ۱۹۷۹ء کی تعلیمی پالیسی میں پہلی مرتبہ یہ بات کہی گئی کہ ایسے دینی ادارے قائم کیے جائیں جہاں دینی تعلیم میں تخصص کے ساتھ ساتھ جدید مضامین کی تعلیم بھی دی جائے۔ چناں چہ اس کو عملی شکل دینے کے لیے صدر پاکستان کے حکم سے ایک دینی مدارس کمیشن قائم کیا گیا، جس کے سربراہ ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا مرحوم تھے اور کمیشن میں پاکستان کے تمام بڑے وفاقوں کے ماہرین تعلیم شامل تھے۔ اس کمیشن نے ایک جامع رپورٹ سرکاری سطح پر پیش کی تھی، جس میں اتفاق رائے سے دینی مدارس کے نظام اور نصاب میں بہت سی تبدیلیاں تجویز کی گئی تھیں۔ بعض مدارس نے ان تبدیلیوں کو اس وقت قبول کیا اور چند نے اختیار بھی کر لیا۔

اسی طرح ۱۹۹۸ء کی تعلیمی پالیسی میں بھی یہ بات کہی گئی کہ ایسے ماڈل اور معیاری دینی مدارس قائم کیے جائیں گے جہاں دینی تعلیم میں تخصص کے ساتھ ساتھ بہ قدرِ ضرورت جدید مضامین کا اضافہ بھی کیا جائے گا۔ اس تعلیمی پالیسی پر عمل در آمد کے لیے تعلیم اور مذہبی امور کی وزارتوں کے باہمی تعاون سے ۱۹۹۸ء میں ایک کمیٹی بنائی گئی تھی جس کے سربراہ ڈاکٹر ایس ایم زمان تھے جو بعد میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین بھی ہوئے۔ اس کمیٹی نے ۱۹۹۹ء کے ابتدائی مہینوں میں اپنی رپورٹ پیش کر دی تھی، اور ایک ایسا ماڈل یا معیاری نصاب تجویز کیا تھا، جس کی تیاری میں علمائے کرام اور ایسے ماہرین تعلیم بھی شامل تھے جو دینی تخصصات کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کے بعض مسائل سے بھی واقف تھے۔ یہ بات درست ہو سکتی ہے کہ بعض غیر ملکی طاقتوں کے مفاد میں یہ ہو کہ مدارس کو وہ اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ان میں سے بہت سوں نے مدارس کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار بھی کیا ہے لیکن یہ بات ہمیں نہیں بھولنی چاہئے کہ تعلیم میں مسلسل اصلاح

کرتے رہنے اور حالات کی مناسبت سے اس میں تبدیلی لانے کا عمل جاری رکھنے میں ہماری اپنی مصلحت ہے۔ ہم یہ کام ماضی میں بھی کرتے چلے آئے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ اگر کچھ اور لوگ بھی یہ بات کہہ رہے ہوں تو ان کے مطالبے یا تجویز سے متأثر ہو کر کوئی مفید چیز جو شروع ہو چکی ہو، چھوڑی نہیں جا سکتی۔

وزارت مذہبی امور کے تحت قائم ہونے والے ماڈل دینی مدارس کا کوئی تعلق ۱۱ ستمبر (۲۰۰۱ء) کے واقعات سے نہیں ہے۔ یہ آرڈیننس ۱۴ اگست ۲۰۰۱ء کو نافذ ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کئی ماہ سے اس کی تیاری ہو رہی تھی اور مختلف اہل علم کے مشورے سے ایک ایسا نقشہ تیار کیا گیا تھا جس میں علمائے کرام کو کوئی شبہات نہ ہوں جو عموماً اس طرح کی کاوش میں رہے ہیں۔ جب یہ آرڈیننس تیار ہو رہا تھا تو میرا تعلق حکومت کی ایک ذمے داری سے تھا۔ میں نے خود براہِ راست علمائے کرام سے گفت گو کی۔ مولانا سلیم اللہ خان، صدر وفاق المدارس، مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب مرحوم سربراہ تنظیم المدارس اور دوسرے ایسے حضرات جو مختلف دینی مدارس کی تنظیموں سے وابستہ ہیں، ان سے میں نے براہِ راست مشاورت کی تھی۔

ان علمائے کرام کی جانب سے تین تحفظات سامنے آئے۔ سب سے اہم concern جس سے ہم سب کو اور ہر اس آدمی کو اتفاق ہے جو پاکستان کے دینی مدارس کے مستقبل کے بارے میں مخلصانہ جذبات رکھتا ہے، یہ تھا کہ دینی مدارس کی آزادی اور استقلال پر حرف نہیں آنا چاہئے، اور کسی بھی عنوان سے سرکاری افسران یا کارندوں کو دینی مدارس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ اس سے کسی کو کوئی اختلاف نہیں تھا، چناں چہ یہ بات سب نے اتفاق رائے سے منظور کرلی۔ دوسری چیز یہ طے ہوئی تھی کہ نصاب یا نظام میں تبدیلی اہل علم کا کام ہے۔ نہ صرف دینی مدارس بل کہ کسی بھی تعلیمی ادارے میں نصاب کی تبدیلی خالصتاً اساتذہ اور اہل علم کا کام ہونا چاہئے اور حکومتوں کی وقتی پالیسیوں یا اس کے آنے جانے کا کوئی اثر نصاب پر نہیں ہونا چاہئے۔ یہ کام علمائے کرام اور ماہرین تعلیم کو خود کرنا چاہئے۔ اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔ یہ بات بھی اتفاق رائے

سے ہی طے ہوئی تھی۔

اس کے بعد ایک آخری مسئلہ یہ تھا کہ بعض علمائے کرام کو یہ شبہ تھا کہ جب ان ماڈل دینی مدارس کا ایک بورڈ قائم ہو جائے گا تو حکومت پاکستان دینی مدارس کو زبردستی اس بورڈ سے الحاق پر مجبور کرے گی۔ میں نے اس وقت ذاتی طور پر یقین دہانی کرائی تھی کہ صدر مملکت نے مجھ سے ایسا کہا ہے کہ وہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ میں ان کی طرف سے بات کہہ دینا چاہتا ہوں۔ ایک بزرگ (جن کا اب انتقال ہو چکا ہے کراچی سے تشریف لائے تھے) نے کہا کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ آئندہ کوئی ایسی حکومت نہیں آئے گی جو اس کی بنیاد پر دینی مدارس میں مداخلت نہیں کرے گی۔ ظاہر ہے اس کی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔ کل کیسی حکومت آئے گی، وہ اچھی ہوگی یا بری ہوگی، اس کا فیصلہ کرنا عوام کا کام ہے۔ اس وقت جو علمائے کرام ہوں گے ان کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ حالات کے مطابق لائحہ عمل تیار کریں۔ یہ بورڈ ہو یا نہ ہو آئندہ کوئی حکومت، کوئی بھی فیصلہ کرنے میں آزاد ہے۔ اس لیے کوئی آدمی بھی ایسی یقین دہانی نہیں کرا سکتا کہ آئندہ آنے والی کوئی حکومت بھی اس بورڈ کی بنیاد پر مدارس کے معاملے میں مداخلت کا فیصلہ نہیں کرے گی۔

مذکورہ بالا تناظر میں مدرسہ بورڈ سے متعلق آرڈیننس ہم نے تیار کیا جس کی ڈرافٹنگ میں زیادہ حصہ میرا ہی تھا، اگرچہ اس میں جو کچھ ہے اس سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کرتا۔ اجتماعی طور پر جو چیز تیار ہوتی ہے اس میں بہت سے لوگوں کی کارکردگی شامل ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک ہی آدمی کی رائے کے مطابق اس طرح کے قوانین اور فیصلے ہوں۔ لیکن یہ بنیادی باتیں اس آرڈیننس میں شامل تھیں کہ ایک ایسا بورڈ قائم کیا جائے جس کا موجودہ آزاد مدارس پر کوئی کنٹرول اور عمل دخل نہ ہو۔ وہ صرف ماڈل دینی مدارس یا ان مدارس کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہو جو آزادانہ اس سے الحاق کا فیصلہ کریں۔ چناں چہ یہ طے کیا گیا کہ پاکستان میں جہاں جہاں وزارت مذہبی امور یا اوقاف کے ہاں ایسی عمارات ہیں جن کا استعمال صحیح انداز میں نہیں ہو رہا، جس کی ایک مثال حاجی کیمپ ہے جو سال کے کم و بیش گیارہ

مہینے کم استعمال میں یا بالکل بلا استعمال کے رہتا ہے، ایسی عمارتوں کو دینی تعلیم کے لیے استعمال کیا جائے۔ یا مثال کے طور پر بادشاہی مسجد یا ایسے بڑے اداروں کے ساتھ ایسی عمارتیں موجود ہیں جن کا مناسب استعمال نہیں ہے، وہاں ایسے مثالی ادارے بنائے جائیں جن میں جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کے تخصصات کا بھی اہتمام کیا جائے۔ چناں چہ آغاز کے طور پر تین مدارس کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ باقی مدارس کے قیام کا فیصلہ آئندہ آنے والی حکومت جب اور جیسے مناسب سمجھے گی کرے گی۔

اس آرڈیننس میں یہ گنجائش بھی رکھی گئی کہ جو مدارس اس بورڈ سے الحاق کرنا چاہیں کرلیں۔ اس الحاق کے قواعد بھی میں نے خود ڈرافٹ کیے، اور علمائے کرام کو دکھائے، پھر بورڈ نے ان کو منظور کرلیا۔ اس میں واضح طور پر یہ لکھا ہوا ہے کہ مدارس صرف دو امور میں الحاق کریں گے۔ ایک تو اس نصاب کو اختیار کریں گے جو اس بورڈ نے تیار کیا ہے، اور دوسرا اس بورڈ کے تیار کردہ قواعد و ضوابط کے تحت اپنے طلبہ کو امتحان دلوائیں گے۔ اپنے انتظامی، اندرونی اور مالی ہر معاملے میں وہ خود مختار ہوں گے۔ اس میں اس بورڈ کو مداخلت کا نہ کوئی اختیار ہوگا اور نہ اس حوالے سے قانون میں کوئی گنجائش ہے۔

ایک اور چیز علمائے کرام نے کہی کہ کوئی ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ جو مدارس اپنی خود مختاری کو برقرار رکھتے ہوئے اس انداز سے آزادانہ پیش رفت کرنا چاہیں ان کے لیے قانون میں گنجائش ہونی چاہئے۔ چناں چہ حکومت پاکستان کے ذمے دار لوگوں سے بات ہوئی، جنہوں نے اس سے اتفاق کیا کہ ہمیں ایک سہ رُخی پالیسی اختیار کرنی چاہئے۔ ایک تو ماڈل مدارس اور بورڈ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ دوسرا ہائر ایجوکیشن کمیشن (جو اس وقت یو جی سی) کہلاتا ہے کی طے شدہ شرائط پر پورے اترنے والے مدارس کو پرائیویٹ یونیورسٹیاں قرار دیا جائے۔ چناں چہ میں نے کیپٹن عثمان علی عیسانی جو اس وقت کمیشن کے چیئرمین تھے کے مشورے سے اس چارٹر کو ڈرافٹ کرنے میں مدد دی۔ اس میں ہم نے طے کیا کہ ہر بڑا مدرسہ جس میں طلبہ کی کم سے کم تعداد مخصوص ہو گی (غالباً پندرہ سو یا ایک ہزار کے لگ بھگ) اور اس

کے پاس کم از کم اتنے مادی وسائل اور اثاثے اور اکاؤنٹ میں ایک مخصوص اور طے شدہ رقم موجود ہو گی، اس کے ان معاملات سے متعلق قواعد وضوابط طے شدہ ہوں گے اور وہ ایک رجسٹرڈ باڈی کے تحت کام کر رہا ہو گا اور اس میں ریگولر تعلیم ہو رہی ہو گی، وہ اگر درخواست دے تو ہائر ایجو کیشن کمیشن اسے بہ طور پرائیویٹ یونیورسٹی تسلیم کر سکتا ہے۔ یہ چیز اس وقت ہائر ایجو کیشن کمیشن نے تسلیم کر لی تھی اور بعض علمائے کرام کے ساتھ میں نے اس پر گفت گو بھی کی تھی۔ اس آرڈیننس کا اُردو میں بھی ترجمہ کرایا گیا تھا اور میں نے خود نظر ثانی کر کے اس کو چھپوایا تھا۔

جب یہ مزید آگے بڑھا تو بعض علماء نے یہ نکتہ پیش کیا کہ اس سے مدارس کے وفاق یعنی تنظیم المدارس یا وفاق المدارس وغیرہ اور وہ ادارے جو مدارس کی تنظیموں کی نمائندگی کرتے ہیں، کم زور ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ ہر بڑا مدرسہ اپنے طور پر ایک چارٹر لے لے گا اور پھر وہ مدارس کو الحاق دے گا اور مدارس ہمارا الحاق چھوڑ کر ان کے ساتھ ملحق ہو جائیں گے۔ نتیجتاً وفاق کم زور ہو جائے گا۔ آپ کی اسکیم میں وفاق کی حتمی کم زور بالآخر شامل ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے لیے اتفاق کرنا مشکل ہے حالاں کہ پہلے وہ اتفاق فرما چکے تھے۔ اس کے باوجود ان کے اس تنقیدی نکتے پر دوبارہ ذمہ دار حضرات سے گفت گو کی گئی اور یہ بھی طے ہوا کہ اگر کوئی ایسا ادارہ موجود ہو جو مختلف دینی مدارس کے وفاق اور تنظیموں پر مشتمل ہو اور بہ طور ایگزامینگ یونیورسٹی کے چارٹر لینا چاہے تو اس کی اجازت کی دی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ ایک زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کو ایگزامنگ یونیورسٹی کے طور پر چارٹر ملا ہوا تھا، یہ اس پالیسی کا دوسرا حصہ تھا۔

تیسرا حصہ یہ تھا کہ جو مدارس نہ چارٹر لینا چاہیں اور نہ سرکاری یعنی ماڈل مدرسہ بورڈ سے الحاق کرنا چاہتے ہوں بل کہ اپنی موجودہ آزادہ حیثیت کو برقرار رکھنا چاہیں، ان کو آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے دینی نصاب کے ساتھ ساتھ جدید مضامین شامل کریں۔ اس وقت لمبی گفت گو ہوئی لیکن میں نے ذمہ دار حضرات سے یہ گزارش کی کہ فی الحال آپ اس پر اتفاق رائے کا مظاہرہ کریں۔ گویا دینی مدارس

یہ تسلیم کرلیں کہ یا تو وہ اپنے نصاب یا داخلے کی شرائط میں یہ چیز شامل کرلیں گے کہ جو طالب علم داخل ہو وہ میٹرک پاس ہو اور کوئی طالب علم میٹرک پاس کیے بغیر دینی مدارس میں آئے تو ان مدارس کے نصاب میں اس کا اہتمام ہو کہ وہ ابتدائی تین سالوں میں اس کو انگریزی، مطالعہ پاکستان، ریاضی اور جنرل سائنس میٹرک کی سطح تک پڑھادیں۔ اس پر سب حضرات سے گفت گو ہوئی۔ اس پر اتفاق ہو گیا کہ میٹرک کی سطح تک وہ ان مضامین کو شامل کرلیں گے اور جن مدارس میں اس کا امکان ہو گا وہاں میٹرک پاس بچوں کو ہی داخلہ دیا جائے گا۔

اس اعلان کے بعد دینی مدارس نے اس پریشانی کا اظہار کیا کہ انہیں جو عطیات ملتے ہیں، وہ یقیناً دینی تعلیم کے لیے ہوتے ہیں اور یہ ایک فقہی مسئلہ ہے کہ دینی مدارس کو ہر شخص قرآن وحدیث اور سنت کی تعلیم کے لیے جو عطیہ دیتا ہے اس کو کیا انگریزی پڑھانے کے لیے استعمال کرنا جائز ہے؟ یا اس پیسے سے مطالعہ پاکستان یا کمپیوٹر وغیرہ پڑھانا (جس کے لیے اس نے پیسے نہیں دیے)، جائز ہے؟ اس پر وزارتِ تعلیم سے بات ہوئی اور انہوں نے اس پر آمادگی ظاہر کی۔ ان کے پاس پہلے سے پروگرام طے تھا، اس کے تحت پہلے ۵ کروڑ روپے دیتے تھے۔ اب زیادہ ہوتے ہوتے ۲۷ کروڑ روپے ہو گئے۔ انہوں نے اس فنڈ سے دینی مدارس کو مدد دینے کے لیے تیاری پر آمادگی ظاہر کی۔ چناں چہ ایک اجلاس ہوا جس میں میں نے اور اس وقت کی وزیر تعلیم زبیدہ جلال صاحبہ نے بھی شرکت کی اور وزارت مذہبی امور کی طرف سے ان کے نمائندے جمیل بھٹو صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ اس میں یہ طے ہوا کہ دینی مدارس کے موجودہ کلچر اور ماحول کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں یہ امداد دی جائے گی۔

اس اجلاس میں یہ حتمی شرائط طے ہوئیں۔ اول: صرف ان مدارس کو امداد دی جائے گی جو از خود اس کے لیے درخواست دیں۔ کسی مدرسے کو مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ امداد لے اور امداد لینے کے بعد اس کو اس طرح خرچ کرے جس طرح حکومت چاہے۔ دوم: امداد لینے کے لیے ہم نے ایک فارمولہ بنایا وہ یہ تھا کہ ایک رقم

نصابی کتابوں کے لیے دی جائے گی، ایک رقم کمپیوٹر کی خریداری کے لیے مختص ہو گی اور ایک رقم اساتذہ کی تن خواہوں میں صرف کی جائے گی۔

اساتذہ کا معاملہ خاصا حساس تھا۔ وزارت تعلیم کا مؤقف تھا کہ اساتذہ کا تقرر حکومت پاکستان کرے۔ تمام دینی مدارس اپنے مسلک کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ اگر کسی دیوبندی مدرسے میں انگریزی پڑھانے کے لیے شیعہ مدرس بھیج دیا گیا تو کیا ہو گا؟ یہ بات قابل عمل نہیں ہے۔ چناں چہ ہم نے یہ واضح کیا کہ جس مدرس کو مقرر کرنا چاہتے ہیں اس کی تعلیمی قابلیت کا تعین کر دیں جس میں میٹرک، ایف اے اور بی اے کی سطح پر پڑھانے کے لیے استاد کی مطلوبہ قابلیت طے ہو۔ اور دینی مدارس کو اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنے قرب وجوار میں سرکاری تعلیمی اداروں، کالجوں، یونیورسٹیوں سے لے کر یا ویسے جس مدرس کو چاہیں مقرر کر دیں۔ وزارت صرف اس بات کو چیک کرے کہ وہ اس تعلیمی معیار پر پورا اترتا ہو۔ جو مدارس انتخاب کر کے بھیجیں، تین سال کے لیے ان مدارس کو تن خواہ دی جائے گی (بہ شرطیکہ وہ مطالبہ کریں)۔

معاوضوں کے ضمن میں ہم نے کہا کہ ان کو پارٹ ٹائم کی حیثیت دیں۔ پرائمری سے میٹرک کی سطح تک کے اساتذہ کو تین سے پانچ ہزار روپے اور جو اس سے اوپر تک پڑھائیں ان کو پانچ سے سات ہزار رپے ماہ وار دیں۔ کچھ کتابوں کے لیے ہم نے فارمولہ طے کیا کہ فی طالب علم ایک ہزار روپے مقرر کر لیں اور یہ طے کریں کہ جس مدرسے میں کم از کم پچاس طلبہ ہوں اس کو ہم امداد دیں گے جتنے طالب علم ہوں ان کے لیے ضروری اشیا فراہم کی جائیں۔ ایک مرتبہ وہ کتابیں لے کر لائبریری میں رکھ لیں اور طلبہ اس سے استفادہ کرتے رہیں۔ جو لوگ کمپیوٹر لینا چاہیں اس کا بھی ایک فارمولہ ہو۔ اس کے لیے ان کو ایک بار گرانٹ دے دی جائے۔ یہ حتمی بات مارچ / اپریل ۲۰۰۲ء میں طے ہوئی تھی۔ بعد میں اس پر عمل درآمد کس حد تک ہوا، اور اب کتنا اور کس شکل میں ہو رہا ہے، اس پر معلومات کی ضرورت ہو گی۔ ان تین بنیادی فیصلوں کا اولین مقصد یہ تھا کہ دینی مدارس کو عام

اداروں کے قریب تر لایا جائے اور جو تجاویز پچھلے سو برس سے وقتاً فوقتاً سوچی جا رہی ہیں اس پر عمل در آمد کرنے میں حکومت پاکستان اپنا کردار ادا کرے۔

میری حکومت سے وابستگی کے آخری مہینوں میں مدارس کی رجسٹریشن کے بارے میں ایک بڑا اختلاف پیدا ہو گیا۔ مدارس کی رجسٹریشن کا مسئلہ شروع سے چلا آرہا ہے اور مختلف مدارس مختلف قوانین کے تحت حکومتی اداروں میں رجسٹرڈ ہیں، تاہم نئی رجسٹریشن پر کئی سال سے پابندی عائد تھی۔ مجھے مدارس جانے کا موقع ملتا یا علمائے کرام سے ملاقات ہوتی تھی تو مطالبہ کیا جاتا تھا کہ مدارس کی رجسٹریشن کے اس بند عمل کو دوبارہ شروع کر دیا جائے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ پابندی وزارت داخلہ کے مشورے پر عائد کی گئی تھی۔ وزارت داخلہ سے دریافت کرنے پر انہوں نے ایک اور وزارت کا نام لے دیا کہ ان کے مشورے سے پابندی لگائی گئی تھی۔ اس وزارت نے ایک اور وزارت کو ذمہ دار قرار دیا۔ بہر حال یہ واضح نہ ہو سکا کہ یہ سب کچھ کس کے مشورے سے ہوا تھا اور اس کا پس منظر کیا تھا۔ جب میں نے بار بار یہ مسئلہ اٹھایا تو ایک اجلاس میں مختلف تجاویز پر غور کے بعد بالآخر یہ طے ہوا کہ رجسٹریشن کا ایک نیا قانون بنایا جائے۔ اس قانون میں کوشش کی جائے کہ رجسٹریشن سے متعلق جتنے بھی معاملات ہیں وہ سارے کے سارے طے ہو جائیں اور بہ جائے اس کے کہ مختلف دینی مدارس مختلف قوانین کے تحت الگ الگ رجسٹرڈ ہوں، وہ تمام کے تمام ایک قانون کے تحت رجسٹرڈ ہوں۔ یہ اصول تو اتفاق رائے سے طے ہو گیا۔ میں نے علمائے کرام سے بھی بات کی۔ اس اصول پر سب متفق تھے لیکن مزید جو چیزیں محل نظر اور زیر گفت گو رہیں وہ چار معاملات تھے۔

ایک معاملہ یہ تھا کہ ایسے دینی مدارس جو سابقہ طور پر کسی قانون کے تحت رجسٹرڈ تھے کیا ان کو دوبارہ رجسٹریشن پر مجبور کیا جائے۔ کچھ حکومتی حلقوں کا خیال تھا کہ ان کو دوبارہ رجسٹریشن کے لیے کہا جائے، جب کہ علمائے کرام کا خیال تھا کہ ان کو دوبارہ رجسٹریشن کے لیے نہ کہا جائے۔

دوسرا معاملہ یہ تھا کہ جس ادارے میں رجسٹریشن ہو اس کو رجسٹریشن سے

انکار کرنے کا بھی اختیار ہے یا نہیں اور اگر رجسٹریشن سے انکار کر دیا جائے تو اس مدرسے کی کیا حیثیت ہو گی؟ کیا اس کو بند کر دیا جائے گا۔ یہ خاصا نازک اور مشکل معاملہ ہے۔ اس پر مختلف لوگوں کے نظریات مختلف تھے۔ کوئی واضح طور پر اتفاق رائے نہیں تھا۔

تیسری بڑی چیز یہ تھی کہ بعض دینی مدارس کے بارے میں حکومتی حلقوں کا خیال تھا کہ ان کو غیر ملکی اداروں یا حکومتوں سے امداد ملتی ہے اور اس امداد کے اسباب یا محرکات بعض اوقات خالصتاً تعلیمی بھی نہیں ہوتے۔ اس امداد کو کیسے ریگولیٹ کیا جائے۔ اس پر مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے آئے اور اتفاق رائے سے کوئی چیز طے نہیں ہوئی۔

چوتھی چیز یہ تھی کہ رجسٹریشن اتھارٹی کیسی اور کن افراد پر مشتمل ہو؟ اس کی ہیئت ترکیبی کیا ہو؟ کچھ حکومتی اداروں کا خیال تھا کہ وہ سو فیصد حکومتی کنٹرول میں ہو۔ کچھ کا خیال تھا کہ وہ پرائیویٹ اور ایک خود مختار ادارہ ہو۔ ان چاروں معاملات پر میں نے علمائے کرام کے ساتھ مختلف اجلاس کیے اور اس کے بعد میں نے ان چاروں تحفظات پر صدر مملکت سے بات کی۔ مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ ان چاروں معاملات پر انہوں نے میری تجاویز سے اتفاق کیا اور مجھے اختیار دیا کہ میں جا کر علما سے بات کروں اور ان چاروں معاملات پر جو ان کا نقطۂ نظر ہے اس سے اتفاق کر لوں۔ چناں چہ ۳۱ جولائی ۲۰۰۲ء کو میٹنگ ہوئی جس میں وزیر داخلہ معین الدین حیدر اور وزیر تعلیم زبیدہ جلال بھی تشریف لائیں اور علمائے کرام میں تمام وفاقوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس میں ان چاروں معاملات پر اتفاق رائے ہو گیا اور جو چیزیں علمائے کرام نے کہیں تھیں وہ چاروں اس میں شامل کر لی گئیں۔

اس وقت تک میں وزارت چھوڑنے کا ارادہ کر چکا تھا تاہم یہ بات ابھی عوام میں عام نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے چاہا کہ میں خود ہی اس کو ڈرافٹ کر کے ان چاروں ترامیم کو اس میں شامل کر دوں۔ چناں چہ میں نے ایسا ہی کیا۔ علمائے کرام نے بجا طور پر اس خدشے کا اظہار کیا کہ اکثر اوقات جو چیزیں طے ہو جاتی ہیں

ڈرافٹنگ میں اس طرح سے نہیں آتیں جس طرح سے طے ہوا ہوتا ہے تو ڈرافٹ، قانون نافذ کرنے سے پہلے ہمیں دکھایا جائے۔ چناں چہ میں نے وزارت کے اعلیٰ افسر جمیل بھٹو صاحب کو ڈرافٹ دے دیا۔ میری جگہ گورنر بلوچستان اویس غنی صاحب نے وزارت کا چارج لیا تھا۔ وہ میرے پاس یونیورسٹی میں تشریف لائے اور تقریباً ۸/۶ گھنٹے نشست کی۔ میں نے پوری صورت حال ان کو بریف کر دی اور مسودہ ان کو دے دیا۔ ان کو میں نے مشورہ دیا کہ سب کو محض کاپی دینے پر اکتفا نہ کریں بل کہ مناسب یہ ہو گا کہ آپ خود مختلف وفاقوں کے پاس تشریف لے جائیں اور اس ڈرافٹ کی بنیاد پر ان سے الگ الگ تفصیل سے بات چیت کریں۔ چناں چہ انہوں نے بعد میں مجھے بتایا کہ وہ تمام وفاقوں میں گئے اور اس ڈرافٹ کی بنیاد پر ان سے الگ الگ بات کی اور اس کے بعد انہوں نے ڈرافٹ کابینہ میں بھیج دیا۔ تاہم کابینہ کا فیصلہ سامنے نہ آسکا، کیوں کہ الیکشن کی وجہ سے حالات بدل گئے تھے۔ غالباً ابھی تک وہ کابینہ کے سامنے نہیں آیا اور بہ ظاہر اب وہ مسئلہ نہیں رہا۔ رجسٹریشن کا معاملہ بہ ظاہر ختم ہو گیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ حکومت کی طرف سے بھی کوئی اصرار دیکھنے میں نہیں آیا۔ اور جن علمائے کرام کا خیال تھا کہ رجسٹریشن کو دوبارہ شروع کیا جائے وہ بھی غالباً اس اختلاف کی وجہ سے خاموش ہیں اس لیے یہ مسئلہ فی الوقت ختم معلوم ہوتا ہے۔ یہ تینوں معاملات اس وقت موجود ہیں۔ ماڈل مدارس بھی موجود ہیں، بورڈ بھی کام کر رہا ہے اور الحاق کی تفصیلات بھی آپ سے سن لیں۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کو میں نے دوبارہ یاد دلایا تھا کہ وہ جو پرائیویٹ دینی مدارس کو اسلامی یونیورسٹی قرار دینے کی بات تھی یا ایگزامننگ یونیورسٹی کا درجہ دیا جانے والا تھا، اسے بحال کیا جائے۔ کمیشن کے چیئر مین ڈاکٹر عطاء الرحمن نے وعدہ کیا۔ پھر ہائر ایجوکیشن کمیشن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اب دینی مدارس سے متعلقہ معاملات کمیشن کے اختیار میں ہوں گے یا بورڈ کے۔ اس پر کئی میٹنگیں ہوئیں لیکن کچھ طے نہیں ہوا۔ ان میں سے ایک دو میں مجھے بھی جانے کا موقع ملا۔ غالباً یہ معاملہ ابھی کوئی فوری مسئلے کے طور پر کہیں بھی زیر غور نہیں ہے۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی تین ایسی

باتیں ہیں جو میں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستان کو اگر صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بننا ہے۔اور اگر یہاں اسلامی قوانین کا صحیح طور پر نفاذ ہونا ہے یا اگر اس ملک میں صحیح مثالی معاشرہ بننا ہے جو ہم جیسے کروڑوں لوگوں (جو گزر گئے اور آنے والوں) کے خوابوں کی تعبیر ہے تو یہاں نظام تعلیم کی وحدت اور یک سانیت ایک ناگزیر عمل ہے۔دینی اور دنیاوی تعلیم کے دو طرح کے اداروں کا وجود سیکولرازم کو فروغ دے رہا ہے اور دیتا رہے گا۔اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ دینی تخصص کے ادارے الگ نہ ہوں تاہم ایک سطح تک تعلیم میں یک سانیت ناگزیر ہے جو ہمارے حالات کے مطابق کم سے کم میٹرک اور زیادہ سے زیادہ انٹرمیڈیٹ ہو۔دس سال تک مکمل یک سانیت ہو، جس میں کسی ادارے کو کسی پرائیویٹ یا غیر ملکی ایجنسی سے وابستگی کی اجازت نہ ہو۔اے لیول، اولیول، کیمبرج، اوکسفورڈ یہ سب ملک کو تعلیمی لحاظ سے تقسیم کر رہے ہیں۔ایک یک سانیت ہونی چاہیے۔اس کے بعد تخصص کے ادارے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطح پر ہونے چاہئیں۔جس کو جس تخصص میں جانا ہو وہ اس میں چلا جائے۔جب تک یہ نہیں ہوگا پاکستان کو ایک اسلامی جمہوریہ یا اسلامی معاشرہ بنانے کا خواب شرمندہ تعبیر ہونا بڑا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ایک اہم بات کی طرف اشارہ ضروری ہے۔مدارس کی خدمات کے حوالے سے مکمل اتفاق کے باوجود میں بڑے دکھ کے ساتھ کہتا ہوں کہ ان میں سے بہت سے ادارے فرقہ واریت کے حوالہ سے عدم توازن کا شکار ہو رہے ہیں۔جب طالب علم یہاں سے نکلتا ہے تو اسلام کا سپاہی بن کر نہیں نکلتا بلکہ وہ اپنے مسلک کے مفاد سے زیادہ وابستہ ہوتا ہے۔یہ ایک امر واقعہ ہے۔آپ تسلیم کریں نہ کریں، اس کو ختم ہونا چاہئے۔میں یہ نہیں کہتا کہ لوگ اپنے مسلک کو چھوڑ دیں۔اگر کوئی ایک خاص فقہی یا کلامی نقطہ نظر رکھتا ہے تو رکھے لیکن تعلیم کے ذریعے اس کو متوازن کیا جائے۔بچے کے ذہنی میلان کی اس طرح پروگرامنگ کی جائے کہ وہ ساری عمر اس پس منظر اور نقطہ نظر سے معاملات کو دیکھے۔فرقہ بندی اسلام کے امت واحدہ کے تصور کے خلاف ہے اور یہ

پاکستان کو ایک اسلامی مملکت نہیں بننے دے گی۔اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

اس کے لیے واحد ممکنہ طریقہ کار پرائیویٹ دینی اداروں کی رجسٹریشن ہے جس کی بات میں نے آخر میں کی تھی کہ رجسٹریشن کی ایک اتھارٹی ہو جس میں تمام وفاقوں کے نمائندے ہوں، اس میں ایک دو پرائیویٹ دینی اداروں کے سینئر تعلیمی ماہرین ہوں، ایک ریٹائرڈ سینئر جج اس کا سربراہ ہو اور یہ تعلیمی ادارہ مشترکہ طور پر سارے دینی تعلیمی اداروں کی نگرانی کرے اور یہ بھی دیکھے کہ کیا پڑھایا جارہا ہے اور کیا نہیں پڑھایا جارہا؟ جب سب علمائے کرام مشترکہ طور پر دینی تعلیمی اداروں کی سربراہی اور نگرانی کریں گے تو اس میں فرقہ واریت یا مسلکیت کی شدت پیدا نہیں ہو گی۔ایک ہلکا پھلکا مسلکی اختلاف رہے گا جو ہمیشہ سے رہا ہے اور رہنا چاہئے۔ اس کے وجود سے امت میں کوئی اختلاف یا افتراق نہیں پڑتا۔یہ نکتہ انتہائی توجہ کا متقاضی ہے۔یہ سب کیسے اور کس حد تک ہو گا اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت بہت سی مسجدیں اور مدرسے، فرقوں کی مسجدیں اور فرقوں کے مدرسے ہیں، اللہ کی مسجدیں اور اللہ کے مدرسے، دین کی مسجدیں اور دین کے مدرسے بہت تھوڑے ہیں۔یہ بات ممکن ہے سخت ہو لیکن امر واقعہ یہی ہے۔

تیسری اہم اور ناگزیر چیز جس کے لیے مزید آواز اٹھانے کی ضرورت ہے، دینی تعلیمی اداروں میں جدید مضامین کی شرکت سے متعلق ہے۔اس لحاظ سے روایتی تعلیمی اداروں کو بھی اسلام کے قریب لانے اور وہاں دینی تعلیم کے نصابی مدرجات میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔یہاں اس میں کمی کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔حال آں کہ جو کچھ ہے وہ ناکافی ہے اس میں بہت کچھ اضافی کی ضرورت ہے، تاکہ ایک ایسی نسل تیار ہو سکے جو اپنے نقطہ نظر میں ایک دوسرے کے قریب ہو۔اس طریق کار اور اس کے لیے ضروریات کا تعین ہم سب کی ذمے داری ہے۔ محض کسی کے خلاف کوئی نعرہ لگا دینے، پھبتی کس دینے یا طنز کرنے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ہم ایک دوسرے سے جب تک تعاون کی فضا میں بیٹھ کر کام نہیں کریں گے، اس وقت تک اس میں پیش رفت ہونا بڑا دشوار ہے۔

دینی تعلیم اور عصر حاضر میں اس کی معنویت

انگریزی خطاب۔ جسے صوتی تسجیل سے سومیہ عزیز، استاد شعبہ تفسیر و علوم القرآن
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد نے بہ رہ راست کمپوز کیا

ترجمہ سید متین احمد شاہ، نائب مدیر فکر و نظر، ادارہ تحقیقات اسلامی
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

ماہ نامہ تعمیر افکار، کراچی: اگست ۲۰۱۴ء

دینی تعلیم
اور عصرِ حاضر میں اس کی معنویت

بسم اللہ الرحمان الرحیم

برادرانِ گرامی، خواہران مکرم

سب سے پہلے میں اس کانفرنس کے منتظمین کا صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے روایتی دینی نظامِ تعلیم، جسے دنیا میں مدرسے کے نام سے جانا جاتا ہے، کے بارے میں اپنے ساتھ ناچیز خیالات کے تبادلے کی عزت مرحمت فرمائی۔ عہد حاضر میں مدرسہ، مشرق و مغرب دونوں میں گرما گرم بحث کا موضوع ہے، دوست و دشمن دونوں کی طرف سے اس کے حق اور مخالفت میں گفت گو جاری ہے۔ مغربی میڈیا مدرسے کو ایک مختلف انداز سے پیش کر رہا ہے جو حقیقت سے بعید ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کے ہاں مدرسے کی تصویر کو گہنا کر مسلم تاریخ میں اس کے مثبت کردار کو مسخ کر دیا گیا ہے۔

لغت میں مدرسے کا مطلب ہے: تعلیم یا تدریس کی جگہ۔ یہ ادارہ اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی سے وجود پذیر ہو گیا تھا جس نے علم، فکر و دانش اور سائنسی پیش رفت کے معاملے میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے کردار کی نمائندگی کی۔ مدرسے نے تاریخ میں پہلی مرتبہ تعلیم اور علم کی وحدت کے تصور کو اجاگر کیا۔

انسانی علم و فکر کی تاریخ میں مدرسے اور اس کے ساتھ وابستہ شخصیات نے وحدت علم کا یہ تصور پیش کیا، جہاں عقل و وحی ایک کل کی حیثیت سے باہم دگر مربوط ہیں۔ یہاں روایتی دینی علم جدید ترین انسانی دریافتوں کے ساتھ مشترکہ انسانی یافت کی حیثیت سے ہم آہنگ ہے۔ اس تصور کے تحت یونانیوں سے متوارث نام نہاد عقلی علوم کے ساتھ ایسا تعامل کیا گیا کہ آخر کار وہ اسلام کے بنیادی اور سرمدی اصولوں کے خادم بن کر رہ گئے۔ ابونصر فارابی، جسے تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں منطق اور مسلم فکر کی تنظیم میں رول ادا کرنے پر مسلمانوں نے معلم ثانی کے لقب سے یاد کیا ہے، اس جیسے لوگوں نے عموماً سب سے پہلے عقل و وحی کی وحدت اور علم کو ایک کل کی حیثیت سے منضبط طور پر پیش کرنے میں غیر معمولی کاوشیں کیں۔ اس سے وحی اور انسانی مشاہدے اور عقل پر مبنی علم باہم مربوط اور متناسب وحدت کے طور پر سامنے آئے۔ فارابی اور اس کے ہم عصر حضرات ان کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوئے، اس پر کلام ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ کاوشیں، جن کی وجہ سے مدرسہ وحدت علم کی علامت بن کر سامنے آیا اور مسلمانوں کی فکری روایت اور مدرسے میں حقیقت کی وحدت کو نمایاں کیا گیا، ان کاوشوں کا سہرا ان ہی حضرات کے سر بندھتا ہے۔

یہ روایت، جس کا آغاز فارابی اور اس کے ہم عصر حضرات کے ہاتھوں نہیں بل کہ اس سے بھی پہلے صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین کے ہاتھوں ہوا تھا، گیارہ سو سال سے بھی زیادہ عرصے جاری رہی۔ ان گیارہ سو سالوں میں علم، جس کی نمائندگی مسلم علما نے مدرسے میں کی تھی، نے انسانی فکر اور علم کی ایک عالم گیر متوازی وحدت کی نمائندگی کی۔ ماہرین سائنس، معروف ماہر طبیعیات ابن سینا جیسے لوگوں، محدثین، مفسرین، فقہا، علما، فلسفہ وغیرہ حضرات نے ایک ہی چھت کے نیچے تعلیم و تربیت پائی۔ مسلم ہندوستان کی نام ور عبقری شخصیت، جن کا تذکرہ علامہ اقبال نے بھی کیا ہے، مدرسے ہی کی دین تھی۔ اقبال نے شیخ احمد سرہندی کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے عبقری تھے۔ نواب سعد اللہ خان کئی عشروں پر مشتمل ایک طویل عرصے تک

عظیم مسلم مغلیہ سلطنت (جو آج کے افغانستان، پاکستان، کشمیر، انڈیا، نیپال، بنگلا دیش، برما اور سری لنکا کے بعض حصوں پر مشتمل تھی) کے وزیر اعظم رہے ہیں۔ استاد احمد معمار، جو سات عجائباتِ عالم میں تاج محل کے معمار ہیں۔ یہ تینوں شخصیات آپس میں ہم جماعت تھیں اور ایک ہی مدرسے کی تربیت یافتہ تھیں۔

اس مثال سے واضح ہے کہ کس طرح انسانی دریافتوں اور فکری تکمیل کے سلسلے میں وحدتِ علم کا ظہور ہوا۔ فن تعمیر، علمی و دینی فکر اور انتظام و انصرام کے شعبہ جات میں ہندوستان کی نہایت بلند پایہ شخصیات مدرسے ہی کی پیداوار تھیں۔

مسلم ہندوستان میں تعلیمی روایت مختلف مدارج سے گزر کر متنوع ابعاد کی شکل میں ڈھلی ہے۔ ایک وقت تھا کہ برصغیر میں مسلم انتظام کا دائرہ آج کے پاکستان، وادئ سندھ، ملتان اور اس کے گرد کے علاقے میں محدود تھا۔ برصغیر کی مسلم تاریخ میں یہ عرب دور تھا جب ہندوستان کی روایات عرب مراکز علم، کوفہ، بصرہ، بغداد، دمشق، مکہ اور مدینہ کے ساتھ وابستہ تھیں۔ یہ جگہیں تعلیم و تعلم کا مرکز تھیں جہاں برصغیر کے اصحاب علم اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے گئے اور اپنے متعلقہ میدانوں میں اعلیٰ مقامات کا حصول کیا۔ علما کی ایک کھیپ ہے جن کے فقہ، سیرت، حدیث، عربی ادب وغیرہ میدانوں میں حصے کا اعتراف شرق اوسط، عراق، عرب اور شام کے علما نے بھی کیا ہے۔ عربی شاعری کا منتخب مجموعے حماسہ میں ان حضرات کے قطعات اور نظمیں بھی شامل ہیں، جن کا تعلق سندھ سے تھا۔ ابو عطا سندھی اسی طرح کے ایک عالم تھے جن کی بعض سطور ابو تمام نے منتخب عربی شاعری کے اس مشہور مجموعے میں شامل کی ہیں۔

اسی سے عربی فہمی اور عربی کے ایک مشترک زبان کی حیثیت سے استعمال کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سطح پر پہنچ چکی تھی جس سے ابو عطا سندھی جیسا شاعر پیدا ہو سکے۔

عرب علمی روایات کی اصطلاح کے اعتبار سے اس کمال کی ایک مثال ابو معشر نجیب سندھی کی ہے، جو سیرت اور حدیث میں اپنے کردار کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ اس نوعیت کی مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو نقل نہیں کیا جاسکتا۔ برصغیر کی

علمی تاریخ میں یہ دور تقریباً چار صدیوں تک جاری رہا۔ وسط ایشیا اور افغانستان سے آنے والے لوگ اس کے وارث بنے اور ساتویں صدی میں قطب الدین ایبک کے ہاتھوں سلطنت دہلی کے قیام نے برصغیر میں اسلامی تعلیم کو ایک نئی اٹھان بخشی۔ اب عرب دنیا کے ساتھ تعلقات شروع میں تو کم زور ہوئے اور پھر تقریباً ختم ہو کر رہ گئے۔ اب تعلقات افغانستان اور وسط ایشیا کے ساتھ قائم ہوئے۔ اب روایات کو افغانستان اور وسط ایشیا سے در آمد کیا جارہا تھا، جن میں زیادہ زور فقہ، اصول، عربی زبان اور اس کی گرامر پر دیا گیا۔ اسی عہد میں مختلف فنون کے روایتی اور مختصر متون کو ہندوستان میں لایا گیا، جو دہلی اور دنیا کے مختلف حصوں کے مدارس میں قائم تعلیم و تدریس کا موضوع بن گئے۔ اشاعت علم اور علمی سرگرمیوں کے پھیلاؤ کے اعتبار سے یہ عہد ہندوستان کی دینی تعلیم کی تاریخ کا زریں عہد ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں جب ابن بطوطہ نے ہندوستان کا سفر کیا تو اس نے دیکھا کہ صرف دہلی میں ایک ہزار سے زائد مدارس تھے، جن میں اعلیٰ تعلیم ہوتی تھی۔ اس نے دنیا کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے علما کا مشاہدہ کیا۔ اس کی ملاقات شیخ عبدالعزیز اردبیلی سے ہوئی جو شام سے محمد تغلق کی دعوت پر آئے، تاکہ ہندوستان میں تعلیم و تعلم کا مدرسہ قائم کریں۔ یہاں تقریباً ہر قصبے اور گاؤں مین مدارس تھے جو نہ صرف مسلمانوں بل کہ ہندوؤں میں بھی اشاعت علم کا فریضہ انجام دے تے تھے۔

یوں مدرسے کا کردار صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں ہے، بل کہ اس کا دائرہ ہندوؤں، بدھوں اور دوسروں تک بھی رہا ہے۔ ابھی تک ہندوؤں کی روایت کے مطابق علم دو مختلف گروہوں میں محدود رہا ہے۔ مذہبی علم ایک مخصوص طبقے میں محدود جب کہ دنیوی علم ایک دوسرے طبقے میں خاص تھا۔ ہندو معاشرے کے دیگر طبقات کو کسی قسم کے علم تک رسائی کی کوئی اجازت نہیں تھی۔ وہاں مختلف طبقات تھے۔ شودر طبقے کو نہ صرف نظرانداز کیا جاتا تھا بل کہ اگر اس طبقے کا کوئی فرد بلاارادہ بھی علم تک رسائی حاصل کر لیتا تو اس کا یہ عمل جرم اور گناہ تصور کیا جاتا تھا اور اس کے کان میں

پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر سزا دی جاتی تھی۔ یہ قانون ان کی مذہبی کتابوں کی دین تھا۔ مدرسے نے پہلی بار ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں (سکھ وہاں نہیں تھے بعد کے دور میں ایسا ہوا) جین مت کے پیرو کاروں اور بدھوؤں کے لیے بھی علم کا دروا کیا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ ہندوؤں کے تمام طبقوں نے علم حاصل کیا۔ وہ فارسی زبان کے ماہر بنے جو اس وقت عدالت، ثقافت اور بازار کی زبان تھی۔ بدھ، فارسی اور اسلامی قانون کے ماہر بنے۔ بہت سے ہندو، بدھ اور دیگر مذاہب کے اہلِ علم ایسے ہیں جنھوں نے مدرسے کی بہ دولت باعث مختلف علوم وفنون میں اپنا اثر چھوڑا ہے۔ تاہم اس عہد میں مدرسے کا ایک منفی پہلو یہ نظر آتا ہے کہ اس میں اشاعت علم اور آزادانہ تحقیق ومطالعے کے باب میں دل چسپی کی ے م یابی یا نایابی نظر آتی ہے۔ اب علم کا زیادہ ار تکاز ان متون پر تھا، جو وسط ایشیائی یا عرب ممالک میں کہیں تیار ہوئے۔ اصول فقہ، فقہ، منطق اور فلسفے کے متون ہندوستان بر آمد کیے گئے اور ان کو درسی کتابوں کی حیثیت دے دی گئی۔

ہندوستان کے مسلمان علما کا حصہ، جو کہ کمیت میں بڑا تھا لیکن شروحات ہی تک محدود تھا، شروحات اور وسط ایشیا یا عرب دنیا سے آئے ہوئے متون پر حواشی پر مشتمل تھا۔ یہ حصہ حواشی پر حواشی اور پھر ان پر مزید حواشی پر مشتمل تھا۔ کئی کتابیں اس کی مثال ہیں کہ جب آپ کتاب کھولتے ہیں تو ایک گونہ لطف اور پریشانی ہوتی ہے کہ کتاب سے کس طرح استفادہ کیا جائے؟ بہ یک وقت ایک ہی صفحے پر آپ کو دس یا بعض اوقات اس سے بھی زیادہ متون مل جائیں گے جو باہم دگر مخلوط ہوتے ہیں۔ اصل متن، شرح، شرح کی شرح، شرح کی شرح کی شرح، پہلی شرح پر حواشی، دوسری شرح پر حواشی، تیسری شرح پر حواشی، حواشی پر حواشی۔ یہ وہ میدان تھا جو علما کی تگ وتاز کا مرکز تھا۔ کوئی شک نہیں کہ یہ ایک علمی سرگرمی اور مصنفین کی عالی دماغی اور اذہان رسا کا عکس تھا، لیکن اس سب کچھ میں ان کی توجہ۔کتاب کی لفظی موشگافیوں پر مرکوز تھی، خود علم کی خدمت اس اسلوب نے کم ہی کی۔ اس نے مختلف اسلامی علوم وفنون کی نشوونما میں کمی کے رجحان کو جنم دیا۔ ابتدائی عہد کے مسلمان علما نے جو

کچھ پانچویں یا چھٹی صدی تک کر لیا تھا اس میں بہت کم مزید حصہ ڈالا گیا یا پیش رفت کی گئی۔

تاہم اگر ہم اس منفی پہلو کو نظر انداز کر دیں اور متن سازی کے رجحان پر نظر رکھیں تو ہمیں بہت دل چسپ اور حیرت انگیز مثالیں مل جائیں گی۔ میرے پاس اس وقت کوئی کتاب تو نہیں ہے تاہم مجھے ایک عالم کے تیار کردہ ایک متن کا علم ہے جو ایک مضمون کا رواں دواں متن تھا۔ پھر اس نے یہ کیا کہ اس نے متن کی نص کو کئی کالموں میں تقسیم کیا کہ اگر متن کو کالموں کے مطابق افقی اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو یہ ایک علاحدہ مضمون کا ایک مختلف متن ہو۔ اگر پیرا گراف کو کالموں کی ترتیب سے دیکھا جائے تو پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا کالم۔ الگ الگ متون کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ایک ہی صفحے پر سات متن ہوتے جو باہم دگر ملے ہوتے تھے اور صرف اتنا ہی نہیں، بل کہ ایک متن میں تین مختلف زبانیں موجود ہوتی تھیں۔ رواں متن عربی ہے۔ اگر آپ مثلا کالم ایک کو دیکھیں تو یہ فارسی میں ہے، دوسرا ترکی۔ یہ شعبدہ بازی (اگر تعبیر کی اجازت دی جائے) مصنف کے ذہنِ رسا کی عکاس، فکرِ گردوں سیر کی غماز اور زبان پر فاضلانہ قدرت کا منہ بولتا اظہار ہے، لیکن اس نے بہ حیثیتِ مجموعی علم کے پھیلاؤ اور مختلف تخصصات کے نشوو ارتقا میں کم ہی کوئی کردار ادا کیا ہے۔ یہ صورتِ حال عہدِ سلاطین کے اختتام اور ہندوؤں اور پھر مغلوں کے ہاتھوں خاندانِ لودھی کے زوال تک جاری رہی۔

جب مغل ہندوستان آئے اور ہمایوں کے بعد اپنے آپ کو مستحکم کیا، تو برصغیر میں ایک اور روایت متعارف ہوئی، یہ روایت فلسفے اور منطق کی تھی جس کی ساخت پرداخت اور راور تانابانا ایران میں تیار ہوا۔ اب برصغیر اور مدارس کے علمی روابط ایران کے ساتھ استوار ہوئے، اور ایرانی علما بڑی تعداد میں بلائے گئے۔ سیکڑوں بل کہ ہزاروں کی تعداد میں اہلِ علم وادب یہاں آئے۔ شاعر، فلسفی، منطق اور دیگر علوم کے ماہرین نے ہندوستان آ کر مدارس کے نصاب میں فلسفے اور معقولات یا عقلی علوم کو متعارف کروایا۔ اب اور اس کے بعد کے دور میں مدرسہ دو مختلف روایات کا امین بن گیا: وسط

ایشیا اور افغانستان کی روایت جو متن، مختصر متن اور متن پر متن کے ذریعے فقہ اور اصول فقہ پر زور دیتی ہے اور دوسری روایت ایرانی ہے، جس میں زور فلسفے اور منطق پر تھا۔ عہدِ مغلیہ میں مدرسے کا یہ بنیادی خاکہ ہے۔

ہندوستان کے مختلف شہروں میں کئی روایات قائم تھیں، جن میں سے دو خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ایک رویت لکھنؤ میں ایک ادارے فرنگی محل میں پروان چڑھی۔ فرنگی محل دراصل ایک عمارت کا نام ہے، جسے جہانگیر نے برطانوی تاجروں کے ایک گروہ کے لیے مختص کیا تھا، جنھیں ہندوستان میں کاروبار اور تجارت کی اجازت دی گئی تھی۔ ان کا دفتر وہیں تھا اور اس کے ذریعے وہ اپنی سرگرمیاں سرانجام دیتے تھے۔

اورنگ زیب عالم گیر کے دور میں جب ان سے متعلق شکایات ملیں کہ وہ جہانگیر کی طرف سے دی گئی ہدایات کی پابندی نہیں کرتے تو اورنگ زیب نے ان کے خلاف انتظامی کارروائی کی، اور ان سے وہ عمارت چھین کر انھیں اس سے بے دخل کر دیا۔ اس کے بعد یہ عمارت مسلمان علما کی ایک جماعت کو دی گئی جس میں انھوں نے ایک مدرسہ قائم کر دیا۔ چوں کہ یہ عمارت ''فرنگیوں'' کی ملکیت میں تھی، اس لیے یہ ''فرنگی محل'' (قصرِ مغربیاں) کے نام سے معروف ہوئی۔ یہ مدرسہ بھی مدرسۂ فرنگی محل (فرنگیوں کے محل یا قلعے میں قائم کردہ مدرسہ) کے نام سے معروف ہوا۔ یہ مدرسہ، اورنگ زیب عالم گیر کے ایک معاصر فقیہ اور عالم مولانا نظام الدین سہالوی نے قائم کیا تھا، جنھوں نے عالم گیر کے حکم سے فتاویٰ عالم گیری مرتب کرنے والی دو سو علما کی کمیٹی کی نگرانی بھی کی تھی۔

آپ کو مدرسہ قائم کرنے کی ذمے داری سونپی گئی جسے آپ نے قائم کیا، جس نے فقہ اور اصول کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے برصغیر کی علمی روایت پر غیر معمولی اثر مرتب کیا۔ فقہ اہلِ اسلام کا ایک زندہ قانون ہے جو اسلامی شریعت کی حرکی روایت کا امین ہے۔ اس میں ہر زمان و مکاں کے لیے راہ نمائی اور نمو پذیری کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ شریعت وہ راہ نما قانون اور نظام ہے جس نے مسلمانوں کی ہمیشہ بھرپور راہ نمائی

کی اور ان کو تاریخ کے ہر دور میں کسی بھی چیلنج سے نمٹنے کے قابل بنایا۔

تاہم بد قسمتی سے مدرسے کی یہ تعلیمی شریعت وہ چیز نہ تھی جو زندہ اور متحرک اسلامی روایت سے عبارت ہے۔ یہ بس ان متون تک محدود تھی جو ہندوستان سے باہر کہیں (وسط ایشیا یا عرب دنیا میں) تیار کیے گئے اور جن کے مصنفین کے پیش نظر مختصر نویسی کی مہاتوں کا زیادہ سے زیادہ اظہار ہوتا تھا، جو جس قدر زیادہ اختصار میں ماہر اور مشکل پسند ہوتا، اسی قدر زیادہ مشہور اور ممتاز ہوتا۔ یہ متون مدرسہ فرنگی محل میں پڑھائے جاتے تھے۔ طلبہ سے مطلوب ان متون کو زبانی یاد کرنا اور مصنف و شارح کے طرزِ اطناب اور لفاظی پر توجہ مرکوز کرنا تھا۔ قواعدِ زبان، فقہ اور اصولِ فقہ اسی طرز پر پڑھائے جاتے تھے۔

اصولِ فقہ کو تفقہ اور نئے اصولِ قانون وضع کرنے کے وسیلے کے طور پر پڑھانے کے بہ جائے الفاظ کی بازی گری کے طور پر پڑھایا جاتا تھا، جس کا ارتکاز کسی مصنف کے متن پر ہوتا تھا۔ یہی حال فقہ کا تھا۔ اس لیے ہماری ناچیز رائے میں مدرسۂ فرنگی محل کے عظیم کردار کے باوجود فقہ اور اصولِ فقہ کے میدان میں اس کا اثر بے حد محدود تھا۔ اس عمل کے ذریعے کوئی نئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی، اگر کچھ نئی کتابیں تھیں بھی تو ان میں کوئی نیا خیال پیش نہیں کیا گیا، نہ اس میں اصولِ فقہ کی وسیع میدان کا کوئی حصہ نیا شامل کیا گیا۔ کم از کم مدرسۂ فرنگی محل کی یہ صورتِ حال مغلیہ سلطنت کے سقوط تک جاری رہی۔

دوسری رویت جون پور کی تھی جو جنوبی ہندوستان، جنوبی یوپی میں قائم تھی۔ اس کو شیرازِ ہند کہا جاتا تھا۔ شیراز کی علمی روایت کا ارتکاز زیادہ تر فلسفے پر تھا، جس کو معقولات یا عقلی علوم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ شیرازِ ہند، جون پور نے بعض بڑے جلیل القدر علما پیدا کیے، لیکن ان کی دل چسپی کی تگ و تاز کی جولاں گاہ، ایران سے در آمد شدہ یا ایرانی علما کے پروردہ عقلی علوم تھے۔ جون پور کی تاریخ میں ملا محمود جون پوری سب سے نمایاں شخصیت سمجھے جاتے ہیں۔ بعض علما کے نزدیک وہ امام شاہ ولی اللہ کے پایے کی شخصیت تھے۔ بعض دیگر اہلِ علم کا خیال ہے کہ وہ نبوغِ علمی اور فکری عبقریت میں

شیخ احمد سرہندی کی ہم سر شخصیت تھے، لیکن ان کا یہ سارا فضل و کمال ایران میں رائج اور مشہور فلسفیانہ بحثوں کی تلخیص واختصار پر مشتمل متون تیار کرنے تک محدود تھا۔ یہ جون پور کی علمی روایت تھی۔

جب امام شاہ ولی اللہ عرب دنیا کے تقریباً پندرہ ماہ کے قیام کے بعد وہاں سے ہندوستان لوٹے تو انھوں نے ان تعلیمی نظاموں میں کچھ تبدیلیوں اور بہت پیش رفت کو متعارف فرمایا۔ آپ نے فلسفے، الفاظ و متون کی جادو گری اور کتبِ قواعد کی شروح و حواشی کے بہ کثرت استعمال میں ضرورت سے زیادہ توغل کا الغا کرڈالا اور ایک بہت سادہ اور نئے نصابِ تعلیم کی آب یاری کی، جسے اولاً ان کے والد گرامی، شاہ عبدالرحیم نے متعارف کروایا تھا۔ امام شاہ ولی اللہ نے اس میں اپنے والد کی سرپرستی میں پڑھے ہوئے نصاب کی تفصیل اپنی خود نوشت سوانح ''الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف'' میں ذکر کی ہے۔ انھوں نے اس نصاب کے مختلف پہلوؤں اور متون پر بھی گفت گو کی ہے۔ ابھی تک فرنگی محل، جون پور یا دیگر متعدد اداروں یا مدارس کے نصاب میں قرآن و حدیث کو کوئی نمایاں اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ تعلیم کسی حد تک عمومی تھی اور اس میں کئی مضامین داخل تھے۔ ایک صاحب علم کے اندازے کے مطابق ایک چھت تلے اور ایک نظام کے تحت تقریباً چھپن مضامین کی تدریس ہوتی تھی۔ مقصد یہ پیشِ نظر ہوتا تھا کہ طالب علم کو علم کی تازہ ترین پیش رفت سے آگاہی فراہم کی جائے۔ اس کی بنیاد مختصر متون تھے جن کا یاد کرنا طالب علم کے لیے ناگزیر تھا، تاکہ اس کے ہاتھ میں مختلف علوم وفنون کے بنیادی مسائل کی ایک کلید ہاتھ آجائے۔ اس نصاب میں طب، حساب، جیومیٹری اور اس طرح کے دیگر فنون شامل ہوتے تھے جن کی اساس ایران، وسط ایشیا یا عرب دنیا کے علما کے تیار کردہ مختصر متون تھے۔

امام شاہ ولی اللہ کا خیال تھا کہ یہ نصاب اس پایے کا اہل اور جید عالم تیار کرنے کے لیے موزوں نہیں تھا جو ان کے پیشِ نظر تھا۔ دیگر اداروں میں مروج یونانی فلسفے کے مقابلے میں آپ نے قرآن، حدیث اور اسرارِ شریعت کے مطالعے پر زور دیا۔ شاہ

صاحب نے متعدد متون تحریر کیے جنھیں داخلِ نصاب کیا گیا۔ متنِ حدیث کے مطالعے کے لیے موطا امام مالک مع شروحات لازمی قرار دی گئی متن پر ضرورت سے زیادہ کی روایت کم کی گئی۔ انسانیت، برصغیر اور شمالی ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک پہلا تعارف تھا جس میں نصاب کو قرآن، حدیث اور سیرتِ رسول ﷺ کی بنیاد پر استوار کرنے کی سنجیدہ اور منضبط کوشش کی گئی۔

اس سے پہلے اسی طرح کی ایک کوشش شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی کر چکے تھے جہاں سیرت اور حدیث کی کچھ کتابیں متعارف کروائی گئیں، لیکن شاہ عبدالحق کی وفات کے بعد برصغیر کی علمی روایت میں ان کوششوں کا راستہ بند ہو گیا۔

یہ صورتِ حال تھی جب مغل سلطنت کا سقوط ہوا۔ مدرسۂ فرنگی محل کی روایت وہی رہی۔ شرقِ برصغیر کی روایت جون پور کے طرز ہی پر رہی؛ البتہ دہلی، لکھنؤ اور ٹھٹھہ (اور بعض دیگر شہروں) کے کچھ (چھے یا سات) مدارس نے امام شاہ ولی اللہ کے متعارف کردہ نصاب کی ترویج کی جس میں بنیادی زور فہمِ قرآن اور متنِ حدیث کے مطالعے پر تھا۔ جب اٹھارویں صدی کے درمیان برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال، بہار اور اڑیسہ پر قبضہ جمالیا اور مغل بادشاہ، شاہ عالم (شاید شاہ عالم ثانی) کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی ہوئی پیش رفت ایک دن سارے برصغیر کو قابو میں لے لے گی، تو اس نے کچھ اقدام کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن اس سیلابِ بلا خیز کا کسی عسکری قوت کے ذریعے مقابلہ کرنے کے بہ جائے اس نے اس اٹھتی ہوئی طاقت سے سمجھوتہ کرنے اور تین صوبوں میں اس کی قوت کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مغل بادشاہ نے کمپنی کو ایک چارٹر جاری کیا جس میں اس کو محصول جمع کرنے، انتظامِ مدنی اور بعض دیگر شہری معاملات کی اجازت دی۔

یہ مغلیہ سلطنت کا بالفعل قانونی زوال تھا۔ انھوں نے اپنی سلطنت کے تین بڑے صوبے گنوا دیے جو اس وقت سب سے مؤثر صوبے شمار ہوتے تھے۔ بنگال اس وقت مغلیہ سلطنت کا سب سے پر ثروت صوبہ تھا۔ اورنگ زیب کی سب مہمات کا مالی خرچ بنگال کے لگان سے اٹھتا تھا اور مغلیہ سلطنت کا زیادہ تر مدار اسی کے مالی وسائل پر تھا۔ یہ امیر

صوبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا گیا اور مغلیہ سلطنت تین صوبوں: بنگال، بہار اور اڑیسہ سے اہلِ برطانیہ کے حق میں سبک دوش ہو گئی۔

اس سبک دوشی کے موقع پر جس معاہدے پر دست خط ہوئے، اس وقت اس عمل کو دست برداری نہیں کہا گیا مگر یہ عملاً دست برداری ہی کی ایک شکل تھی۔ معاہدے میں یہ کہا گیا تھا کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان کے معاملات کو اسلامی عدالتوں میں، مسلمان ججز، قاضیوں اور مفتیوں کی راہ نمائی میں اسلامی شریعت کی رو سے نبھایا جائے گا۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اس شرط پر راضی ہو گئی اور اس نے تینوں صوبوں کے مختلف حصوں میں عدالتیں قائم کیں۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے آگے بڑھ کر یوپی اور دلی کے گردونواح کے دیگر صوبوں پر بھی قبضہ جمالیا اور آخر کار ۱۸۰۶ء میں وہ دلی میں داخل ہو گئی تو پھر وہی معاہدہ دوبارہ عمل میں لایا گیا، جس میں دیوانی امور کا قانون کمپنی کو دیگر صوبوں میں لاگو کرنے کی بھی اجازت دی گئی۔ اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کو مغلیہ سلطنت کی صواب دید پر ہندوستان پر حکومت کرنے کی سرکاری اجازت دے دی گئی۔ ان دنوں جب ایک عمومی اعلان کیا گیا تھا تو قانونی دست برداری کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا:

تمام مخلوق اللہ کی ہے، تمام کائنات اللہ کی ہے، سلطنت، بادشاہ کا حق ہے
لیکن سرکاری فیصلے کمپنی بہادر کے ہیں۔

کمپنی نے آغاز میں تو مسلمانوں کو کم از کم یہی تاثر دیا کہ وہ معاہدے کی پاس داری کر رہی ہے اور اسلامی عدالتیں قائم کر رہی ہے۔ اس نے عملاً ایسے کیا بھی، چناں چہ عدالتیں قائم کیں، ان میں قاضی، جج اور مفتیوں کا تقرر کیا۔ اس تقرر میں سہولت اور آسانی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ قاضیوں کا انتخاب فرنگی محل یا درسِ نظامی کے فضلا میں سے ہو گا۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریز بڑے مربوط طریقِ کار کے حامل لوگ تھے۔ وہ ابھی بھی نظم کے بہت پابند ہیں اور جب بھی انھوں نے کوئی الٹا یا سیدھا کام کرنا ہو تو وہ اسے ایک ضابطے اور قانون کے تحت ہی کرتے ہیں۔ پہلے وہ کوئی قانون بناتے ہیں، اس کے لیے ضابطے تیار کرتے ہیں، ایک طریقِ کار مہیا کرتے ہیں

اور پھر کام کا آغاز کرتے ہیں، خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ چناں چہ انھوں نے یہ کام بھی ایک قانون اور ضابطے کے تحت ہی کیا۔ وہ طریقہ یہ تھا کہ قاضی یا مفتی وہی متعین ہوں گے جو درسِ نظامی کے فاضل ہوں گے، ججز کے لیے فقہ حنفی کو ماخذ کی حیثیت حاصل ہو گی۔ اس مقصد کے لئے ہدایہ کا انگریزی ترجمہ کیا گیا۔ فتاوی عالم گیری کی انگریزی میں تلخیص کی گئی اور فقہِ حنفی کے بعض بنیادی متون کو برطانوی اہلِ علم نے انگریزی میں منتقل کر دیا۔ اس کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے افسروں کو فقہِ حنفی کے مطابق مختلف معاملات کی قانونی حیثیت سے آگاہی فراہم کرنا تھا۔

اس اقدام نے درسِ نظامی کو سارے ہندوستان میں بہت مقبول بنا دیا، کیوں کہ یہ فضلا کو اعلیٰ مشاہروں پر ملازمت کے مواقع فراہم کرتا تھا۔ یہ فضلا دیگر اداروں میں کم مشاہرہ پاتے تھے لیکن کمپنی میں ان کو اعلیٰ وظائف دیے جاتے تھے۔ اس وجہ سے درسِ نظامی بہت معروف ہو گیا اور ان دنوں یہ اسی نام سے مشہور ہوا۔ اب، ۱۷۶۱ء کے بعد درسِ نظامی بہ تدریج ہندوستان کے تمام حصوں میں مقبول ہوتا گیا۔ مدارس نے درسِ نظامی کو اپنے نصاب کے طور پر اختیار کرنا شروع کیا، لیکن تاجِ برطانیہ کی ابھرتی ہوئی طاقت کے ساتھ مدارس کی تعداد کم ہونا شروع ہو گئی جس کی مختلف وجوہ ہیں۔

ایک بہت معروف مدرسہ تھا جو ایک طویل عرصے تک قائم اور جاری رہا۔ اس کا نام مدرسہ غازی الدین تھا اور بعد میں دہلی کالج کے نام سے موسوم ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد اس کالج کو بھی اپنے کنٹرول میں لے کر اس کا ایک نیا نصاب تشکیل دیا، بعض بڑے مسلمان اہلِ علم کا اس میں تقرر کیا۔ ان ہی میں سے ایک عالم مولانا مملوک علی تھے جو دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس مولانا یعقوب نانوتوی کے والد تھے۔ آپ مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے علما کے استاد تھے۔ یہ تینوں فضلا مدرسہ غازی الدین یا دہلی کالج کے فارغ التحصیل تھے۔

۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور اس کے کوکبِ اقبال کے مکمل طور غروب ہونے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے تمام مدارس کو ختم کر کے رکھ دیا، اوقاف کا

نظام تلپٹ کر دیا اور ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم کے ساتھ کے گئے معاہدے کو پس پشت ڈال دیا۔ مسلم عدالتیں باقی نہ رہیں، نفاذِ شریعت کا معاملہ کالعدم ہو گیا اور قاضیوں اور مفتیوں کا وجود مٹ کر رہ گیا اور سب بساط لپیٹ کر رکھ دی گئی۔

مدارس کو اوقاف کی امداد، مرکزی حکومت کی توجہ اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم صوبائی حکومتوں یا امارتوں کی اعانت سے محروم کر دیا گیا اور کسی اسلامی تعلیم کی روایت کو باقی رکھنا ایک بہت بڑا مسئلہ بن کر رہ گیا۔

اس صورتِ حال میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی محمد عابد حسین اور بعض دیگر حضرات سامنے آئے اور دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ہندوستان میں اسلامی تعلیم اور اس کے اداروں کے ختم کرنے کی جو لہر برپا تھی، اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیم اور روایت کی حفاظت کی ممکنہ حد تک حفاظت کی جا سکے۔ یہ لوگ اسی روایت کے تربیت یافتہ اور درسِ نظامی کے متون اور کتب کے فاضل تھے، اس لیے انھوں نے مدرسے کے نصاب کے لیے درسِ نظامی ہی کو اختیار کیا تاہم اس میں دو بنیادی ترمیمات کیں۔ ابتدا میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے اصرار پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ منطق اور فلسفے کی کوئی کتاب بھی داخلِ نصاب نہیں کی جائے گی۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت چوں کی اصل مسئلہ اسلامی علوم کی حفاظت کا ہے، اس لیے قرآن، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور عربی زبان پر زیادہ زور دیا جائے اور ان ہی کو پڑھایا جائے۔ اس لیے ان کے نزدیک فلسفے، منطق اور دیگر مضامین کے پڑھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے ابتدا میں دارالعلوم دیوبند میں ترمیم شدہ درسِ نظامی کے اندر منطق، فلسفہ اور دیگر علوم شامل نہ تھے۔

دوسری اہم ترمیم یہ تھی کہ درسِ نظامی کے اختتام پر حدیث کے محض تعارفی نصاب کو شامل کیا گیا اور پھر آخر میں ایک مستقل سال حدیث کے خصوصی مطالعے کے لیے مختلف تبدیلیوں کے ساتھ خاص کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء تک دارالعلوم دیوبند کی تقریباً نوے سالہ طویل کے دوران میں متعدد تبدیلیاں کی گئیں۔ بعد میں فلسفے اور منطق کے علاوہ حدیث کی کچھ مزید کتابیں (طحاوی، مشکاۃ اور موطا امام محمد) بھی شامل کی گئیں۔

کافی بعد میں متنِ قرآن کا ترجمہ بھی شامل کیا گیا، جو غالباً دوسرے یا تیسرے سال سے شروع ہوتا تھا اور آخر تک چلتا تھا، جس کے نتیجے میں مکمل قرآن ایک مضمون کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔ اصولِ تفسیر پر بھی کچھ متون شامل کر دیے گئے۔ شاہ ولی اللہ کی قرآنی فلسفے اور تفسیری اصولوں پر کتاب الفوز الکبیر داخلِ نصاب کی گئی۔

یہ تبدیلیاں مختلف وقفوں سے کی گئیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں، غالباً ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں امام شاہ ولی اللہؒ کی شاہ کار کتاب حجۃ اللہ البالغۃ کو ایک تکمیلی ضمیمے کے طور پر شامل کیا گیا۔ یہ کتاب دارالعلوم کے فضلا کو پڑھائی جاتی تھی۔

اس طرح درسِ نظامی ہم تک پہنچا ہے۔ ۱۸۶۷ء (جب عہدِ برطانیہ میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی) سے ۱۹۴۷ء (جب ہندوستان خود مختار بنا) تک دارالعلوم اور اس طرح کے دیگر اداروں (جن کی تعداد ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایک ہزار یا اس سے کچھ زائد تھی) کے بنیادی مقاصد دو تھے:

۱۔ مختلف مساجد میں امام اور خطیب مہیا کرنا

۲۔ دارالعلوم اور اس طرح کے دیگر اداروں میں اساتذہ کی فراہمی

دارالعلوم کے قیام کے یہ دو بنیادی مقاصد تھے۔ آزادی کے بعد خاص طور پر پاکستان اور بنگلہ دیش میں مدارس کے اہداف و مقاصد پر نظر ثانی ضروری تھی۔ اب خاص طور پر پاکستان اور بنگلہ دیش جیسے آزاد مسلم ممالک اور کافی حد تک ہندوستان کے دینی مدارس کے سامنے وسیع تر مقاصد ہیں جن سے ان کو عہدہ برا ہونا چاہیے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ درسِ نظامی آیا وہی ہے جو شروع میں تھا یا اس میں تبدیلیاں ہوئی ہیں؟ اب ہم کو ائمہ اور مدارس میں مختلف علوم وفنون پڑھانے کے لیے اساتذہ کی ضرورت ہے۔ یہ مدارس بیسویں صدی کے شروع میں اگر سو تھے تو آج ان کے مقابلے میں ہزاروں ہیں۔ اب پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں مدارس کی تعداد پچاس ہزار کے قریب ہے اور ان میں لاکھوں طلبہ زیرِ تعلیم ہیں، اس لیے مذکورہ بالا ضرورت یقیناً بڑھ رہی ہے۔ مدارس میں اساتذہ کی فراہمی یقیناً ایک بہت بڑی ضرورت ہے، تاہم اس کے مقابلے ہماری تین ضروریات اور بھی ہیں۔

ہمیں سکولوں اور کالجوں کے مرکزی دھارے میں اسلامیات پڑھانے کے لیے اساتذہ درکار ہیں، جب کہ پاکستان میں اسلامیات ایک لازمی مضمون ہے۔ ہمارے پاس نصف لاکھ سے زائد ثانوی سکول، دس لاکھ تک کالج اور سیکڑوں یونی ورسٹیاں ہیں۔ ان سب اداروں میں اسلامیات ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ اس لیے ہر ادارے کو مختلف سطحوں پر اسلامیات پڑھانے والا استاد چاہیے۔

پھر ہمیں ایسے اہلِ علم، اصحابِ فضل راہ نماؤں فقہا کی ضرورت ہے جو اُمتِ مسلمہ کو درپیش چیلنجز کے بارے میں ہماری ملت کو عمومی راہ نمائی دے سکیں۔ ہمیں ایسے ماہرینِ اقتصادیات کی ضرورت ہے جو پاکستان میں تبدیلی لا سکیں۔ اور موجودہ صورتِ حال مےں پاکستان کو ایک اسلامی اور شرعی معاشی نظام دے سکیں۔ اس مقصد کے لیے محققین کی ایک ایک الگ کھیپ درکار ہے۔

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ موجودہ دینی مدارس صرف پہلے دو اہداف کو پورا کر سکتے ہیں۔ ان کے فضلا کسی حد تک امامت و خطابت یا پھر مختلف مدارس میں تدریس کی ذمے داریاں بجالا سکتے ہیں۔ اگرچہ میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مدرسہ کے فاضل کو جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، ایک اچھا امام بننے کے لیے ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کراچی، اسلام آباد، لاہور، ڈھاکہ، چاٹ گانگ، دھلی یا بمبئی میں نمازیں پڑھانے والے کو میبذی، ہدایت الحکمت یا شرح ہدایت الحکمت پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ اسے شرح جامی کی بال کی کھال اتارنے والی شروحات اور حواشی کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہمارے برصغیر اور خاص طور پر صوبہ سرحد (حال خیبر پختون خواہ) میں اس کی شروحات اور شروحات کی شروحات پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ایک طالب علم کافیہ پڑھتا ہے جو عربی نحو کا ایک متن ہے، لیکن یہ پڑھنے والوں کو کبھی نحو نہیں آتی۔ مجھ سے لکھ کر لے لیجیے، ان میں سے ننانوے فی صد ایسے ہیں جن کو درست عربی کا ایک جملہ بھی لکھنا نہیں آتا۔ وہ درست عربی کا ایک جملہ بھی درست بول نہیں سکتے۔ کافیہ کے ذریعے حاصل کیے گئے ان کے نحوی ''کمال'' کا یہ عالم ہے۔ اس کا طرزِ تدریس یہ ہے کہ اس کی پہلی سطر پر دو تین ہفتے بحث ہوتی ہے جس کا نحو سے کوئی تعلق

نہیں ہوتا۔ کافیہ کا مصنف بے چارہ اس کے شروع میں بسم اللہ یا الحمد للہ نہیں لکھ سکا، اس لیے پہلا سوال ہی یہ قائم کیا جاتا ہے کہ مصنف نے بسم اللہ کیوں نہیں لکھی؟ اب یہاں علمائے کرام خیالی گھوڑے دوڑانے اور قیاسات قائم کرنے لگتے ہیں کہ اس کی یہ یہ وجہ وہ سکتی ہے۔ بال کی کھال اتاری جاتی ہے جس کا عربی نحو سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا اور اس سطح پر طالب علم بیچارے کی کوئی استعداد نہیں ہوتی۔ اس کے بعد وہ شرح جامی شروع کرتا ہے جو کافیہ کی شرح ہے۔ شرح جامی کا ایک حاشیہ ہے جس کا نام تحریرِ سنبٹ ہے اور پھر اس کا حاشیہ سوالِ کابلی ہے۔ سوالِ کابلی پر ایک حاشیہ، سوالِ باسولی ہے۔ یہ سب کچھ صوبہ سرحد میں پڑھایا جاتا ہے اور باوجود اس کے کہ دس برس تک یہ کچھ پڑھایا جاتا ہے، یہ سب پڑھنے والے عربی کا ایک جملہ لکھنے کے اہل بھی نہیں ہوتے۔ پھر اس کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر اس کا کچھ فائدہ ہی بھی تو مجھے اس سے انکار نہیں لیکن ایک امام کو ان چیزوں کی کیا ضرورت؟ ان کے مقتدی ان سے یہ سوالات نہیں پوچھیں گے۔ یہ امام اور مدرسے دونوں کے لیے وقت کا ضیاع ہے۔ مستقبل کے متوقع امام کو تیار کرنے کے لیے ان مضامین کی تدریس وسائل کا ضیاع ہے جن کی اسے کبھی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس کے مقابلے میں اس کو روزمرہ زندگی کے مسائل جاننے کی ضرورت ہے۔ لوگ اسے بینک کے سود کے بارے میں سوال کریں گے۔ لوگ اسے انگلینڈ میں رہن کے بارے میں پوچھیں گے۔ وہ اس سے لیزنگ اور شیئرز کی خرید وفروخت کے بارے میں دریافت کریں گے۔ امام بے چارہ ان سوالوں کو جواب نہیں دے سکتا، کیوں کہ اسے یہ چیزیں پڑھائی ہی نہیں گئیں۔

اس لیے میرا احساس یہ ہے کہ ایک امام کے لیے درسِ نظامی کافی نہیں ہے۔ اس میں ترمیم اور تبدیلی اور اضافوں کی ضرورت ہے۔ جہاں تک درسِ نظامی کے اساتذہ یا اس کی کتابیں پڑھانے والوں کا تعلق ہے تو وہ سارے یا کم از کم بعض یہ نصاب پڑھانے کے اہل اور موزوں ہیں، لیکن اولیول یا اے لیول کے بچوں کو پڑھانے کے لیے مدرسوں کے پڑھے ہوئے لوگ بہ مشکل ہی اہل ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے کچھ اضافے

تقاضے پورا کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان کے اندر اسلامی بینکنگ رواج پا چکی ہے اور اس سے متعلق احکام جاننے کی ضرورت پائی جاتی ہے۔ اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے پاکستان میں اسلامی طرز کے مطابق بنکاری کی خواہش رکھنے والے بنکوں کے لیے ایک قانونی فریم ورک قائم کیا ہے، تاکہ شریعت سے مطابقت رکھنے والے موڈز کو پروان چڑھایا جا سکے۔ اسٹیٹ بنک کا یہ مطالبہ ہے کہ جو بنک یا تمویلی ادارہ شریعت سے مطابقت رکھنے والے موڈز اور آلات کا خواہش مند ہے، اس میں ایک شریعہ اڈوائزر ہونا چاہیے۔ ملکی سطح پر انھوں نے ایک شریعہ بورڈ قائم کیا ہے، جس نے دوسرے بنکوں میں لاگو کرنے کے لیے اصول اور پالیسیاں وضع کی ہیں۔ اس کے پاس اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی اتھارٹی ہے اور تمام بنکوں سے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایک شریعہ اڈوائزر کا تقرر کرے، جو بنک کی معاونت کے ساتھ اس بات کی یقین دہانی کرائے کہ بنک کی مصنوعات اور معاملات شریعت کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔

ہم نے شروع میں یہ طے کیا تھا کہ شریعہ اڈوائزر درس نظامی اور مدرسے کا فاضل ہونے کے ساتھ انگریزی اور بینکنگ کا علم بھی رکھتا ہو۔ تین مہنے کے بعد بنکوں نے یہ شکایت کی کہ ہمیں کوئی ایک بھی (اور اس بات کو میں تاکید سے کہتا ہوں) آدمی ایسا نہیں ملا جو درس نظامی کا فاضل ہونے کے ساتھ انگریزی اور بینکنگ کے مسائل کا علم بھی رکھتا ہو۔ یہ لوگ بورڈ کے پاس آئے کہ اس ضابطے پر نظر ثانی کی جائے اور اب بورڈ اس ضابطے پر نظر ثانی کر رہا ہے، تاکہ اس مہارت کے افراد دست یاب ہو سکیں جو بنکوں کے لیے کار آمد ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درسِ نظامی کے فضلا، ان کے موجودہ نظام کے لیے زیادہ اہل نہیں ہیں۔ ان کے پاس اداروں اور حکومت، نیز قوانین و اداروں کے اسلامیانے کے عمل سے وابستہ باڈیز کو راہ نمائی فراہم کرنے کے لیے مناسب افراد نہیں ہیں۔ بنگلہ دیش میں ایک بڑا اسلامی بنک کام کر رہا ہے اور یہ اسلامی بنک جدید دنیا کا ایک کام یاب اسلامی بنک ہے۔ اگر اسے دینی محققین کی ایک جماعت کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ بینک مدارس سے یہ مطالبہ کرتا ہے، تو میرا خیال

نہیں ہے کہ روایتی مدارس کوئی ایسی ماہرانہ کھیپ اسے مہیا کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔

اس کے بعد ان بڑے چیلنجز کا نمبر آتا ہے جو اس وقت مسلمان امت کو درپیش ہیں۔ تقریباً دس سال پہلے ہنٹنگٹن نے ایک کتاب ''تہذیبوں کا تصادم'' کے نام سے تحریر کی تھی۔ فرض کیجیے کہ ایک دینی عالم سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس کتاب کا جواب تحریر کرے تو برصغیر میں کراچی سے راس کماری تک یا خیبر سے چاٹ گانگ تک، درسِ نظامی کے کتنے فضلا یا کوئی ایک ہی فاضل ہے جو اس کتاب کا جواب تحریر کر سکے؟ میرا خدشہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایک آدمی بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کا سوال ہے کہ ہماری دینی تعلیم پر نظر ثانی اور تشکیل نو ہونی چاہیے، تاکہ مندرجہ ذیل پانچ میدانوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس میٹرک کے بعد ایک اچھا امام تیار کرنے کے لیے دو، تین یا چار سالہ کورس ہونا چاہیے۔ اگر کسی کے پاس سکولوں سے میٹرک کی سند ہے، وہ حافظ اور قاری بھی ہے، تو اسے تین سالوں میں عربی اور قرآن کا متن مع ترجمہ بھی پڑھا دیا جائے۔ اس کے ساتھ دو یا تین تفاسیر، ایک اردو یا بنگالی زبان میں اور ایک عربی میں، منتخب احادیث (مثلاً مولانا منظور نعمانی کی ''معارف الحدیث'' یا مولانا بدر عالم میرٹھی کی ''ترجمان السنہ'') اور ایک عربی کا مجموعۂ حدیث جیسے مشکاۃ، دو تین اصولِ فقہ اور فقہ کی منتخب اچھی کتابیں جیسے قدیم کتابوں میں سے ''ہدایہ'' اور جدید کتابوں میں سے ''الفقہ الحنفی وادلتہ''، جدید معاشی، قانونی اور فقہی مسائل اور حکومتی و دستوری اور بین الاقوامی قانون وغیرہ امور سے متعلق کچھ کتابیں پڑھا دی جائیں۔ اس طرح ایک امام اس قابل ہو سکے گا کہ وہ مختلف مسائل پر پوچھے گئے مسائل کا جواب دے سکے۔ یہ نصاب میٹرک کے بعد تین سالوں میں پڑھایا جا سکتا ہے۔

تین سال کی اس بنیادی دینی تعلیم کے بعد، جو انٹرمیڈیٹ یا اے لیول کے برابر

ہے، دو، تین یا چار سالہ ایک دوسرا کورس ان لوگوں کے لیے ہونا چاہیے، جو سکولوں اور کالجوں میں ذمے داریاں ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کورس میں کچھ اضافی مضامین کے ساتھ مسلم امت کو پیش آمدہ موجودہ مسائل کے حوالے سے تعلیم بھی ہونی چاہیے۔

اس کے بعد موجودہ درس نظامی کا درجہ آتا ہے جو ان لوگوں کو پڑھانا چاہیے جو ان مدارس میں تدریس کرنا چاہتے ہیں، تاہم اس میں بھی ترمیم ناگزیر ہے۔

صرف و نحو وغیرہ کی کچھ غیر ضروری اور غیر مؤثر کتابیں نکال کی ان کی جگہ نئی کتابیں شامل کی جا سکتی ہیں اور اس کے علاوہ قدیم معقولات پر زیادہ زور دینے کے بہ جائے کچھ کتابیں نئے فلاسفہ اور جدید مغربی فکر کے حوالے سے شامل کرنا ضروری ہے ہیں۔ عربی اور اردو میں ایسی اچھی کتابیں موجود ہیں جن میں مغربی فکر کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کی کتابیں مستقبل کے مدارس کے اساتذہ کو پڑھانا ضروری ہیں تاکہ انھیں یہ احساس ہو سکے کہ وہ کس دنیا میں جی رہے ہیں اور امت مسلمہ آج کو کیا چیلنجز درپیش ہیں۔

پھر ہمیں امت کی عالمی سطح کی قیادت کی ذمے داری سنبھالنے، اداروں اور قانون کی تشکیلِ نو اور امت کے مستقبل کے لیے نئے نظام وضع کرنے کے لیے ایک اعلیٰ درجے کا اسلامی نصاب درکار ہو گا۔

میری ناچیز رائے میں یہ اسلامی تعلیم کی مستقبل کی ضرورت ہے۔ خوش قسمتی سے دنیا کے مختلف حصوں میں امت مسلمہ میں حال اور مستقبل کے حوالے سے ایک آگاہی اور شعور ابھر رہا ہے۔ روایتی علما، جدید تعلیم یافتہ شخصیات اور دونوں روایات کو جمع کرنے والے حضرات نے بڑی تعداد میں ادارے قائم کیے ہیں۔ میں بنگلہ دیش کے دو اداروں کی مثالیں دینا چاہوں گا۔ چٹاگانگ میں قائم بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی جس کا مقصد دینی تعلیم کو جدید علم کے ساتھ مربوط کرنا اور ایسے مسلمان محققین تیار کرنا ہے جو معتدل رجحان کے حامل ہوں اور دین کے گہرے علم کے ساتھ اعلیٰ عصری فہم رکھتے ہوں۔ دوسرا ادارہ دارالاحسان یونی ورسٹی ہے، جسے بیسویں صدی کے نام ور اسلامی فلسفی مرحوم پروفیسر سید علی اشرف نے قائم کیا تھا۔ وہ مسلم امت کی مستقبل کی

ضروریات کے حوالے سے بڑا شفاف موقف رکھتے تھے اور ان ہی کے افکار کی روشنی میں یہ یونی ورسٹی وجود پذیر ہوئی۔ ان دو اداروں کے علاوہ علما کے قائم کردہ نسبتاً چھوٹے ادارے بھی ہیں۔ مجھے بھی اس طرح کے ایک ادارے میں ایک بار جانے کا موقع ملا جہاں مدارس کے فضلا کو تین یا چار سال کے ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ ان کو تخصص کی سطح پر فقہ (جدید قانون کے تقابل کے ساتھ)، حدیث (جدید چیزوں کے ساتھ مربوط کرکے) وغیرہ علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ بات خود علما کی طرف سے اس بات کا اعتراف ہے کہ ایک مسلمان عالم کو جدید وسائل اور دسترس کے ساتھ مسلح ہونے کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی بھی اس کی ایک مثال ہے، جس میں ان ہی مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو چٹاگانگ اور ڈھاکہ کے مذکورہ بالا دو اداروں کے سامنے ہیں۔ ملیشیا، مصر اور دیگر کئی ممالک میں اس طرح کے ادارے وجود میں آرہے ہیں، لیکن وقت بہت کم ہے اور افسوس ہے کہ علما بہت سست روی کے ساتھ اس طرح کے امور کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔ انھیں اس کام کی شدید اہمیت اور امت کو درپیش چیلنج کا احساس کرنا چاہیے۔ اگر وہ نئے پیراڈائم میں اپنے آپ کو منتقل کرنے میں سستی کریں گے تو وقت کا چکر انھیں خود ہی دھکیل کر پیچھے ڈال دے گا۔

تغیرات اور چیلنج بہت بڑے ہیں۔ چیلنج اور خطرے کی سنگینی پر زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا کہ ہر کوئی اس سے آگاہ ہے۔ میں اپنی بات کا اختتام علما کو خطاب کرتے ہوئے، ایک فارسی شاعر کے شعر پر کروں گا (معذرت خواہ ہوں اگر آپ میں سے کوئی فارسی دان نہیں ہے)

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

شاعر اس کیفیت کو بیان کر رہا ہے جب کہ وہ محبوب کے قافلے کے ہم رکاب ہے۔ محبوب کی سواری لے جائی جا چکی ہے، ناقہ پیچھے ہے اور عاشق بے چارہ برہنہ پا ہے اور اسی کیفیت میں ناقے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اس صورت حال میں وہ کہتا ہے کہ

میرے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ گیا اور میں ایک لمحے کے لیے کانٹے نکالنے رکا کہ اسی اثنا میں کارواں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

لمحوں کی خطا کی تھی، برسوں کی سزا پائی

اس لیے اگر ہم نے اپنی ذمے داری سے ایک لمحے کے لیے بھی تغافل برتا تو پھر قافلہ ہم سے سو سال کی مسافت کی دوری پر چلا جائے گا۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دینی مدارس: مفروضے، حقائق، لائحہ عمل

راگست ۲۰۰۰ء کو انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد
کے زیر اہتمام منعقدہ ایک مذاکرے سے خطاب

مشمولہ: دینی مدارس میں تعلیم کیفیت، مسائل، امکانات

ترتیب: سلیم منصور خالد، ۲۰۰۵ء

دینی مدارس
مفروضے، حقائق، لائحہ عمل

برادران محترم!

دینی مدارس نے پچھلے دو سو سال سے خاص طور پر اور اس سے پہلے پوری اسلامی تاریخ میں عام طور پر ایک انتہائی فعال، تعمیری اور موثر کردار ادا کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ہاں دینی مدارس اور غیر دینی مدارس کی تفریق نہیں تھی۔ تقریباً بارہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں دنیائے اسلام اس تفریق سے نا آشنا ہی ہے۔ جس نظام تعلیم کی پیداوار مجدد الف ثانیؒ (م:۱۳ر نومبر ۱۶۲۴ء) تھے، جنہیں دنیائے اسلام نے دوسرے ہزاریے کا مجدد قرار دیا، جن کو علامہ اقبالؒ نے مسلم ہندوستان کا سب سے بڑا Religious Genius یعنی دینی نابغہ قرار دیا۔ اسی نظام تعلیم کی پیداوار اس دور کے دوسرے تمام اہل علم، ارباب سیاست و حکومت اور دیگر اصحاب ادب و دانش بھی تھے۔ حضرت مجددؒ صاحب اور سلطنت مغلیہ کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خان مرحوم دونوں ہم درس تھے۔ وہ ایک ہی درس گاہ میں اور ایک ہی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے تیار ہوئے تھے۔ تاج محل اور دوسری عظیم الشان عمارتیں بنانے والا ماہر تعمیرات بھی ان ہی درس گاہوں کا پڑھا ہوا تھا، جن درس گاہوں سے شاہ ولی اللہؒ کے والد شاہ عبد الرحیمؒ پڑھ کر تیار ہوئے تھے۔

اس لیے میں یہ بات بلا خوف تردید عرض کر سکتا ہوں کہ تعلیم کی وحدت، نظام تعلیم کی یک سانیت اور یک جہتی، ملت اسلامیہ کی یک سانیت، یک جہتی اور یک رنگی کے لیے ایک لازمی شرط ہے۔ ایسی ہر صورت حال جس سے مسلمان دو مختلف طبقوں یا ایک سے زائد طبقوں میں تقسیم ہو جائیں، وہ طبقے تعلیم کے نام پر قائم کیے جائیں، وہ طبقے کسی کی آمدنی کے نام پر قائم کیے جائیں یا رنگ اور نسل کی بنیاد پر قائم کیے جائیں، ان تمام طبقوں کی بنیاد پر الگ الگ تعلیمی، دینی اور مذہبی اداروں کا وجود اسلام کے مزاج کے خلاف اور غیر اسلامی ہے۔ اس لیے میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ ملک میں دینی تعلیم اور غیر دینی تعلیم کے جداگانہ اور بالکل الگ الگ ادارے جس انداز سے قائم ہیں، اس سے ملک و ملت کی وحدت اور یک جہتی متاثر ہو رہی ہے۔ اس سے روزانہ، آنے والا ہر لمحہ اور ہر صبح طلوع ہونے والا سورج ملک میں دوئی، ثنویت اور افتراق کے جراثیم لے کر آرہا ہے۔ اگر اجازت دی جائے تو سخت الفاظ استعمال کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دوئی سیکولرازم کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے۔ ہم نے بہ طور قوم اور ملک غالباً اس بات کو عملاً قبول کر لیا ہے، یا کم از کم ہم میں سے بہت لوگوں نے قبول کر لیا ہے کہ دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دین کے مقاصد کی خاطر فلاں اداروں میں لوگ تیار ہوں گے اور دنیا کے مقاصد کی خاطر فلاں اداروں میں تیار ہوں گے۔ میں انتہائی ادب سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دین و دنیا کی اسی ابتدائی فکری اور نظری تفریق کی بنیاد پر سیکولرازم کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

پچھلے چند مہینوں میں مجھے خاص طور پر ملک کے انتہائی جید اہل علم سے، بالخصوص بعض جید محترم علمائے کرام سے تبادلۂ خیال اور استفادے کا موقع ملا ہے۔ علمائے کرام کی قابل لحاظ تعداد اس ضرورت کو محسوس کرتی ہے کہ دینی مدارس کے نظام اور نصاب میں مثبت تبدیلی لائی جانی چاہیے، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ملک کی دینی قیادت میں بعض انتہائی قابل احترام بزرگ ابھی تک ایک مختلف تصور پر سختی کے ساتھ قائم ہیں۔ مجھے ان میں سے بعض کی خدمت میں نیاز

حاصل کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے، جنہوں نے ہر ایسے موضوع پر کسی قسم کی گفت گو کرنے، گفت گو میں حصہ لینے سے یا گفت گو میں شریک ہونے سے صاف صاف انکار فرمایا، جس کا مقصد یہ ہو کہ دینی مدارس کی پیداوار یا دینی مدارس کے طلبہ کا معاشرے میں مسجد کی خدمت کے علاوہ بھی کوئی اور رول یا کردار ہو سکتا ہے۔ ایک بزرگ نے واضح اور دو ٹوک الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ:

> ہم تو مسجد کے ٹکڑوں پر پلنے والے کچھ ملا ہی تیار کرنا چاہتے ہیں، اس کے علاوہ ہمارا کوئی مقصد نہیں۔ دینی مدارس اس وقت تک ہی قائم رہ سکتے ہیں، جب تک ان کو صرف میسیتے پیدا کرنے ہوں۔

یہ الفاظ خود انہوں نے اپنی زبان مبارک سے ادا فرمائے۔ یقیناً ایسے بزرگوں کی تعداد بہت کم ہے، لیکن ایسے حضرات ہمارے اکابر کی صفوں میں موجود ہیں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ شاید ان ہی اکابر کی شدتِ احساس کی وجہ سے یہ خیال پھیل گیا ہے کہ حکومت پاکستان دینی مدارس میں مداخلت کا کوئی ارادہ رکھتی ہے یا مداخلت کا کوئی منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے۔

آپ میں سے اکثر بزرگ اور احباب مجھ سے شخصاً بھی واقف ہیں اور شاید یہ حسن ظن بھی رکھتے ہیں کہ میں کوئی جھوٹا یا غیر ذمے دار آدمی نہیں ہوں اور نہ مجھے بد دیانت سمجھتے ہیں۔ اس حسن ظن کی بنا پر جو آپ حضرات کو میری نسبت حاصل ہے، میں واضح طور پر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کوئی پروگرام حکومت پاکستان کے پیش نظر نہیں ہے اور اگر خدانہ خواستہ ایسا کوئی پروگرام ہوا تو میں پہلا آدمی ہوں گا جو اس سے اظہار برأت کرے گا۔

دینی مدارس کو خیر کا موثر مرکز بنانے کے لیے میں نے حکومت پاکستان کے ذمے داران سے ان ہی میدانوں میں اور ان ہی خطوط پر بات کی ہے، جو آج انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے اس سیمینار میں آپ حضرات کے پیش نظر ہیں۔ آپ حضرات بھی سب ہی لوگ دین دار، دین سے محبت رکھنے والے اور مخلص خادمانِ دین ہیں۔ اس محفل میں کوئی مغرب زدہ یا مغرب سے مرعوب فرد بیٹھا ہوا نہیں ہے۔

بہ ہر حال حکومت کے ذمے داران کے ذہن میں اگر کچھ ہے تو وہی ہے جو ان ہی خطوط پر انہیں بتایا گیا ہے، جسے آپ اپنے مباحث میں اٹھا رہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ (صدر) جنرل پرویز مشرف صاحب کے ذہن میں کوئی تصور دینی مدارس کی آزادی اور خود مختاری کو مجروح کرنے کا نہیں ہے اور نہ وہ کوئی ایسا ایجنڈا ہی لے کر آئے ہیں۔ یہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کی بات ہے، جب میری ان سے اس موضوع پر گفت گو ہوئی تھی۔ تب میں نے واضح طور پر ان سے یہ بات کہی تھی کہ دینی مدارس کے نظام میں اگر کوئی ایسی کوشش کی گئی جس سے ان کی آزادی اور خود مختاری میں کوئی فرق پڑا تو نہ صرف یہ کہ ایسی کوئی کوشش قابل عمل نہیں ہو گی، بل کہ یہ ملک وملت کے دینی مستقبل کے لیے انتہائی نقصان دہ اور تباہ کن بھی ہو گی۔ میں نے جنرل مشرف سے کہا تھا کہ حکومت پاکستان نے فیلڈ مارشل ایوب خان مرحوم (۱۹۶۹ء۔۱۹۵۸ء) کے دور جاہ وجلال میں تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے اور ملک کی شاید دولاکھ مساجد میں صرف آٹھ سو مساجد کا انتظام وانصرام مشرقی اور مغربی پاکستان کے صوبائی اوقاف کے محکمے مشترکہ طور پر سنبھال سکے۔ آج مغربی پاکستان سے چاروں صوبوں کی ان مساجد یا ان میں سے چند مساجد سے ملحق مدارس کی کیفیت اور دوسرے غیر سرکاری مدارس کا انتظام دیکھ لیجیے تو معلوم ہو جائے گا کہ سرکاری انتظام میں اور بیوروکریسی کے ہاتھوں میں اگر دینی معاملات دے دیے جائیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ پھر میں نے وفاقی کابینہ اور نیشنل سیکیورٹی کونسل کے مشترکہ اجلاس میں تقریباً دو گھنٹے تک اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔

میں یہ چاہتا تھا کہ وہ حضرات جن کو دینی مدارس سے واقفیت نہیں ہے یا انہیں دینی مدارس کے پس منظر سے واقف ہونے کا موقع نہیں ملا اور اس اجتماع میں غالب اکثریت ایسے ہی حضرات کی تھی، ان کو تفصیل سے بتایا جائے کہ دینی مدارس کی تاریخ کیا رہی ہے اور کس انداز سے انہوں نے ملک وملت کی پوری تاریخ میں بالعموم اور انگریز کی دو سو سالہ تاریخ میں بالخصوص یہاں اسلامی تہذیب، اسلامی تمدن،

مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا تحفظ کیا۔ اس لیے دینی مدارس میں اگر کسی اصلاح یا بہتری کی کوئی خواہش یا کاوش ہو تو اس کی اولین شرط یہ ہے کہ دینی مدارس کی آزادی اور خود مختاری میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

دینی مدارس کا موجودہ نظام اور نصاب ملا نظام الدین سہالویؒ کا مرتب کیا ہوا ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر عرض کرتا ہوں۔ ابھی چند مہینے پہلے کی بات ہے کہ ایک محترم بزرگ سے بات ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ اس پر تو علمائے امت کا اجماع ہے کہ دینی تعلیم کے لیے واحد نظام درس نظامی ہے۔ میں نے پہلے تو سمجھا کہ شاید میں غلط سن رہا ہوں۔ اپنی غلط فہمی دور کرنے کے لیے دوبارہ عرض کیا کہ حضرت کیا فرمایا ہے؟ تو انہوں نے پھر یہی جملہ دہرایا۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ ان کے نزدیک اجماع کا مفہوم کیا ہے؟ بھلا دینی مدارس کے لیے درس نظامی کے اختیار کرنے یا نہ کرنے جیسے خالص انتظامی معاملے کا اجماع امت کی خالص فقہی اور اصولی اصطلاح سے کیا تعلق ہے؟ پھر انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ یہ تو امام غزالی کے دور سے مدرسہ نظامیہ کے وقت سے چلا آرہا ہے۔ حدِ ادب کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے میں نے احتراماً اس کی تردید نہیں کی، وضاحت بھی نہیں کی، لیکن اس سے آپ کو یہ ضرور اندازہ ہو جائے گا کہ کس طرح کے تاثرات اور کس طرح کے خیالات یا غلط فہمیاں بعض دینی حلقوں میں موجود ہیں۔

سوال یہ ہے کہ درس نظامی کا یہ نصاب ملا نظام الدین سہالوی مرحوم و مغفور نے کیوں اور کس مقصد کی خاطر مرتب کیا تھا؟ اس پر اگر ذہن صاف ہو اور تاریخی حقائق سامنے ہوں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ برصغیر میں سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں، جس کو اب برصغیر کی اسلامی تاریخ کا دور زوال اور دور انحطاط بھی کہہ سکتے ہیں، ریاستی نظام چلانے، اسلامی عدالتوں کو قاضی، مفتی اور مقنن فراہم کرنے کی خاطر یہ نصاب تیار کیا گیا تھا۔ یہ زمانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ابتدائی دور تھا۔ جب اٹھارویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ عالم سے دیوانی خرید لی تو کمپنی کے زیر انتظام صوبوں کے بارے میں یہ شرط رکھی گئی کہ وہاں کا نظام بہ دستور فقہ حنفی کے

مطابق چلتا رہے گا۔ اس نظام کے لیے کمپنی کے کارپردازوں نے بھی اپنے اہتمام میں درس نظامی کے کئی ادارے قائم کیے۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کے مکمل اور حتمی سقوط تک جاری رہا۔ بہر حال، اس کے بعد چوں کہ یہی نصاب موجود تھا اور اسی نصاب کے تیار کردہ علما دست یاب تھے، اس لیے جب دارالعلوم دیوبند اور دوسرے مدارس قائم ہوئے تو انہوں نے اسی نصاب کو قابل عمل پایا اور اس کو اختیار کر لیا، لیکن دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد خود اس نصاب میں پچھلے سو سال میں اب تک جتنی بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں، انہوں نے اس نصاب کو ''حقیقی درس نظامی'' نہیں رہنے دیا۔ آج کا رائج الوقت درس نظامی اصل درس نظامی سے بہت مختلف چیز بن چکا ہے، لیکن تاریخی تسلسل میں اگر اس کو درس نظامی کہا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔

دینی مدارس کا نظام، وہ درس نظامی ہو یا اس کی کوئی مزید بہتر شکل، اس کا بنیادی مقصد دینی علوم کے محققین، محدثین، مفسرین، فقہا، مبلغین اور مربی پیدا کرنا ہے۔ میرے یا حکومت کے ذمے داران میں سے کسی کے ذہن میں یہ مقصد نہیں ہے کہ دینی مدارس، مثلاً جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ سلفیہ فیصل آباد، جامعہ خیر المدارس ملتان، جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور، دارالعلوم غوثیہ محمدیہ بھیرہ، دارالعلوم کراچی، جامعۃ المنتظر لاہور یا مدرسہ تفہیم القرآن مردان وغیرہ، جیسے اداروں میں محدثین، مفسرین، متکلمین اور فقہائے اسلام کے بہ جائے کمپیوٹر کے ماہرین پیدا ہوں۔ یہ دینی تخصص کے ادارے ہیں اور ان ہی رجال کار کی تیاری کے ادارے رہیں گے۔ لیکن ہم سب لوگ فرداً فرداً یہ بات محسوس کرتے ہیں کہ دینی مدارس کے متخصصین، علما، فقہا، محدثین، مفسرین کو عصر حاضر میں اپنے تخصص کو عام لوگوں تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اس تخصص کے مطابق ملکی نظام کو ڈھالنے اور اس کے مطابق ملک کے مختلف اداروں کی تشکیل نو کے لیے بعض جزوی، معنوی تبدیلیوں یا جامع علوم اور مہارتوں کی ضرورت ہے، جس کے بغیر دور جدید میں دینی تعلیم کے تقاضوں پر کماحقہ عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا۔

اگر دینی قیادت پر فائز حضرات کا خدانہ خواستہ تصور سیکولر ہی ہے کہ مذہب، اہل مذہب کے لیے ہے اور دنیا، اہل دنیا کے لیے ہے، قیصر کو قیصر کی چیز دے دو اور پادری کو پادری کا علاقہ دے دو، تو پھر بے شک دین و دنیا کی تفریق کے اس ابلیسانہ تصور پر کاربند رہیے۔ اگر نعوذ باللہ، ان اداروں کے قیام سے یہی مقصد پیش نظر ہے، تو پھر یاد رکھیے کہ لادینیت کا یہ نظام اسی طرح چلتا رہے گا۔

یہاں یہ امر واضح کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ انگریزوں کے دور استعمار میں اس دوئی کو برداشت کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ انگریز یہ بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں تھا کہ ملک و ملت کا نظام، معاشیات یا بینکاری کا نظام دینی تعلیم سے جزوی طور پر بھی متاثر ہو سکتا ہے، لیکن پاکستان جس کی تاسیس ہی اس مقصد کے لیے ہوئی ہے کہ یہاں اسلام کے احکام پر مبنی ادارے قائم کیے جائیں گے اور ملک وملت کا نظام شریعت کی بنیاد پر استوار ہو گا، یہاں حالات کا وہ جبر نہیں ہے، جس کے تحت ۱۸۵۷ء کے بعد کے سالوں میں اکابر اسلام نے دوئی اور ثنویت پر مبنی اس صورت حال کو برداشت کیا تھا۔ آج اگر آزاد اسلامی جمہوریہ پاکستان میں دینی تعلیم کا مقصد پاکستان کی تمام دینی ضرورتوں کی تکمیل نہیں ہے تو میں اپنے دل کے زخموں سے مجبور ہو کر سخت الفاظ کہنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں۔ وہ یہ کہ پھر سوچا جانا چاہیے کہ کیا ایسی دینی تعلیم کی ضرورت بھی ہے کہ نہیں؟ اگر پاکستان کی موجودہ دینی تعلیم پاکستان کو، پاکستان کے مسلمانوں کو اور پاکستان کے اداروں کو اسلام کے مطابق نہیں ڈھالنا چاہتی اور ڈھالنے کے لیے رجال کار تیار کرنے کے لیے آمادہ نہیں تو پھر اس دینی تعلیم کی ضرورت پر از سر نو غور کر لینا چاہیے کہ اس کی ضرورت بھی ہے کہ نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ سب حضرات اس سے اتفاق کریں گے کہ ہمارے ہاں دینی تعلیم کے متخصصین، محدثین، مفسرین اور فقہا پیدا کرنے کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنایا جائے، پاکستان کے مسلمانوں کو ایک صحیح مسلمان بننے میں مدد دی جائے، امت مسلمہ کی تشکیل صرف ان خطوط پر ہو جو قرآن

وسنت میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر یہ مقصد ضروری ہے تو یہ جا طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بینکاری کے نظام کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کے لیے ہمیں ایسے ماہرین کی ضرورت نہیں ہے جو صحیح معنوں میں فقہی تخصص اور تعمق (depth) رکھتے ہوں اور جدید بینکاری کے نظام سے بھی ضرورت کی حد تک واقف ہوں؟ میں یہ نہیں کہتا اور کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ خدانہ خواستہ فقہ، حدیث کی تعلیم ختم کر کے ان کو بینکار اور اکانومسٹ بنا دیا جائے۔ بینکار اور اکانومسٹ الگ رہیں گے، البتہ ان کو بھی شریعت اور اسلام کا بنیادی فہم دینے کی ضرورت ہے، جیسا کہ ماضی میں اسلام کے متخصصین نے کیا۔

سچی بات یہ ہے کہ دور جدید ایک پیچیدہ دور ہے۔ اس دور کے ارادے، تصورات اور اس دور کے معاملات اتنے پیچیدہ ہیں کہ اس کے لیے بڑی خصوصی مہارتیں درکار ہیں۔ اس وقت پاکستان میں مثال کے طور پر ''بلاسود بینکاری'' کا ایک بڑا چیلنج درپیش ہے، لیکن پاکستان میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو شریعت کا بھی عمیق علم رکھتے ہوں اور جدید بینکاری کے تقاضوں کو بھی مکمل طور پر سمجھتے ہوں؟ اس طرح کہ دنیا بھر کی سطح پر بینک کاروں سے مقابلہ کر سکیں؟

دنیا بھر کے بینک، مسلمان بینکاروں کو چلنے نہیں دیتے۔ B.C.C.I کو چلانے والے کوئی مذہبی لوگ نہیں تھے اور نہ وہ مذہبی انداز میں چلا رہے تھے، لیکن چوں کہ بینک مسلمانوں کا تھا، دولت زیادہ تر مسلمانوں کی تھی اور اس کا فائدہ زیادہ تر کچھ مسلمانوں کو ہو رہا تھا، اس لیے اس کے ساتھ جو حشر ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔ اس طرح کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ جہاں اس چیلنج کا مقابلہ کرنا خاصی فنی مہارت کا تقاضا کرتا ہے۔ جہاں وہ فنی مہارتیں ہیں، وہاں بدقسمتی سے شریعت کا علم نہیں ہے اور جہاں شریعت کا علم ہے، وہاں جدید فنی مہارتیں نہیں ہیں۔ تو کیا یہ ہم پر فرض کفایہ نہیں ہے کہ ہم شریعت کے ایسے متعمق ماہرین پیدا کریں جو دینی ماحول، دینی تربیت اور دینی ذوق ومزاج کے ساتھ ساتھ دور جدید کے معیار کی فنی مہارت رکھتے ہوں؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک قول مجھے بہت یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ کسی ذمے داری پر تعین کے لیے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر رہے تھے۔ مجلس میں موجود بعض لوگوں نے ایک خاص شخص کا نام لیا کہ جی وہ بہت نیک آدمی ہیں، بڑے بزرگ اور تہجد گزار ہیں اور اخیر میں فرمایا کہ وہ اتنے نیک ہیں کہ:

کانہ لایعرف الشر

گویا وہ شر کو جانتے ہی نہیں۔

اس پر حضرت عمر فاروق نے فرمایا کہ ایسا آدمی نہیں چاہیے جو شر کو نہیں جانتا، اس لیے کہ

اذا یوشك ان یقع فیه

کہ جو شر کو نہیں جانتا، وہ شر میں جلدی مبتلا ہو جائے گا، وہ تو شر کا شکار ہو جائے گا۔ اس لیے ایسا آدمی درکار ہے جو خیر کو بھی جانتا ہو اور شر کو بھی جانتا ہو۔

امام احمد بن حنبلؒ سے زیادہ متبع سنت اور شریعت کا مزاج شناس ان کے دور میں کوئی نہیں گزرا۔ ان سے کسی نے مشورہ کیا کہ فلاں جگہ جہاد کا معاملہ درپیش ہے، مختلف علاقوں سے فوجیں اور رضاکاروں اور مجاہدین کے دستے جا رہے ہیں۔ ایک فوجی کمانڈر کی سربراہی میں ایک بڑا دستہ تیار ہو رہا ہے۔ وہ کمانڈر بڑا متقی اور پرہیز گار ہے، بڑا نمازی اور تہجد گزار ہے، لیکن سیاسی و عسکری معاملات میں وہ خاص ماہر نہیں ہے، البتہ ایک دوسرا شخص ہے جو زیادہ دین دار اور نیک تو نہیں ہے، لیکن اس کی عسکری مہارت بڑی مسلم ہے۔ تو فرمایے ہمیں کس کے ساتھ جانا چاہیے؟ (ہم تو اللہ کی رضا کے لیے جا رہے ہیں)۔ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا:

> جو شخص نیک و متقی ہے، لیکن عسکری مہارت میں کم درجہ رکھتا ہے، اس کی نیکی و تقوے کا فائدہ اس کی ذات کو ہوگا اور اس کی عسکری عدم مہارت کا نقصان پوری قوم اور اسلامی فوج کو ہوگا۔ جو شخص زیادہ نیک نہیں ہے، اس کی نیکی کی کمی کا جو نقصان ہے، وہ صرف اس کی ذات کو ہوگا، لیکن اس کی عسکری ''مہارت'' کا فائدہ پوری مسلمان امہ کو ہوگا۔

اس لیے ان فنی مہارتوں کی ہر دور کے لحاظ سے ضرورت اور اہمیت بدلتی رہتی ہے۔ ایک زمانہ تھا منجنیق کا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کو یمن بھیجا، تا کہ منجنیق بنانا سیکھ کر آئیں اور وہاں سے لے کر بھی آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کے معرکے میں وہ استعمال بھی فرمائیں۔ منجنیق کو آج کے ''ٹینک'' کا پیش رو (pioneer) کہہ سکتے ہیں۔ وہ ایک بہت بڑی گاڑی ہوا کرتی تھی، جو قلعوں کی دیوار وغیرہ توڑنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس پر چٹان یا بڑے پتھر رکھ دیے جاتے اور لکڑی کی بنی ہوئی پتوار قسم کی ایک چیز کھینچی جاتی تھی۔ اس پر ایک شدید ضرب کے نتیجے میں ایک اسپرنگ کے طاقت ور push کے ساتھ پتھر نکلتا اور قلعے کی دیوار پر لگتا تو قلعے کی دیوار ٹوٹ جاتی تھی۔ صحابہ کرامؓ نے یمن کے عیسائیوں سے اس کی تعلیم سیکھی اور پھر آ کر اس مہارت کو طائف کی فتح میں استعمال فرمایا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اور ابن تیمیہؒ نے السیاسۃ الشرعیۃ میں لکھا ہے کہ ایسی تمام مہارتوں و تخصصات کا حاصل کرنا مسلمانوں کے ذمے فرض کفایہ ہے، جن کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان، غیر مسلموں کے محتاج بن کر رہیں۔ مسلمانوں کو غیر مسلموں کی محتاجی سے بچانا اور ان کو اپنے تمام دینی و دنیوی معاملات میں خود کفیل بنانا، یہ مسلمانوں کے ذمے فرض کفایہ ہے۔

اس دور میں فقہ کی تعلیم سے دنیا کے بھی بڑے فائدے ملتے تھے۔ آدمی فقہ پڑھ کر قاضی بن جاتا تھا، مفتی بن جاتا، وزیر اور گورنر بن جاتا تھا۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ: طلبہ فقہ تو بہت پڑھتے ہیں، لیکن طب، ہندسہ کوئی نہیں پڑھتا۔ (اس زمانے میں الٹ تھا۔ آج لوگ میڈیکل اور انجینئرنگ تو پڑھتے ہیں، لیکن فقہ نہیں پڑھتے) امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں شکایت کی ہے اور اس بات کی تاکید کی ہے کہ لوگوں کو ان علوم (میڈیکل اور انجینئرنگ) کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے، اس لیے کہ یہ فرض کفایہ ہے اور ان کے نہ ہونے کی وجہ مسلمان، غیر مسلم طبیبوں، مہندسوں اور انجینئروں کا محتاج رہے گا اور اس احتیاج کو ختم کرنا مسلمانوں کے ذمے فرض کفایہ ہے۔

آج قیادت جس طبقے کے ہاتھ میں ہے، وہ طبقہ ایک خاص انداز کا تربیت یافتہ ہے۔ ۳۵-۱۸۳۴ء یعنی لارڈ میکالے کے زمانے سے آج تک چار پانچ نسلیں اس طبقے کے زیر اثر ایک خاص ماحول میں پرورش پا چکی ہیں۔ اس کے اپنے تعلیمی ادارے ہیں، جن کا اپنا مخصوص ماحول ہے۔ وہ طبقہ اپنے قرب و جوار میں سڑک بھی نہیں بننے دیتا، پرائمری اسکول بھی نہیں بننے دیتا، لیکن اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے اس نے خصوصی ادارے بنا رکھے ہیں۔ ان کے آپس کے سیاسی اور ہر طرح کے دوسرے اختلافات تو موجود ہیں، مگر اس کے باوجود جس تعلیمی ادارے میں ان کے بچے پڑھتے ہیں، وہاں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ وہ سب مل جل کر انہیں مضبوط، موثر اور ترقی یافتہ بنانے کے لیے پوری دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ گویا یہ مفادات کی جنگ ہے۔ اس کے بعد جب یہاں ان کی تعلیم مکمل ہو جاتی ہے تو اس کے بعد وہ اپنے بچوں کو انگلستان اور امریکا کے تعلیمی اداروں میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں سے اعلیٰ تربیت پا کے وہ یہاں آتے اور ہم پر حکومت کرتے ہیں۔ یہ پچھلے ڈیڑھ دو سو برس سے ہو رہا ہے۔

اب ایک صورت تو یہ ہے کہ جیسے یہ سلسلہ چل رہا ہے، اس کو آپ چلنے دیں۔ وہ طبقہ ہم پر حکومت کرتا رہے اور اسلامی تعلیم اور اسلامی ماحول کا یہ جزیرہ سمٹتا جائے اور سمٹتے سمٹتے نہ معلوم کہاں تک پہنچ جائے اور کتنا رہ جائے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ اس طبقے کے اسلحے سے اس کا مقابلہ کریں اور جس اسلحے سے کام لے کر وہ طبقہ اسلام کا راستہ دانستہ یا نادانستہ طور پر روک رہا ہے (اس طبقے میں اکثر لوگ نادانستہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں) اس طبقے کے ہتھیار لے کر اسلام کا دفاع کریں۔

آج سے تقریباً بارہ تیرہ سو سال پہلے جب یونانیوں کے علوم و فنون کی کتب کا ترجمہ عربی زبان میں شروع ہوا تو قریب قریب وہی صورت حال پیش آئی جس سے ہم آج دو چار ہیں۔ یونانی منطق، مسلمان علما و فضلا کی بنائی ہوئی نہیں تھی۔ ارسطو (م: ۳۲۲ق م) اور افلاطون (م: ۳۴۷ق م) کوئی متقی لوگ نہیں تھے، بل کہ بت پرست اور مشرک تھے، لیکن جب ان کا تیار کردہ علم منطق مسلمانوں میں رائج اور

مقبول ہونا شروع ہوا تو بعض اہل علم کی رائے تھی کہ اس کو نہیں سیکھنا چاہیے۔ اس زمانے کے فتاویٰ موجود ہیں کہ منطق اور یونانی علوم کا سیکھنا ناجائز اور حرام ہے، جیسے آج ہماری بعض محترم شخصیتوں کی رائے انگریزی زبان اور جدید مضامین کے بارے میں ہے۔ لیکن ایک دوسری انتہائی اہم اور حکیمانہ رائے یہ بھی تھی اور تاریخ نے ثابت کیا کہ یہ رائے زیادہ صائب اور درست تھی کہ یونانی علوم وفنون سیکھ کر ہی ہم اس کا جائزہ لے سکیں گے کہ ان میں کون سی چیز غلط ہے اور کیا چیز ہمارے لیے اسلامی نقطۂ نظر سے قابل قبول ہے؟ جو غلط ہے، دلائل سے اس کی تردید کر کے نظر انداز کر دیں اور جو لوگ اس کا شکار ہو رہے ہیں، ان کو بھی اس غلط عنصر کے منفی اثرات سے محفوظ کر لیں، لیکن ان علوم وفنون میں جتنا اور جو حصہ ہمارے نقطۂ نظر سے مفید ہے، اس سے استفادہ کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیے۔ وہ مسلمانوں کے لیے گم شدہ میراث کی حیثیت رکھتا ہے:

خذ ما صفا ودع ما كدر

جو صاف اور اچھا ہے، اسے لے لو اور جو گندہ، غلط اور مکدر ہے، اس کو نظر انداز اور مسترد کر دو۔

چناں چہ اس دوسرے گروہ کے اہل علم نے جو رائے اختیار کی تھی، تاریخ نے ثابت کیا کہ یہی رائے صائب تھی۔ مسلمانوں کے اجتماعی مزاج نے اس رائے کو اختیار کیا، یہاں تک کہ یہ کیفیت ہوئی کہ پھر وہ منطق اور فلسفہ جس سے شروع میں مسلمانوں کو خطرہ تھا کہ شاید مسلمانوں کے دین اور ایمان اس سے متاثر ہوں، اسی فلسفے اور منطق سے مسلمانوں نے اسلام کی خدمت کا کام لیا۔

امام غزالیؒ کی کتاب ''المستصفیٰ'' دیکھ لیجیے جو ''اصول فقہ'' کی کتاب ہے، لیکن ساری کی ساری منطقی اصولوں پر مبنی ہے۔ امام صاحب نے اصول فقہ کے احکام ومباحث کو خالص منطقی اصولوں پر مرتب کیا ہے۔ اگر کوئی منطق کی اصطلاحات نہ جانتا ہو، وہ یہ کتاب نہیں سمجھ سکتا۔ امام رازیؒ کی تفسیر کبیر تو ساری کی ساری منطق وفلسفے کی ہی اصطلاحات سے بھری ہوئی ہے۔ اصول فقہ کی ایک اور بہترین

کتاب جو اپنے تعمق و گہرائی میں کوئی ثانی نہیں رکھتی، وہ امام شاطبیؒ کی کتاب ''الموافقات'' ہے۔ ''الموافقات فی اصول الشریعہ'' چار جلدوں میں ہے۔ جتنے علوم وفنون امام شاطبیؒ کے زمانے میں موجود تھے اور اس وقت تک انسانیت نے جو کچھ بھی حاصل کیا تھا، اس سب کو انہوں نے شریعت کے احکام کی ابدیت اور معقولیت کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس سے اونچی کتاب آج تک قانون کی تاریخ اور روایت میں نہیں لکھی گئی۔ اگر آدمی منطق نہ جانتا ہو تو وہ اس کتاب سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' برصغیر کی بہترین مستند تصنیف ہے، برصغیر میں اس سے بہتر کتاب اسلام کے فلسفے پر لکھی ہی نہیں گئی، وہ بھی ساری کی ساری یونانی علوم وفلسفے کی اصطلاحات سے بھرپور ہے۔

اور بھی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ان مثالوں سے اندازہ ہو گا کہ وہ چیز جو پہلے ''خطرہ'' سمجھی گئی، وہ بعد میں ''خادم'' بن گئی۔ اسلام خادم بننے کے لیے نہیں آیا، مخدوم بننے کے لیے آیا ہے۔ جو چیز ''مخدوم'' بن کر اسلام کے کیمپ میں داخل ہوتی ہے، بالآخر اسے ''خادم'' بننا ہی پڑتا ہے۔ تاتاریوں کی مثال لے لیں۔ تاتاری، اسلام میں فاتح بن کر داخل ہوئے، لیکن بالآخر اسلام کے خادم بن گئے۔ وہ تاتاری جنہوں نے بغداد کو تباہ کیا تھا، جنہوں نے دریاؤں کے پانی کتابوں (کی سیاہی) سے سیاہ کر دیے تھے، انہوں نے ہی عالم اسلام کی سرحدوں کا سات سو سال تک دفاع کیا۔

آج انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم وفنون کے بارے میں ہم سے کچھ تاخیر ہو گئی ہے۔ اس تاخیر کی وجہ سے کچھ انگریزی خواں مسلمانوں میں مخدوم بننا چاہتے ہیں یا بنے ہوئے ہیں تو یہ ایک عارضی اور وقتی چیز ہے۔ ان شاءاللہ انگریزی زبان اور جدید کمپیوٹر، یہ سائنس اور یہ ٹیکنالوجی، سب کی سب اسلام کی خادم بنیں گی، مگر اس کے لیے عزم وارادے کی ضرورت ہے۔

اگر امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ کو اس کی ضرورت تھی کہ وہ اپنے دور کے معاشی طور طریقے سمجھیں اور اس کو دینی تقاضا سمجھ کر روزانہ بازار میں چند گھنٹے

گزاریں اور یہ دیکھیں کہ کاروبار کیسے ہوتا ہے تو کیا عہد حاضر کے متخصصین اور فقہا اور امام محمدؒ کے متبعین اور تلامذہ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ آج کل کے بازاروں کے اس کردار اور کاروباری امور سے واقف ہوں کہ ان بازاروں میں کیا ہو رہا ہے؟ اس کے لیے معاشیات کی تعلیم اور جدید بینکاری کے اصولوں کی تعلیم ضروری ہے۔ یہ سب فنون بدقسمتی سے انگریزی میں ہیں، اس لیے انگریزی سیکھنا ضروری ہے۔ اگر امام غزالیؒ اپنے دور میں منطق کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

من لم یعرف المنطق فلا ثقة له فی العلوم اصلا

جس آدمی نے منطق نہیں سیکھی، اس کا علم میں کوئی مقام اور وزن نہیں ۔

اس لیے کہ اس دور میں اہمیت منطق کی تھی۔ اسی طرح آج کے دور میں اگر کچھ دوسرے علوم وفنون، انگریزی زبان، معاشیات، ریاضی، کمپیوٹر کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے تو علمائے کرام کو آگے بڑھ کر امام غزالیؒ کی طرح اس کا ادراک کرنا چاہیے۔

جہاں تک حکومت پاکستان کا تعلق ہے تو دینی مدارس کے بارے میں اس وقت تک ہم نے جو چیز طے کی ہے، وہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کیے بغیر ان کی انتظامی ومالی خود مختاری کو یقینی بنایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ خود علمائے کرام کے تعاون سے ایسے تعلیمی کورسز شروع کرائے جائیں کہ جس میں تخصص کے معیارات کو بہتر بناتے ہوئے اس میں مزید گہرائی پیدا کی جائے اور کوشش کی جائے کہ خود علمائے کرام بعض بنیادی علوم وفنون تک رسائی ضرور حاصل کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ علمائے کرام بہ قدرِ ضرورت انگریزی جانتے ہوں اور کمپیوٹر سے کچھ نہ کچھ واقف ہوں۔ علمائے کرام بہ قدرِ ضرورت جدید معاشیات سے، بینکاری کے نظام سے، بین الاقوامی لین دین اور تجارت سے واقف ہوں۔ بلاسود بینکاری کا نظام قائم کرنے کے لیے یہ سب چیزیں جاننا ضروری ہے۔ اس کے بغیر کم از کم پاکستان کے حالات میں ایک قدم بھی پیش رفت نہیں ہو سکتی۔

ہمارے علمائے کرام بعض اوقات افغانستان میں طالبان کی حکومت کی مثال

دیتے ہیں کہ وہ انگریزی اور جدید علوم میں تخصص کے بغیر کام یاب حکومت چلا رہے ہیں۔ طالبان کے جذبے کا اعتراف اور ان کے قائدین کا احترام کرنے میں، میں دوسروں سے پیچھے نہیں ہوں، لیکن ایک ملک کے حالات اور دوسرے ملک کے حالات میں فرق ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس طرح دنیا سے کٹ کر زیادہ دیر تک رہنا ممکن نہیں ہے۔ جس کمی کو آج اعزاز قرار دیا جارہا ہے، آنے والے کل کو اس کمی کو دور کرنے کا شدت سے احساس ہو گا۔ کم از کم پاکستان کے موجودہ حالات میں انگریزی زبان سے بہ قدرِ ضرورت واقفیت کے بغیر اور معاشیات، سیاسیات، اقتصادیات، ریاضی، جنرل سائنس کی تھوڑی سی واقفیت کی عدم موجودگی میں یہاں کے نظام کو اسلامی خطوط پر استوار کرنا بڑا دشوار ہی نہیں، بل کہ ناممکن ہے۔ غور فرمائیں تو جلد یا بہ دیر آپ اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

میں یہاں ان چند رجال کار اور خادمان دین کی فرداً فرداً مثالیں نہیں دوں گا، جن کے کام سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دینی تخصص اور دینی علوم میں مہارت کی جامعیت کتنی ضروری اور اہم چیز ہے۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایسے اہل علم جو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی رکھتے ہیں، ان کی بات کا غیر معمولی اثر ہوتا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ ملکی نظام ہی نہیں، بل کہ اس نظام ریاست کو چلانے والوں کی ذہنیت پر ان انتہائی محترم شخصیتوں کے، جو خالص دینی علوم میں تخصص رکھتے ہیں اور جو دور جدید کے محاورے میں یا دور جدید کے اسلوب میں اپنی بات کو بیان نہیں فرما سکتے، ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ اس صورت حال پر یہ کہنا کہ ہمیں کوئی ضرورت نہیں سمجھانے کی، جس کو سمجھنا ہو، خود ہمارے پاس آئے اور ہمارا محاورہ اور اسلوب سیکھ کر آئے، میری ناچیز رائے میں ایک نہایت خطرناک اور انتہائی غلط رویہ ہے۔ اسلام کسی فرد یا کسی مخصوص طبقے کی اجارہ داری میں مقید نہیں ہے۔ یہ تمام نسلوں، زمانوں اور قوموں کے لیے ہے، اس لیے اس کے پھیلاؤ کی راہ میں جو بھی، جس انداز سے بھی رکاوٹ ہو گا یا رکاوٹ بننے کی کوشش کرے گا، اسے اپنا انجام، یوم آخرت کو پیش نظر رکھ کر سوچ لینا چاہیے۔

میں خود دینی مدارس کی پیداوار ہوں اور دینی مدارس سے ربط وضبط کا چالیس سالہ تجربہ رکھتا ہوں۔ الحمدللہ میرے خاندان میں کم از کم ایک درجن بزرگ ایسے رہے ہوں گے، جنہوں نے دینی مدارس قائم فرمائے یا دینی مدارس میں اعلیٰ ترین سطح پر انہوں نے تعلیم دی۔ اس لیے خوش قسمتی سے ان مدارس سے میں جتنا واقف ہوں، وہ آپ حضرات گرامی کی واقفیت سے کچھ کم نہیں ہے۔ یہی تعلق، واسطہ اور پیش آمدہ چیلنج کی شدت مجھے غیر روایتی اسلوب سخن اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

میرا تاثر یہ ہے کہ دینی مدارس کے موجودہ نظام اور موجودہ نصاب میں اوقات ہی کا ضیاع نہیں ہو رہا ہے، بل کہ وسائل کا بھی ضیاع ہو رہا ہے۔ ہم آٹھ دس سال ایک طالب علم کو دینی مدارس میں پڑھاتے ہیں۔ ہم اس کو سلم اور سلم کی شروح تک منطق پڑھا رہے ہیں۔ ملا جلال، ملا مبین اور جتنی شروح منطق پر لکھی گئیں، وہ اکثر طلبہ پڑھتے ہیں، خاص طور پر صوبہ سرحد میں۔ اسی طرح منطق اور فلسفے سے متعلق بہت سے ایسے مضامین ہم اس کو پڑھا رہے ہیں، جو شاید کسی زمانے میں ہمارے ریاستی، اجتماعی اور سماجی نظام میں اہمیت رکھتے ہوں، لیکن آج اگر کسی دینی درس گاہ سے ایک سال میں سو طالب علم فارغ ہو رہے ہوں تو ان سو میں نوے طلبہ وہ ہیں، جو کسی مسجد کی امامت اختیار کرتے ہیں یا موذن بنتے ہیں۔ خود ایک بزرگ نے مجھ سے فرمایا تھا (جیسا کہ میں نے عرض کیا) کہ: ''مدارس کا مقصد صرف میسے پیدا کرنا ہے۔ میں ادب سے پوچھتا ہوں کہ کیا کسی میسے کو مسجد کی خدمت، امامت یا موذنی میں کبھی ''سلم'' کے مباحث کام آتے ہیں؟ ان کو پوری زندگی میں سلم اور سلم کے مسائل، معاملات پر غور کرنے کی نہ ضرورت پڑتی ہے اور نہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک آدمی بھی سوال کرتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جو سوالات روزانہ ایک امام مسجد سے کیے جاتے ہیں، ان سوالات کا جواب اس کے پاس نہیں ہوتا۔ اس سے پوچھا جاتا ہے کہ جب سود ختم ہو جائے گا تو پھر نظام کیسے چلے گا، کیوں کہ پاکستان کی سپریم کورٹ نے بھی فیصلہ دے دیا ہے؟ ڈیفنس سیونگ کا کیا ہوگا؟ این آئی ٹی یونٹ میں جو فلاں تبدیلی لائی گئی ہے، اس کے نتیجے میں یہ جائز ہیں

کہ ناجائز؟ جسمانی اعضا کی تبدیلی اور پیوند کاری حرام ہے یا حلال؟

روزمرہ کے ان مسائل کے بارے میں دینی مدرسے کے طالب علم کی کوئی تیاری نہیں ہوتی اور جو مسائل کبھی پیش نہیں آنے والے، ان پر ہم اس کے آٹھ سال ضائع کروادیتے ہیں۔ بزرگان محترم! میں ''ضائع'' کالفظ بڑی ذمے داری سے استعمال کررہا ہوں۔ جو اساتذہ ملا جلال اور ملا مبین کے از کاررفتہ اور فضول مباحث کی تدریس میں مصروف ہیں یا تحریر سنبث اور سوال کابلی اور سوال باسولی کے اعتراضات اور ان کے جوابات طلبہ کو رٹواتے ہیں، وہ سوچیں کہ کس مسجد اور کس خطبے میں ان امور کی ضرورت پیش آتی ہے؟ یہاں کے اساتذہ اس کام کی جو تن خواہیں وصول کررہے ہیں اور وہ تن خواہیں عامۃ الناس کے چندے سے آرہی ہیں، جو اللہ کی طرف سے ایک امانت ہے کہ یہ دین کی خدمت کے لیے ہے، آپ خود دیکھ لیجیے کہ کیا دین کی خدمت یہ ہے کہ طالب علم کے پانچ سال منطق کے ان از کاررفتہ اور غیر متعلقہ مسائل کو یاد کرنے کے لیے صرف کروائے جائیں؟ میری حقیر رائے میں ایسی تعلیم اسلام کا مقصد نہیں ہے، لیکن اسے یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں ان علوم کی افادیت کا قائل نہیں ہوں۔ میں ان علوم کی افادیت کا پورے طور پر قائل ہوں، لیکن ان حضرات کے لیے جن کو محقق بننا ہے، جن کو مصنف بننا ہے، جن کو اعلیٰ سطح کا مدرس بننا ہے۔

میری ناچیز رائے میں دینی مدارس کے نظام میں اس طرح تبدیلی کی ضرورت ہے کہ ابتدائی تین یا چار سال ضروری دینی علوم، عربی زبان، صرف، نحو اور بہ قدرِ ضرورت منطق پڑھائی جائے۔ منطق کی ایک یا دو کتابیں، جن سے منطق کا اسلوب طالب علم کے سامنے آجائے اور وہ قدیم کتابیں سمجھنے کے قابل ہو جائے۔ اسلامی نظام پر بہ حیثیت مجموعی نظر، دورِ جدید کے بعض مذاہب اور نظریات وغیرہ اس کو پڑھائیں۔ چار سال کے بعد ہم اس کو گریجویٹ سطح پر لے آئیں۔ اس کے بعد پھر جو طلبہ محقق بننا چاہتے ہوں، اسلامی علوم وفنون میں ایک تعمق حاصل کرنا چاہتے ہوں، ان کو منطق، فلسفے اور اصول فقہ کی اعلیٰ ترین کتابیں اور جو مزید ان کو پڑھانا چاہیں،

ان کو پڑھائیں۔ ایسے طالب علم پر وسائل خرچ کرنا پڑیں گے، اس پر صلاحیت بھی صرف کرنا ہو گی اور وقت بھی صرف کرنا ہو گا۔

اس وقت ہوتا یہ ہے کہ ایک طالب علم جسے کسی چیز کی بالکل کچھ سمجھ نہیں آتی، وہ اور ذہین ترین طالب علم دونوں ایک سطح پر اکٹھے رہتے ہیں۔ ذہین طالب علم اس کے ساتھ بندھا رہتا ہے، وہ آگے نہیں بڑھ پاتا، اور جو کند ذہن طالب علم ہوتا ہے، وہ کسی طرح سے آگے نہیں بڑھتا۔ یوں دونوں کی صلاحیت اور وقت ضائع ہوتا ہے۔ اگر یہ طے کر لیا جائے کہ جو طالب علم معمولی صلاحیت رکھتا ہے، اس کو اچھی تجوید اور قرآن پاک سکھادیں، حفظ کروادیں، کچھ بنیادی نوعیت کے مسائل یاد کروادیں اور اس کو صرف موذنی اور تجوید و تدریس قرآن کے لیے تیار کر لیں۔ جو طلبہ ذرا ذہین ہوں، ان کو مسجد کی امامت اور خطابت کے لیے تیار کریں۔ ایک امام مسجد کو جن فقہی مسائل سے سابقہ پیش آئے گا، ایک مسجد کے خطیب کو تقریر کرنے کے لیے جو مسائل جاننے چاہییں، وہ چار پانچ سال میں پڑھادیں۔ اس کے بعد اس سے کہیں کہ اب جا کر امامت کرو۔ اتنی دینی تعلیم کے بعد یہ لوگ اس قابل ہو جائیں گے کہ جا کر مسجدیں سنبھالیں۔ مطلب یہ کہ ان لوگوں کو مسلمانوں کی دینی زندگی کے لیے واقعی تیار کیا گیا ہو۔ اس کے بعد جو لوگ دینی مدارس میں مدرس بننا چاہیں، مختلف علوم و فنون میں محقق بننا چاہیں، ان سے یہ طے کر لیں کہ وہ کن علوم و فنون میں، کن میدانوں میں استاد بننا چاہتے ہیں۔

بہت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ دینی مدارس میں تخصص کا تصور خال خال ہے۔ ایک استاد جو میرے ساتھ ہی ایک مدرسے میں پڑھ کر فارغ ہوئے تھے، مدرسے کی تعلیم میں ان کی پوزیشن اول آئی تھی اور میری دوسری۔ مدرسے کے مہتمم صاحب نے انہیں فارغ ہوتے ہی ازراہ کرم مدرس مقرر کر لیا تھا۔ وہ دن میں سولہ سبق پڑھایا کرتے تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ان کو ۳۵ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ تنخواہ تو ان کا اور مہتمم صاحب کا ذاتی معاملہ تھا، لیکن کوئی استاد کتنا بھی اچھا فاضل کیوں نہ ہو، وہ جب دن میں سولہ سبق پڑھائے گا تو کسی ایک کتاب یا کسی ایک

کورس کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکے گا۔ اس میں تخصص پیدا نہیں ہو سکتا۔

آج ہمیں دینی تعلیم کی ان تینوں سطحوں اور ضرورتوں کو سامنے رکھ کر نئے نصابات کی تدوین کی ضرورت ہے۔ آج دینی علوم کے اعلیٰ محققین کی تیاری کے لیے ہمیں تخصص (Specialization) کی ضرورت ہے۔ اگر ہم یہ طے کریں کہ جن کو مدرس بننا ہے، ان کی مہارت و دلچسپی اگر علوم نقلیہ میں ہے تو وہ علوم نقلیہ، تفسیر، حدیث، فقہ، ادب وغیرہ میں تخصص کر لیں۔ علم حدیث، علم تفسیر وغیرہ کے ساتھ ساتھ بقیہ علوم بھی ان کو پڑھائیں اور ان میں بھی ضروری مہارت پیدا کریں۔ اس کے لیے موجودہ سند عالیہ اور شہادت عالمیہ کے لیے تین چار میدان متعین کیے جاسکتے ہیں۔ جو طلبہ مناظرے یا تبلیغ اسلام میں دوسرے مذاہب پر تحقیق کا میدان منتخب کرنا چاہتے ہیں، ان کو تقابل ادیان اور متعلقہ چیزیں پڑھادیں۔ جو طلبہ دور جدید میں اسلام کے معاملات میں تخصص حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو اقتصادیات، معاشیات زیادہ بہتر انداز میں پڑھادیں۔ مسلمان فقہانے علم الاموال کے میدان میں، کتاب الاموال اور کتاب الخراج میں، اور اس طرح کی کتابوں میں جو لکھا ہے، اس سے طالب علم کو واقفیت ہو جائے اور معاملات کی فقہ گہرائی کے ساتھ اس کو پڑھادی جائے۔ اس طرح سے اگر ہم چند متخصصین پیدا کر لیں تو کم وسائل سے زیادہ بہتر انداز میں افراد کار تیار کر سکیں گے۔

آپ حضرات کو مجھ سے بہتر علم ہے کہ یورپ، امریکا، آسٹریلیا، جنوبی افریقا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ وغیرہ میں ایسے ہزاروں اہل علم کی ضرورت ہے جو وہاں کے مسلمانوں کی دینی راہ نمائی کر سکیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ صحیح ٹھوس علم جانتے ہیں، وہ انگریزی زبان نہیں جانتے اور دور جدید کے محاورے سے واقف نہیں ہیں۔ وہ وہاں کے لوگوں کی زبان میں بات نہیں کر سکتے۔ جو لوگ وہاں کے لوگوں کی زبان اور محاورے میں بات کر سکتے ہیں، وہ یا تو دین کو بالکل نہیں جانتے یا ان کا علم دین بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ وہ سرسری انداز سے اردو کی چند کتابیں پڑھ کر، ادھر ادھر سے سنی سنائی باتوں کو جا کر بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو یہ

پتا نہیں ہوتا کہ مقامی رواج کیا ہے؟ دین کی صحیح تعلیم کیا ہے؟ نصوص کیا ہیں؟ اجتہادات کیا ہیں؟

علم دین کے ایسے کچے اور خود ساختہ فاضلین نے جو ملغوبہ اپنے ہاں دیکھا یا سنا ہوتا ہے، اس میں دینی اور اسلامی اقدار کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات، علاقائی رواجات، مقامی رسوم اور ملکی طور طریقے سب شامل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دین کے مزاج سے عدم واقفیت کے باعث ان سب چیزوں کو دین اسلام سمجھتے اور دین اسلام ہی کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ وہاں جا کر اگر اس سے مختلف کوئی چیز ان کے سامنے آجائے تو وہ جھگڑا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ نے بھی دیکھا ہو گا، میں نے بھی لندن میں دیکھا ہے کہ یہ پاکستانیوں کی مسجد ہے، یہ بنگالیوں کی مسجد ہے، یہ ترکوں کی مسجد ہے، وہاں پر حنفی، مالکی، شافعی ہر طرح کے اور ہر طرف سے آئے ہوئے مسلمان ہیں۔ وہاں پر ایک فقہی Cosmopolitanism (ہر دیسیت) پیدا ہو رہا ہے۔ وہاں امام صاحب پاکستان کے، مثلاً گوجر خان یا چکوال سے آئے ہیں۔ ان کو یہ نہیں پتا کہ شریعت کے نصوص کیا ہیں۔ وہاں پر وہ خاص چکوال کے اپنے مقامی رسم ورواج یا محلے کے رسم ورواج کو دین کے نام پر زبردستی لوگوں پر ٹھونس رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں تفریق پیدا ہو رہی ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے فی الحال بہتر یہی سمجھا ہے کہ مسجد یں الگ الگ کر دی جائیں۔ کیا اسلام کا یہی منشا ہے کہ جہاں مسلمان جائیں، وہاں بکھر کر رہ جائیں؟ کیا صحابہ کرامؓ، تابعینؒ جہاں گئے تھے، انہوں نے یہی طے کیا تھا کہ یہ بنو ہاشم کی مسجد ہے، یہ خزرج کی ہے اور یہ اوس کی ہے؟ وہاں تو اس طرح کی کوئی چیز نہیں تھی۔

ہماری اس کمزوری کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم طالب علم کو اس اہم اور بھاری ذمے داری کے لیے تیار ہی نہیں کر رہے کہ وہ ایسے غیر مسلم اور ناملائم ماحول میں حکمت کے ساتھ دین کی تعلیم کو پیش کر سکے۔ ہمارا طالب علم صرف جامی کی شرحیں، سوال کابلی، سوال باسولی رٹتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ رٹوا کر دس سال بعد آپ اس کو امریکا بھیج دیتے ہیں کہ جاؤ، امریکا میں یا کینیڈا کی مسجد میں امامت کرو۔

یہ نہ طالب علم سوچتا ہے اور نہ استاد کہ وہاں پر سوال کابلی یا سوال باسولی کی پچاس برس تک بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

سوچنے کا مقام ہے کہ جن اساتذہ نے اس طالب علم کو یہ سب کچھ پڑھایا، جن افراد نے عام لوگوں کے حلال پیسے سے جمع ہونے والے پاکیزہ چندے کو اس پر خرچ کیا، کیا یہ دیانت داری کی بات ہے کہ اس پیسے کو ملا حسن اور ملا جلال کی دقیانوسی بحثوں کے پڑھنے پڑھانے پر خرچ کیا جائے؟ کیا ہم دیانت داری اور اللہ کے دین کے لیے خالص نصیحت کے جذبے سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان وسائل کا یہ صحیح استعمال تھا؟ بڑے ادب سے میں اپنی عاجزانہ رائے دوں گا کہ میرے محسنو! میرے بزرگو! اور میرے دینی رہ نماؤ! یہ ان وسائل کا صحیح استعمال نہیں تھا۔ خدا کے لیے آپ انہیں وہ چیزیں پڑھائیں، جن کی آگے چل کر دین کے ان قائدین کو ضرورت پیش آئے گی اور جس کی امت مسلمہ نہ جانے کب سے منتظر ہے۔

ان ہی خطوط کی بنیاد پر ہم نے ایک نصاب تیار کیا ہے۔ ہم نے درس نظامی میں کوئی تبدیلی نہیں کی، بل کہ یہ کوشش کی ہے کہ اس کی موجودہ درجہ بندی کو تھوڑا سا مزید بہتر بنا کر تین سے چار تخصصات کا اس میں اضافہ کریں۔ پیش نظر یہ ہے کہ جو موجودہ وفاقوں کا ایک مشترکہ بورڈ حکومت پاکستان قانون کے ذریعے قائم کر دے، اس میں ان وفاقوں کے علما اور نمائندے شامل ہوں۔ ان میں تین چار اساتذہ یونی ورسٹیوں کے لے لیے جائیں۔ اس قانون میں اس بورڈ کے تحت ایک اکیڈمک کونسل کی تجویز بھی ہے۔ اس اکیڈمک کونسل میں بھی ماہرین تعلیم اور علوم اسلامیہ کے نمائندے ہوں گے۔ اس اکیڈمک کونسل کے اختیار میں ہوگا کہ وہ نصاب میں جو تبدیلی تجویز کرنا چاہے، تبدیلی کرے، جس طرح یونی ورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ جو اختیارات یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے ہیں، وہ اختیارات اس بورڈ یا کمیشن کے ہوں گے۔ مدارس حسب سابق داخلی، انتظامی، مالی معاملات میں مکمل خود مختار ہوں گے۔

جو مدارس چاہیں گے، وہ اس کمیشن سے الحاق رکھیں گے اور جو نہیں چاہیں

گے، وہ نہیں رکھیں گے۔ یہ مجوزہ بورڈ یا کمیشن جسے ماہرین تعلیم اور علمائے کرام مل جل کر چلائیں گے، وہ میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے کے امتحانات لے گا اور امتحانات کے بعد وہ سندیں جاری کرے گا۔ وہ سندیں اسی طرح سے تسلیم شدہ ہوں گی، جیسے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کی تسلیم شدہ ہوتی ہیں۔ تقریباً اس طرح کا خاکہ پیش نظر ہے۔ اس کو حتمی شکل دینے کے بعد نیشنل سیکیورٹی کونسل میں پیش کریں گے۔ اب اگر سارے دینی مدارس طے کریں کہ ہم اس سے الحاق نہیں کریں گے تو وہ کمیشن تو ختم نہیں ہو گا، لیکن اس کا دائرۂ اثر بہت محدود ہو جائے گا۔ لیکن صورت واقعہ یہ ہے کہ سینکڑوں اصحاب علم اور علمائے مدارس نے اور مدارس کے ذمے داروں نے ذاتی طور پر مجھے ٹیلی فون، ملاقاتوں اور خطوط کے ذریعے اس بات کی نہ صرف یقین دہانی کرائی ہے، بل کہ وقتاً فوقتاً مطالبہ کیا ہے اور یہ دباؤ ڈالا ہے کہ اس کام کو جلد سے جلد کریں اور ہمیں اس سے وابستہ کریں''۔ اس لیے مدارس میں اگر ہزاروں نہیں تو سیکڑوں ایسے ضرور ہوں گے جو اس بورڈ سے الحاق و وابستگی اختیار کرنا پسند کریں گے۔

اس کے ساتھ میں نے حکومت پاکستان سے یہ بھی کہا ہے اور انہوں نے اس سے اتفاق کیا ہے کہ وہ پاکستان کے مختلف شہروں میں ایسے اعلیٰ معیار کے ماڈل دارالعلوم بنائیں گے کہ جہاں موجودہ درس نظامی کے بعد تخصص کی اعلیٰ تعلیم ہو، فقہ، حدیث، تفسیر اور جو مختلف اسلامی علوم وفنون ہیں، ان میں تخصص ہو۔ تخصص کا یہ دو سے تین سالہ نصاب ہو گا۔ اس کی حیثیت ایم فل یا ایم اے کے برابر ہو گی۔ اس میں متعلقہ موضوع کے بارے میں جدید علوم بھی پڑھائے جائیں گے۔ وہ پڑھانے کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ زیادہ بہتر اساتذہ تیار ہوں گے۔ اساتذہ جو وہاں سے پڑھ کر نکلیں گے، وہ یونی ورسٹیوں کے لیے بھی تیار ہوں گے اور مدارس کے لیے بھی فراہم ہوں گے۔ بیرون ممالک، اندرون ملک جو اس طرح کے معاملات ہیں، جہاں شریعت کی راہ نمائی درکار ہے، وہ ماہرین اس کام کے لیے دست یاب ہوں گے۔ ظاہر ہے حکومت اپنے اہتمام میں اگر ایسے خود مختار ادارے قائم کرے تو اس پر موجودہ دینی

مدارس کے منتظمین کو غالباً کوئی اعتراض نہیں ہو گا اور نہ اعتراض ہونا چاہیے۔

ان کی حیثیت وہی ہو گی جو ماضی میں جامعہ عباسیہ بہاولپور کی یا اب بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد کی ہے۔ ابھی مجھ سے پہلے ایک بزرگ نے فرمایا کہ یہ کام یاب نہیں ہوں گے۔ ان کا حشر وہی ہو گا جو جامعہ عباسیہ کا ہوا۔ ایک اور بزرگ نے فرمایا: جی نوٹ کر لیجیے، اس کا حشر وہی گا جو بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد کا ہوا۔ میں نے دل میں کہا: کاش اس کا وہی ''حشر'' ہو جو بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی کا ہوا۔ میرے خیال میں تو بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد کا تجربہ انتہائی کام یاب ہے۔ میں اس تجربے کو ناکام قرار دینے کی کوئی بنیاد نہیں پاتا، بل کہ اس کو بڑا کام یاب سمجھتا ہوں۔ اگر دینی مدارس کے فارغ التحصیل لوگ علمی اور فکری سطح پر اس درجے پر آجائیں جو بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی کے تمام تو نہیں، البتہ بہت سے فارغ التحصیل حضرات میں پائی جاتی ہے تو یہ ایک بہت بڑی کام یابی ہو گی۔

ان ہی الفاظ کے ساتھ میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں کہ مجھے گفت گو کا موقع عنایت فرمایا۔ پروفیسر خورشید احمد صاحب جیسے دل درد مند رکھنے والے، دین اسلام کے عظیم مجاہد کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے عزت افزائی فرمائی۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قدیم و جدید تعلیم میں ہم آہنگی

۱۹۹۰ء میں جمعیت طلبہ عربیہ کے ایک اجتماع سے خطاب

ماہنامہ دعوۃ: مارچ۔اپریل ۲۰۰۴ء

قدیم و جدید تعلیم میں ہم آہنگی

جب ہم قدیم وجدید نظام تعلیم کی ہم آہنگی کی بات کرتے ہیں تو بنیادی طور پر ہمارے پیش نظر ان دو نظام ہائے تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور ان دونوں سے فارغ التحصیل ہونے والے اہل علم اور اہل فکر کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے، جو آج دینی مدارس اور جدید تعلیم گاہوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

قدیم اسلامی نظام تعلیم برصغیر سے باہر دنیائے اسلام میں بارہ سو سال کے طویل عرصے تک کن خطوط پر کام کرتا رہا ہے؟ کن مقاصد کے تحت کام کرتا رہا ہے؟ اور کس طرح کے افراد تیار کرنا اس نظام تعلیم کے پیش نظر تھا؟ یہ سب سوالات انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ دراصل ان سوالات کے صحیح اور حقیقت پسندانہ جوابات پر ہی ہماری تعلیمی فکر درست سمت میں سفر کر سکتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ موضوع ایک طویل گفت گو کا متقاضی ہے۔ چوں کہ ہمیں گفت گو پاکستان یا موجودہ حالات کے تناظر میں کرنی ہے کہ پاکستان کے موجودہ حالات میں ہمیں قدیم نظام تعلیم یا زیادہ بہتر الفاظ میں قدیم روایت تعلیم اور جدید تعلیم میں ہم آہنگی کیسے پیدا کرنی چاہیے، اور جدید اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے اہل علم اور علمائے کرام کے مابین ایک فعال، مثبت اور بامعنیٰ تفاہم کیسے پیدا کیا جائے، اس لیے ہمیں برصغیر میں تعلیم کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنی چاہیے۔

ان تمام سوالات کے جواب کے لیے ہمیں پہلے اپنی دینی روایت کو مختصر طور پر

دیکھنا چاہیے کہ آج ہمارے پاس جو پرانی تعلیمی روایت موجود ہے، دینی مدارس کی شکل میں، اہل علم کی شکل میں، دینی قائدین کی شکل میں، علمائے کرام کی شکل میں، وہ بنیادی طور پر کیا ہے؟ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر اس روایت نے ہماری تاریخ میں نہایت نمایاں اور فعال کردار ادا کیا ہے؟ وہ کیا حالات تھے جن میں اس روایت نے گزشتہ دو سو سال کے عرصے میں غیر ملکی استعمار سے نجات دلانے میں برصغیر کے مسلمانوں کی قیادت کی تھی؟ وہ کیا قوت تھی جس سے کام لے کر اس روایت نے دور قدیم سے دور جدید میں منتقلی (Transition) کے اس عمل کو آسان بنایا اور منتقلی کے اس نہایت مشکل دور میں امت مسلمہ کو اس خطرے سے بڑی حد تک محفوظ رکھا؟ یہ بات میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ منتقلی کے دور کے جو دوسرے خطرات ہیں، جن سے دنیائے اسلام کے متعدد ممالک کو سابقہ پیش آیا، جس کی مثالیں مصر میں، شام میں، الجزائر میں، تیونس میں پیش آئیں، اس طرح کے آنے والے ان تمام نتائج اور خطرات سے برصغیر کے مسلمانوں کو اس قدیم روایت نے احسن طور پر محفوظ رکھا۔

اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے مصر، الجزائر، شام، عراق، تیونس، اور عرب دنیا کے دوسرے کئی ممالک میں تعلیم کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو ایک بات واضح طور پر آپ کے سامنے آئے گی، کہ اس ٹرانزیشن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال نے وہاں اسلامی نظام تعلیم بل کہ اسلامی علوم وفنون اور مسلمانوں کی قدیم تعلیمی روایت کو اس طرح کم زور بل کہ گم کر دیا کہ اگر آج آپ مائیکروسکوپ کو لے کر اس کے بقایا جات واثرات معلوم کرنا چاہیں تو ان کو تلاش کرنا بڑا مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً الجزائر میں فرانسیسی استعمار سے پہلے وہاں جو بھی نظام تعلیم موجود تھا، جو روایات بھی موجود تھیں، فرانسیسی استعمار کے آنے کے بعد وہ روایات اتنی تیزی سے ختم ہو گئیں کہ فرانسیسی استعمار کے جانے کے بعد جب الجزائر آزاد ہوا تو وہاں ایسے اہل علم انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے جو عربی زبان میں اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتے ہوں اور عربی زبان میں اظہار خیال کر سکتے ہوں۔ دو سو سال کے اس طویل عرصے میں فرانسیسی استعمار نے موثر نظام تعلیم کے ذریعے سے نہ صرف عربی زبان، بل کہ مسلمانوں کی پوری تعلیمی روایت اور

اسلامی علوم وفنون اور مسلمانوں کی تمدن و ثقافت کے اثرات سے ان ممالک کے تعلیمی نظام کو بالکل صاف کر دیا اور جب الجزائر آزاد ہوا تو آزاد الجزائر کی وارث ایک ایسی الجیرین قوم قرار پائی جو فرانسیسی زبان بولتی تھی اور فرانسیسی زبان میں سوچتی تھی، اس لیے کہ عربی زبان مٹائی جاچکی تھی اور صحیح عربی لکھنے اور بولنے والے قریب قریب ناپید ہو چکے تھے۔ اب وہاں کے پڑھے لکھے لوگ فرانسیسی زبان ہی کے تربیت یافتہ اور فرانسیسی نظام ہی کے تحت تعلیم یافتہ تھے۔ اب ان کا طرز فکر فرانسیسی، ان کا اسلوب بیان فرانسیسی اور نظام سراسر فرانسیسی بن چکا تھا۔ اس ایک روایت کے علاوہ وہاں کوئی اور روایت اب موجود نہیں رہی تھی۔ یہی صورت حال تیونس وغیرہ کی بھی رہی۔

اس کے برعکس آپ برصغیر کی مثال لیں کہ برصغیر کے اہل علم، علمائے کرام اور دینی مدارس نے قدیم تعلیمی روایت کے بہت سے پہلوؤں کو تحفظ فراہم کیا اور ان کو باقی رکھا۔ اس باب میں ان کی لازوال اور عظیم الشان خدمات ہیں، جن سے انکار ممکن نہیں۔ ان حضرات نے تمام تر مصائب اور مشکلات کے باوجود اس روایت کو قائم رکھا۔ اسلامی علوم وفنون کی جس حد تک ممکن تھا، حفاظت کی۔ مسلمانوں کی تعلیمی روایت کے تسلسل کو باقی رکھا۔ اس کے بعد جب اقتدار کی منتقلی کا آخری مرحلہ شروع ہوا، جب استعمار یہاں سے گیا اور مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار آیا تو اس منتقلی کے وہ خطرناک اور منفی نتائج یہاں پیدا نہیں ہوئے، جو کئی دوسرے مسلم ممالک میں پیدا ہوئے۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ذرا شروع سے جائزہ لے کر یہ دیکھیں کہ یہ روایت جس نے دینی مدارس کو جنم دیا اور وہ دینی مدارس جو آج کل ہمارے سامنے موجود ہیں، وہ کس روایت کے نتیجے میں یہاں تک پہنچے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ برصغیر میں ۹۲ ہجری میں اسلام آیا اور برصغیر کے شمال مغربی یعنی موجودہ پاکستان کے بڑے حصے پر، بل کہ کہنا چاہیے کہ موجودہ پاکستان کے دو تہائی علاقے پر بہ راہِ راست اس دور میں اسلامی حکومت قائم ہوئی، جب معدودے چند صحابہ کرام ؓ بہ قیدِ حیات تھے، جن میں چند نفوس قدسیہ نے برصغیر کو بھی اپنے وجود سے منور فرمایا اور بلوچستان اور جنوبی

خراسان وغیرہ کے اس حصے میں آ کر آباد ہوئے جو آج پاکستان کا حصہ ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر کا سب سے پہلا تعلیمی رشتہ جب اسلامی روایت سے استوار ہوا تو یہ راہِ راست صحابہ کرام وران کی تربیت یافتہ نسل کے زمانے میں قائم ہوا۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک برصغیر میں مسلمان آتے رہے اور وقتاً فوقتاً مختلف علاقے اسلامی سلطنت کا حصہ بنتے رہے، لیکن ایک بات نہایت عجیب ہے کہ وہ علاقہ جو صحابہ کرامؓ کے زمانے میں فتح ہوا تھا (اور صحابہ کرام کا بابرکت دور محدثین کے مطابق سن ۱۱۰ھ تک ہے) وہ آج بھی پاکستان میں شامل ہے۔

۹۲ھ میں پاکستان کا علاقہ فتح ہوا۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ علاقہ صحابۂ کرامؓ کے زمانے کا مفتوحہ علاقہ ہے اور آج تک پاکستان کا جز ہے اور مسلمانوں کے اقتدار میں ہے، لیکن جو علاقے صحابۂ کرامؓ کے دور کے بعد اسلامی سلطنت کے اجزا بنے، وہ ایک ایک کر کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں۔ برصغیر میں بھی ہمیں یہ نقشہ نظر آتا ہے اور برصغیر کے باہر بھی اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ یہی وہ دور ہے، جس زمانے میں ایک ایسے نظام تعلیم کی بنیاد رکھی گئی کہ جس نے بارہ سو برس تک برصغیر میں مسلم کمیونٹی کو تحفظ اور تسلسل عطا کیا۔ یہ مسلم کمیونٹی جو عددی اعتبار سے اقلیت میں تھی، جو عسکری اعتبار سے دوسری غیر اسلامی قوتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کم زور تھی، جو تہذیب و تمدن کے اعتبار سے یہاں کی قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، لیکن صرف اور صرف تعلیم اور تربیت کے اس نظام نے جو ۹۲ھ کے آغاز میں مسلمانوں نے قائم کیا تھا، مسلمانوں کو بارہ سو برس تک باقی رکھا۔

تاریخ اسلام کے اس طویل بارہ سو سالہ دور میں مسلم آبادیاں یہاں نہ صرف پھیلتی رہیں، بل کہ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں نے وہ کامیابیاں حاصل کیں جو تاریخ میں کسی جگہ پر نہیں ملتیں۔ برصغیر میں بیش تر علاقوں میں دس بارہ فیصد کی تعداد رکھنے والی ایک اقلیتی قوم نے ایک ہزار برس تک ایسے ملک پر حکومت کی جہاں کی نوے فیصد کے قریب آبادی کا مذہب، ان کی زبان، ان کا عقیدہ، ان کی تہذیب و تمدن، ان کا لباس، حتیٰ کہ روزمرہ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات بھی مسلمانوں سے مختلف تھیں۔ یہ

صرف اور صرف نظام تعلیم کی بنیاد پر ہو سکا۔

برصغیر میں سب سے پہلا تعلیمی ادارہ جو مسلمانوں نے قائم کیا، اس کی اولین بنیاد اور پہلی درسی کتاب قرآن مجید تھی۔ چناں چہ صدر اسلام کے مورخین نے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم کے مشورے سے مقامی مسلمانوں کے مطالبے پر ایک مسلمان بزرگ مولانا اسلامی نے قرآن مجید کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا۔ چناں چہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ قدیم ترین ترجمہ قرآن کریم نہیں ہے تو کم از کم چند قدیم ترین تراجم قرآن میں سے ایک ضرور ہے، جس کی سعادت موجودہ پاکستان کے ایک باشندے کو حاصل ہوئی۔ یہ وہ تعلیمی روایت تھی جس کا بہ راہِ راست رشتہ عرب اور عربی النسل اہل علم سے قائم ہوا، جس کی وجہ سے یہاں کی فکر میں، برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی فکر میں، اصالت عربیہ اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی کہ جس کو بعد کی تاریخ متاثر نہیں کر سکی۔

دو سو سال کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا تعلیمی اور فکری رشتہ عرب اور عراق اور عربی بولنے والے اہل علم سے کٹ کر افغانستان، ایران اور سینٹرل ایشیا کے ممالک سے قائم ہو جاتا ہے۔ اسلامی فکر، اسلامی فلسفہ اور تعلیمی نظریات بہ راہِ راست عرب سے عربی بولنے والے اہل علم کے بہ جائے ایک دوسرے واسطے سے، ایک بڑی طویل زمانی و مکانی مسافت طے کر کے یہاں پہنچے۔ اس کے کئی دوسرے نتائج بھی ہوئے۔ اس کے نتیجے میں بعض ایسے افکار بھی یہاں پیدا ہوئے جو خالص اسلامی افکار نہیں تھے۔ اس کے نتیجے میں اسلامی افکار پر تھوڑی سی گرد بھی پڑی، تھوڑی سی منفی پرچھائیں بھی پڑیں، لیکن اصالت عربیہ اور اصالت اسلامیہ جو پہلی دو تین صدیوں میں یہاں قائم ہو گئی تھی، وہ اتنی مضبوط اور اتنی گہرائی کے ساتھ جاگزیں تھی کہ یہ بالواسطہ کوشش اس پر زیادہ اثرانداز نہیں ہو سکی۔

اس کے بعد ایک طویل مسافت کے بعد میں اورنگ زیب کے دور تک آتا ہوں۔ یہ وہ دور ہے کہ جب برصغیر میں مسلمانوں کا زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور اورنگ زیب کی شخصیت نے اپنے کردار کی قوت سے، اپنے عزم، ذہانت اور قربانیوں سے اس زوال کو طویل عرصے تک روکے رکھا۔ زوال مسلمانوں کا مقدر ہو چکا تھا، لیکن یہ

اور نگ زیب ہی تھا جس نے کسی حد تک اس زوال کو روکنے کی کوشش کی اور اس کی سرعت کو سست رفتاری میں تبدیل کیا۔ اور نگ زیب عالم گیر کے بعد جب مسلمانوں میں ہمہ گیر انتشار کا دور شروع ہوا (تعلیمی انتشار بھی، تمدنی انتشار بھی) تو اللہ تعالی نے اپنی مہربانی سے ایک ایسی عظیم الشان شخصیت کو توفیق عطا فرمائی، جس کے دل میں اللہ تعالی نے غالباً یہ ڈالا کہ مسلمانوں کو تعلیمی اعتبار سے بلند کرنے کے لیے اور مسلمانوں کی تعلیمی اور فکری یک جہتی بر قرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی پوری تعلیمی روایت کو از سرِ نو مجتمع اور منظم کر کے محفوظ کر لیا جائے۔

یہ زمانہ کسی بھرپور یا ہمہ گیر تعلیمی اصلاح کا نہیں تھا۔ یہ زمانہ کسی تبدیلی و اصلاحی تعلیمی سر گرمی کے فوری آغاز کا نہیں تھا۔ یہ طویل المیعاد منصوبہ اپنے زمانے میں شاہ ولی اللہ نے شروع کیا۔ اس کے اثرات ایک طویل عرصے کے بعد سامنے آنے والے تھے۔ اس منصوبے کی کام یابی کے لیے ضروری تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسا قلیل المیعاد منصوبہ بھی شروع کیا جائے، جس کا مقصد یہ ہو کہ مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور کے علوم و فنون کو از سرِ نو مدون کر کے ایک نیا نصاب تعلیم وضع کیا جائے اور اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ جو علوم اب تیار ہوں، وہ سارے کے سارے اس تعلیمی ورثے کے حامل بن جائیں، جو بر صغیر میں مختلف ذرائع سے آیا ہے، جس میں عرب سے آنے والا ورثہ بھی شامل ہے، جس میں علوم حدیث اور علوم نبوت کا ورثہ بھی شامل ہے، جس میں ایران سے آنے والی عقلیات کا ورثہ بھی شامل ہے اور سینٹرل ایشیا اور افغانستان سے آنے والی روایت بھی۔ ان ساری چیزوں کو مولانا نظام الدینؒ نے ایک ایسے جامع نصاب کی شکل میں تشکیل دیا کہ جو دو سو، سوا دو سو برس سے اس پورے خطے میں مقبول ہے۔ دوسرے متعدد عوامل کے ساتھ ساتھ اس نظام نے دو سو برس تک مسلمانوں کو اس خطرے سے بڑی کام یابی سے دور رکھا، جس کی مثالیں میں ابھی الجزائر اور تیونس کے ضمن میں پیش کر چکا ہوں۔

مولانا نظام الدین سہالویؒ نے ایک نظام تعلیم وضع کیا جو ان کے نام کی نسبت سے درس نظامی کہلاتا ہے۔ بعض حضرات کو یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے جو بڑی تاریخی غلط

فہمی بھی ہے اور بڑی مضحکہ خیز بھی کہ درس نظامی کا تعلق بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں رائج نظام تعلیم سے تھا۔ یہ ایک واضح غلطی اور بدیہی طور پر غلط خیال ہے۔ نہ درس نظامی میں شامل کتابوں میں سے اکثر کتابیں اس وقت لکھی گئی تھیں جب مدرسہ نظامیہ موجود تھا اور نہ مدرسہ نظامیہ کے وقت درس و تدریس کا یہ انداز تھا۔ یہ نصاب ملا نظام الدین سہالویؒ کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ چوں کہ انہوں نے اس کو سب سے پہلے شروع کیا تھا، اس لیے یہ بعد میں درس نظامی کہلایا۔ ان کے زمانے میں اس کو درس نظامی نہیں کہا جاتا تھا۔ ملا نظام الدین سہالویؒ نے جو نصاب مرتب کیا، وہ کسی حد تک اور بہت کچھ تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی ہمارے مدارس میں مروج ہے۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ماضی قریب میں برصغیر کے جتنے دینی قائدین اور اہل علم پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے ۹۵ فیصد کا تعلق اسی نظام تعلیم سے رہا ہے۔ اس کی کچھ خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے نظاموں سے منفرد بناتی ہیں، جو حالات کی پیداوار ہیں اور جن سے غالباً ان حالات میں اور اس ماحول میں بچا نہیں جاسکتا تھا اور نہ صرفِ نظر کیا جاسکتا تھا۔

اس میں سب سے نمایاں چیز اس کی جامعیت ہے۔ یہاں ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ درس نظامی دینی تعلیم میں مہارت اور اختصاص حاصل کرنے کا کوئی نظام تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ درس نظامی محض دینی تعلیم کا نظام نہیں تھا اور نہ اس کا مقصد علوم دینیہ کے محققین پیدا کرنا تھا، نہ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ معاشرے میں دینی راہ نمائی کے لیے قائدین پیدا کیے جائیں۔ یہ تو اس زمانے کے حساب سے ایک ماڈرن اور اپ ٹوڈیٹ نظام کا خاکہ تھا، جو اس زمانے کے ایک صاحب علم نے وضع کیا تھا۔ چوں کہ اورنگ زیب کے جانے کے بعد بھی برصغیر میں سو، سوا سو برس تک مسلمانوں کی حکومتِ قائم رہی، نظام تعلیم بھی بڑی حد تک اسلامی خطوط پر قائم تھا اور قانون، تمدن، معاشرت، معاشیات، سیاسیات، سارے کے سارے معاملات اسلامی خطوط ہی پر استوار تھے، اس لیے بنیادی طور پر یہ چیز لازمی تھی کہ اس نظام میں اسلامی علوم کو اساسی اہمیت حاصل ہو۔ اس لیے ملا نظام الدین

نے اس زمانے میں جتنے مروج علوم تھے، جن کا اندازہ ۵۶ کے قریب لگایا جاتا ہے، ان سب کو یک جا کر کے ایک ایسے آٹھ سالہ نظام تعلیم کا خاکہ پیش کیا، جس کو آج کل گریجویشن کی ڈگری کے برابر قرار دے سکتے ہیں، اور انہوں نے یہ کوشش کی کہ اس نظام سے ایک مرتبہ تعلیم حاصل کرنے اور اس نصاب میں تعلیم پانے کے بعد اگر کوئی شخص کسی خاص میدان میں ترقی کرنا چاہے تو اس کے سامنے راستہ کھلا ہو۔ مزید تخصص کے لیے بھی راستہ ہو اور علمی اعتبار سے بھی وہ اس کے لیے تیار ہو۔ منطق، فلسفہ، ریاضی، طب، فن تعمیر، جیومیٹری، علم ہندسہ (یہ سارے کے سارے علوم) عربی ادب، فارسی ادب، یہ سب اسلامی علوم کی تحصیل کے لیے، اس کے ساتھ ساتھ عربی زبان، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، علوم تصوف جیسے خالص دینی علوم، یہ ساری کی ساری چیزیں اس میں شامل تھیں۔ اگر آپ اس اصل نصاب کو دیکھیں جو ملا نظام الدین نے تیار کیا تھا تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں تقریباً ۵۶ علوم کی چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں شامل تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ طالب علم کو رائج الوقت علوم وفنون سے کچھ نہ کچھ شناسائی ضرور ہو جائے۔ یہ وسعت اور جامعیت غالباً دنیا کے کسی اور مذہب یا روایت میں نہیں ہے کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں یہ سب تکمیل ہو جائے۔

اگر دس بارہ سال کی عمر کا طالب علم اس میں داخل ہو تو وہ بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس کی مثالیں بھی ہیں کہ چودہ، پندرہ یا سولہ سال کی عمر میں طلبہ فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔ خود شاہ ولی اللہ چودہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے، ملا نظام الدین سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے، مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ چودہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے اور صاحب تصنیف بھی ہوئے۔ ان کے بارے میں یہ لطیفہ مشہور ہے کہ ان کی ایک فقہی تحریر یا تصنیف دیکھ کر افغانستان سے ایک بزرگ ان سے ملنے اور کسی مسئلے میں تبادلۂ خیال کے لیے حاضر ہوئے اور لکھنو پہنچ کر پوچھا کہ مولانا عبدالحی کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ اپنے ہم عمر دوستوں کے ہم راہ چیل کے انڈے ڈھونڈنے گئے ہیں۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ چند لڑکے ہیں جو چیل کے انڈے پکڑنے کے لیے درختوں پر چڑھے ہوئے

ہیں۔ پوچھا کہ مولانا عبدالحی کون سے ہیں؟ ایک لڑکے نے درخت پر بیٹھے ایک دوسرے لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ مولانا عبدالحی ہے۔اس کو یقین نہیں آیا، لیکن اس نے مسئلہ پوچھا۔ مولانا نے اپنا شغل بھی جاری رکھا اور اسے تفصیل کے ساتھ مسئلے کے بارے میں بھی بتایا، نیز نشان دہی کی کہ فلاں فلاں کتاب میں دیکھیں، فلاں کی دلیل یہ ہے، فلاں کی دلیل یہ ہے۔ پھر ان دلائل کا محاکمہ کیا اور اس پوری گفت گو کے دوران اپنا شغل بھی جاری رکھا۔

اس نظام میں اس طرح کی مثالیں آپ کو بہت ملیں گی۔ ۵۶ علوم اور تقریباً ۱۲۰ بنیادی کتابیں اور متون اس نصاب میں شامل ہیں۔ ان کی بنیاد پر ملا نظام الدینؒ نے اس نظام کو وضع کیا۔ کتابوں کے انتخاب میں ایک بات انہوں نے خاص طور پر پیش نظر رکھی۔ وہ یہ کہ ہر فن کی انتہائی مشکل اور انتہائی دقیق، حتیٰ کہ چیستان قسم کی کتاب انہوں نے اس نصاب میں رکھی۔ آج یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ فقہ کی فلاں کتاب بہت مشکل ہے اور طلبہ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس مشکل پسندی سے ملا نظام الدین کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو اتنی مشق کرائی جائے کہ جب وہ نصاب پڑھ کر فارغ ہوں تو مشکل سے مشکل اور ادق سے ادق کتاب سے استفادہ کرنا ان کے لیے مشکل نہ ہو۔ چناں چہ وہ اس مقصد میں کام یاب بھی ہوئے۔ ہمارے سامنے اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، لیکن میں اس کی تفصیلات میں نہیں جاتا۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمانوں کے اقتدار کا سارا سلسلہ ختم ہو گیا اور جو تھوڑا بہت بھرم موجود تھا، وہ بھی جاتا رہا تو اب یہ مشکل پیش آئی کہ نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیا کیا جائے؟ اس سلسلے میں پیش قدمی کی سعادت مولانا قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقا کو حاصل ہوئی جو دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں۔ باقی دینی مدارس اسی دارالعلوم دیوبند کا ایک عکس اور اسی کی معنوی اولاد ہیں۔

مولانا محمد قاسمؒ خود درس نظامی کے سند یافتہ اور تربیت یافتہ تھے۔ ان کے استاد مولانا مملوک علی نے درس نظامی ہی کی تعلیم پائی تھی۔ وہ دہلی کے مشہور دہلی کالج میں، جہاں مرزا غالب فارسی کے پروفیسر کے لیے انٹرویو دینے گئے تھے، عربی کے استاد تھے۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ فکری طور پر آدمی جس روایت کا تربیت یافتہ ہوتا ہے، اسی روایت کو اختیار کرنے اور آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اسی روایت کو دارالعلوم میں اختیار کیا، لیکن اب حالات بدل چکے تھے، زمانہ بدل چکا تھا۔ محسوس ہوا کہ خالص درس نظامی کو جوں کا توں اپنانا ٹھیک نہیں، اس لیے اس میں تبدیلیاں لانے کا عمل شروع ہوا اور سب سے پہلے تبدیلی خود مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے کی اور یوں یہ تبدیل شدہ درس نظامی دارالعلوم دیوبند میں اختیار کیا گیا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ درس نظامی کا مقصد ایک ایسا گریجویٹ پیدا کرنا تھا جو زمانے کے مروج علوم میں ضروری مہارت سے لیس ہو، اس لیے انہوں نے بہت سے علوم کی مشکل کتابیں اس میں رکھ دی تھیں۔ اس ضمن میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے یہ طے کیا کہ یونانی منطق اور فلسفہ نہیں پڑھایا جائے گا، بل کہ تفسیر اور حدیث پر زیادہ زور دیا جائے گا۔ یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے۔ وہ یہ کہ چوں کہ درس نظامی بنیادی طور پر گریجویشن کی تعلیم تھی، تخصص کی تعلیم نہیں تھی، اس لیے اس میں تفسیر اور حدیث کو بہ طور تخصص کے نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ اس میں صرف ایک یا دو تفسیر کی کتابیں اس نقطۂ نظر سے شامل کی گئی تھیں کہ طالب علم تفسیری لٹریچر کے مطالعے کے قابل بن جائے۔ خود قرآن مجید کا اختصاصی مطالعہ، تفسیر کا اختصاصی مطالعہ اور علوم قرآن سے ماہرانہ واقفیت اس درس کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔

تبدیلی کے ضمن میں اس نصاب میں منطق اور فلسفے کا تناسب کم کرکے تفسیر اور حدیث کے حصے میں اضافہ کیا گیا، گویا کہ قرآن مجید اور حدیث کے تخصص اور درس نظامی، ان دوتوں کو ملا کر ایک نیا نظام اختیار کیا گیا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ کوئی دینی اختصاص کا نظام نہیں تھا، بل کہ اس زمانے کا ایک عام دنیوی، بل کہ یہ کہنا چاہیے کہ ایک ماڈرن نظام تھا جو ان حالات میں دیوبند کے بانیان نے اختیار کیا۔

اس کے بعد حالات میں جب تیزی سے تبدیلی پیدا ہوئی تو دارالعلوم دیوبند کے قیام کے ۲۵، ۳۰ سال بعد بعض اہل علم کو یہ محسوس ہوا کہ جن ضروریات کے لیے دارالعلوم

کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، وہ پوری نہیں ہو رہی ہیں، اس لیے کہ وہاں سے جو ماہرین شریعت یا متخصصین فارغ التحصیل ہو کر نکل رہے ہیں، وہ ایک ایسی قدیم روایت کے نمائندہ ہیں، جو دور جدید کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے پا رہی۔ دور جدید میں جس انداز سے اسلام پر اعتراضات ہو رہے ہیں، سائنس، فلسفۂ مغرب، جدید نظریات و تصورات، معاشیات، سیاسیات کے میدانوں سے اسلام پر حملے ہو رہے ہیں، ان چیزوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نہ تو طلبہ کو عقلی و فکری طور پر ان کے جوابات دینے کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور نہ ان کے لیے ایسا کرنا ممکن ہے۔ ان کی تربیت ان اعتراضات کا جواب دینے کے لیے تو درست اور کافی تھی جو قدیم یونانی فلسفے کے انداز پر کیے جاتے تھے یا جو قدیم منطقیوں کی طرف سے کیے گئے، لیکن اکثر و بیشتر میدانوں میں ان کی تربیت دور جدید کی کسی عقلی و فکری ضرورت کے اعتبار سے نہیں ہوئی تھی۔

اس مقصد کے لیے ایک نئے ادارے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ نیا ادارہ ندوۃ العلماء کے نام سے قائم کیا گیا، جس میں ادب اور تاریخ پر زیادہ زور دیا گیا۔ انگریزی زبان اور چند جدید علوم بھی بہ قدرِ ضرورت شامل کیے گئے۔ لیکن چوں کہ (یہاں میں ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ بات کہہ رہا ہوں، کسی ادارے یا شخصیت پر تنقید کرنا مقصود نہیں ہے) ندوۃ العلماء کا قیام دار العلوم دیوبند کے تجربے کے رد عمل کے طور پر ہوا تھا، اس لیے ندوۃ العلماء کے نصاب میں درس نظامی کی جو شدت پسندی، دقت پسندی اور مشکل پسندی تھی، وہ بالکلیہ ختم کر دی گئی اور ان تمام مضامین کو ممکنہ حد تک آسان بنا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں سے فارغ ہونے والے حضرات جید صحافی، جید ادیب، اچھے شاعر اور اچھے مصنف تو ہوئے، لیکن کوئی ایسا ٹھوس عالم اور مفکر چند ایک کو چھوڑ کر (مثلاً مولانا شبلیؒ، جن کی تعلیم ندوہ میں نہیں ہوئی تھی یا علامہ سید سلیمان ندویؒ، جن کی اصل تعلیم تو ندوہ سے باہر ہوئی تھی، تکمیل وہاں ضرور ہوئی تھی) خود ندوہ نے ایسا کوئی ٹھوس عالم پیدا نہیں کیا، جو قدیم اسلامی علوم میں عمیق اور ماہرانہ نظر رکھتا ہو، قرآن و حدیث یا فقہ میں تخصص رکھتا ہو اور دور جدید کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہو۔ ندوہ کے رد عمل میں کئی اور ادارے اور پھر بعد میں علی گڑھ کے رد عمل میں جامعہ

ملیہ کا قیام عمل میں آیا جو سیاسیات اور کانگریس کی نذر ہو گیا۔

اس کے بعد جب پاکستان بنا تو یہاں ۱۹۴۷ء میں کوئی ایسی دینی تعلیمی درس گاہ موجود نہیں تھی کہ جس کی قدیم روایات بھی ہوں، جس میں اسلامی علوم میں تخصص کا خاطر خواہ انتظام بھی موجود ہو، جس کا رشتہ مسلمانوں کی قدیم تعلیمی روایات سے بھی ملتا ہو اور دور جدید کے تقاضوں پر پوری اترتی ہو۔ ہمارے پاس چند جدید ادارے اور جامعات تھیں، پنجاب یونی ورسٹی اور دوسرے چند ادارے کام کر رہے تھے، لیکن وہاں عربی ادب اور عربی زبان کے قدیم مخطوطات پر تحقیق کا انتظام تو موجود تھا، لیکن خود اسلامی علوم، تفسیر، حدیث اور فقہ پر ماہرانہ بصیرت پیدا کرنے کا کوئی انتظام موجود نہ تھا۔

پنجاب یونی ورسٹی میں بالآخر اسلامیات کا ایک شعبہ قائم ہوا، لیکن فوری طور پر جن حضرات نے یہ ذمے داری سنبھالی، وہ اس قدیم روایت کے نمائندے نہیں تھے، جس کے نمائندگان کو وہاں لانے کی ضرورت تھی۔ چناں چہ میں نے ندوہ اور جامعہ ملیہ کے ضمن میں جس ضرورت کے مفقود ہونے کا ذکر کیا ہے، وہ یونی ورسٹی میں بھی نظر نہ آئی۔ پھر بعد میں پاکستان کی دوسری یونی ورسٹیوں میں اسلامیات کی تعلیم و تدریس کا وہ نظام جوں کا توں اپنالیا گیا، جو پنجاب یونی ورسٹی میں اختیار کیا گیا تھا۔ اس لیے ضرورت کے ساتھ اس کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آج جو کیفیت ہے، وہ اسلامیات کے طلبہ اور اساتذہ سے مخفی نہیں ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسلامیات کی تعلیم کا کوئی ایسا نظام مرتب کریں کہ جس میں دو ضروریات کی تکمیل کا سامان پایا جاتا ہو۔ ایک تو مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تعلیمی روایت کا تحفظ اور تسلسل، جس میں برصغیر کے مسلمانوں نے بہت کچھ اضافہ کیا ہے، جس میں ایک طرف تعمق بھی ہے اور دوسری طرف وسعت بھی۔ جس میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ اسلامی ثقافتی اقدار کے تہذیبی و فکری وجود کو پوری طرح جلا بخشے اور اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی نئی چیز ملے تو اس کو اپنے مزاج کے مطابق اپنے نظام میں سمو لے۔ آج وسعت ظرفی کی اس روایت کو زندہ کرنے کی

ضرورت ہے اور اس کے لیے اختصاص اور تعمق ضروری اور لازمی شرط ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ دوسری چیز جو ضروری ہے، وہ دور جدید کے تقاضوں کا صحیح اور متوازن احساس وادار ک اور اس کا مناسب جواب ہے۔ دور جدید کے جو تقاضے ہیں، دور جدید میں اسلام کو ایک کارفرما قوت بنانے کی جو مہم ہے، اس میں جہاں جہاں فکری صلاحیت اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، وہ اس نئے مجوزہ اور منتظر نظام کے فارغ التحصیل حضرات میں ہونی چاہیے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ہاں ایسے ماہرین معاشیات پیدا ہوں، جو دور جدید کے معاشی نظام کو اسلامی اصولوں کے مطابق استوار کر سکیں۔ ہمیں آج یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ایسے ماہرین ہمارے ہاں موجود نہیں ہیں۔ ہمیں ایسے قاضیوں اور ماہرین قانون کی ضرورت ہے، جو اسلامی فقہ میں گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ جدید قانونی نزاکتوں اور آئینی پیچیدگیوں کو بھی خوب سمجھتے ہوں۔ آج ہمارے ہاں ہزاروں ایسے ماہرین پاکستان میں موجود ہیں، جو موجودہ نظام کو چلا رہے ہیں، ان کے مقابلے میں شاید چند ماہرین قانون بھی ایسے نہیں ہیں، جو ایک طرف فکر اسلامی اور فقہ اسلامی میں کماحقہ تعمق رکھتے ہوں اور دوسری طرف دور جدید کے تقاضوں کو بھی بہ خوبی سمجھتے ہوں۔

ان سارے شعبوں میں، ان سارے کاموں کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک نئے نظام کو وضع کریں اور وہ نیا نظام اساتذۂ کرام بھی وضع کر سکتے ہیں، علما بھی وضع کر سکتے ہیں۔ میری دعا ہے، مجھے امید ہے کہ جس طرح تاریخ کے ایک دور میں اللہ تعالیٰ نے ملا نظام الدین سہالوی کو کھڑا کیا، پھر ایک دوسرے تاریخی مرحلے پر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو کھڑا کیا، پھر تیسرے مرحلے میں ندوہ کے بانی مولانا محمد علی مونگیریؒ کو کھڑا کیا، علامہ شبلیؒ کو کھڑا کیا، اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ ہم میں سے کسی ایک کو نہیں، سیکڑوں ہزاروں کو اس کام کے لیے کھڑا کر دے اور ہم ان نئی ذمے داریوں کا جواب دینے کا اپنے آپ کو اہل ثابت کر سکیں۔

دینی و عصری تعلیم کا امتزاج۔ فوائد و نقصانات

جامعہ دار العلوم اسلامیہ، لاہور میں ۱۳/ جون ۲۰۱۰ء
کو تربیت المعلمین کے سلسلے میں منعقدہ سیمینار سے خطاب

دِینی و عصری تعلیم کا اِمتزاج

فوائد و نقصانات

آپ سب حضرات اہلِ علم ہیں، مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔ شریعت کے مصادِر اَور مقاصِد سے، مجھ سے زیادہ واقِف ہیں۔ یہ خیالات آپ کی خدمت میں اِس لئے پیش ہیں کہ آپ اِن پر غور فرمائیں اَور اگر کوئی بات اِن میں قابلِ قبول معلوم ہو، قابلِ عمل معلوم ہو اَور اُمّتِ مُسلمہ کے لئے مفید معلوم ہو تو اُس پر غور فرمائیں اور اُس پہ عمل کرنے کی کوشش کریں۔

آج ہماری گفت گو کا عمومی عنوان ہے: دِینی اَور عصری تعلیم کا امتزاج، فوائد و نقصانات۔

دِینی اَور عصری کے اِمتزاج پر گفت گو ویسے تو ہر دَور میں رہی ہے، میں ابھی اس کا ذِکر کرتا ہوں، لیکن جس مفہوم میں ہم آج عصری اَور دِینی تعلیم کے اِمتزاج کی بات کر رہے ہیں، یہ گفت گو بھی خاصی پُرانی ہے اَور کم سے کم ڈیڑھ سو سال پُرانی ہے۔ جب سے دار العلوم، دیوبند قائم ہوا تھا۔ ۶۷-۱۸۶۶ء میں اُس وقت سے اِس ضرورت کا احساس بھی کیا جانے لگا تھا کہ دِینی تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی دُنیاوی یا عصری تعلیم بھی دی جائے کہ جو لوگ اِس دِینی تعلیم کو پا کر مُسلمان معاشرے میں نکلیں وہ مسلمان معاشرے کے مسائل اَور معاملات کو سمجھ سکیں، اَو

رسمجھنے کے بعد اپنی اِس دینی رہ نمائی اَور دینی تعلیم کو زیادہ موثر انداز میں عامۃ النا س تک پہنچا سکیں۔ چناں چہ دیوبند کے قیام کے فوراً بعد سے اس پہ گفت گو شروع ہوئی اَور اِس گفت گو کا نتیجہ، دارالعلوم ندوۃ العلما کی شکل میں نکلا۔ جس کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ اُس زمانے کے محاورے میں دیوبند اَور علی گڑھ کو ملایا جائے، دیوبند اَور علی گڑھ کے مقاصد کو یک جا کیا جائے، تا کہ ایک ایسا ادارہ بن سکے جہاں سے بہ یک وقت دونوں کے تقاضے پورے کیے جا سکیں۔ کچھ عرصے کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ ندوۃ سے وہ تقاضا پورا نہیں ہو رہا جو بعض حضرات کے ذہن میں تھا تو انہوں نے جامعہ مِلّیہ کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم کیا۔ گویا یہ چار بڑے ادارے جو برِّ صغیر کے مسلمانوں نے قائم کیے، یہ مسلمانوں کے اُن تعلیمی افکار کا مظہر ہیں، جو برِّ صغیر کے اہلِ علم کے ذہن میں تھے۔ جن پر برِّ صغیر کے اہلِ علم اَور دینی اَور تعلیمی قائدین مسلسل غور کرتے رہے۔

یعنی خالص دُنیوی اَور مادّی ضروریات کے لئے اگر تعلیم کی ضرورت ہو تو علی گڑھ قائم کیا گیا۔ خالص دِینی تعلیم کے لئے جہاں ضرورت ہو تو دیوبند قائم کیا گیا۔ پھر ایسا ادارہ جو اصلاً دیوبند ہو، اُس میں تھوڑا سا علی گڑھ بھی ہو، وہ دارالعلوم ندوۃ العلما تھا۔ ایسا ادارہ جو اصلاً علی گڑھ ہو، اُس میں تھوڑا سا دیوبند بھی ہو، وہ جامعہ مِلّیہ کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ بات بہت سے حضرات کو یاد نہیں رہی اَور خاص طَور پر ہندوستان میں جامعہ مِلّیہ کے لوگوں کو بھی یاد نہیں رہی۔ میں نے جا کر اُن کو یاد دِلائی کہ جامعہ مِلّیہ کا قیام شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کے ہاتھوں ہوا تھا۔ انہوں نے جامعہ مِلّیہ کا سنگِ بُنیاد رکھا تھا، اَور یہ اُن کی زندگی کی آخری سرگرمیوں میں سے ایک سرگرمی تھی۔

اِس سے میں یہ نتیجہ نکالنا چاہتا ہوں کہ خود دیوبند کے اکابرین نے اِس بات کی ضرورت کو محسوس کیا، اِس بات کا احساس کیا کہ ایک ایسا ادارہ ہونا چاہئے جہاں دُنیا کی ضرورت کے لئے متدین اَور مخلص مسلمان تیار کیے جائیں۔ مسجد کی ضرورت کے لئے مخلص اور متدین علما کی ضرورت تو دیوبند سے پوری ہوئی۔ لیکن جس زمانے

میں دیوبند کا ادارہ قائم ہوا تھا، اُس زمانے کے حالات کیا تھے؟ اُس زمانے کے حالات اگر آپ کے سامنے ہوں اور آپ وہ حالات تصور سے سامنے لاسکتے ہیں کہ مُسلمانوں کی حکومت ختم ہو چکی ہے، مُسلمانوں کا لاکھوں کی تعداد میں قتلِ عام چند سال پہلے تک ہو تا رہا تھا۔ دہلی، شاملی، مظفر نگر، لکھنؤ، برِصغیر کا کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں سڑکوں پر پھانسی گھاٹ نہ بنے ہوں اور روزانہ سیکڑوں مسلمانوں کو، بااثر شخصیات کو پھانسیاں نہ دی جارہی ہوں۔ جہاں سیکڑوں اہلِ علم کو یا تو قتل نہ کیا گیا ہو، کالا پانی نہ بھیجا گیا ہو، حبسِ دوام باعبورِ دریائے شور کی سزا نہ دی گئی ہو۔ انڈمان میں آج بھی سیکڑوں اور ہزاروں مسلمان اہلِ علم کی اولاد بستی ہے جن کو وہاں نظر بند کیا گیا۔ اِن حالات میں جب سارے اوقاف ختم کردیے گئے، سارے تعلیمی ادارے بند کردیے گئے، جہاں مسلمان بااثر لوگ سر چھپانے کے محتاج ہوں، وہاں یہ توقع کرنا کہ کوئی ایسا ادارہ بنایا جائے جیسی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ہے، یا جیسا آج مثلاً جامعہ اشرفیہ ہے یا جامعۃ الرشید ہے یا دارالعلوم کراچی ہے۔ یہ ناقابلِ تصور بات تھی، اِس کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی، وہاں جس بات کی توقع ہو سکتی تھی اور جو چیز ممکن العمل تھی، وہ یہ تھی کہ ہر قسم کی دُنیاوی قربانی کو برداشت کرکے ہر قسم کے مسائل اور مشکلات کا سامنا کرکے، دِین کا جو کم سے کم تقاضا ہے، اُس کو برقرار رکھا جائے اور اُس کو پورا کیا جائے۔

مسلمانوں کی کم سے کم دِینی زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ مسجدیں آباد رہیں، قال اللہ و قال الرسول سے دِل چسپی رکھنے والے موجود رہیں۔ اللہ کے دِین کو پڑھنے پڑھانے والے زندہ رہیں اور یہاں اسپین کی طرح کی صورتِ حال نہ ہو۔ اسپین کا نقشہ آپ کے سامنے ہے۔ جو حضرات روانی سے عربی پڑھ سکتے ہیں وہ ایک کتاب ضرور پڑھیں، ہمیں نے اپنے زمانے میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی سے شائع کروائی تھی: ''انبعاث الاسلام فی الاندلس''۔ اِس میں مصنف نے ۲۵، ۳۰ سال کی تحقیق کے بعد یہ بتایا تھا کہ مسلمانوں کے زوال کے بعد حکومتِ غرناطہ کے زوال کے بعد اسپین کے مسلمانوں پر کیا گزری؟ اُس کی تفصیل ہے۔ یہ خطرہ ہندوستان میں

بالکل موجود تھا۔ اگر اسپین میں مسلمان ۱۵ فی صد تھے، ہندوستان میں بھی ۱۵ فی صد تھے۔ اسپین میں مسلمان شہروں تک محدود تھے، ہندوستان میں بھی بڑے شہروں تک محدود تھے۔ پورے دیہات و زمینداریاں، صحرا اور ریگستان وہاں بھی غیر کے مسلموں کے قبضے میں تھے، یہاں بھی غیر مسلموں کے قبضے میں تھے۔ دُنیا کی بڑی بڑی غیر مسلم قوتیں وہاں بھی غیر مسلموں کا ساتھ دے رہیں تھیں اور مسلمانوں کو نکالنا چاہتی تھیں، یہاں بھی ایسا ہی تھا۔ اِس لیے اسپین کے تجربے سے بچنے کے لئے کچھ سعید لوگوں نے یہ طے کیا کہ ایک ایسا ادارہ بنایا جائے، جہاں مسلمانوں کی دِینی زندگی کے کم سے کم تقاضے کو برقرار رکھا جائے، کم از کم وہ بیج موجود رہے، وہ گملا رکھا رہے، جس سے گلستان بعد میں تیار ہو سکے۔ گلستان تو اُجاڑ دیا، درختوں کو اُکھاڑ کے پھینک دیا، اُن کے بیج کہیں کہیں موجود تھے، وہ چھوٹے چھوٹے گملے بنا کے محفوظ کر لیے گئے۔ یہ صورت تھی دیوبند کے قیام کی۔ لیکن اللہ نے برکت دی، اخلاص میں ہمیشہ برکت ہوتی ہے۔ جو کام اخلاص سے کیا جائے اُس کو بقا ہوتی ہے۔ اِس کام کو بقا رہی اور انگریز کے پورے دَور میں ۶۷۔۱۸۶۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر پاکستان بن گیا۔ پاکستان اِس کام کے لئے بنایا گیا تھا کہ برّصغیر کے مسلمانوں کا ایک نیشنل ہوم لینڈ ہو گا، برّصغیر کے مسلمانوں کا ایک ایسا وطن ہو گا، جہاں مسلمانوں کو اِسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ یہ بات دُہرانے کی ضرورت نہیں کہ ۳۶۔۱۹۳۵ء سے یہ بات مسلسل کہی گئی اور اِسی لیے برّصغیر کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نے تحریکِ پاکستان کا ساتھ دیا۔

پاکستان بننے کے بعد کیا ہونا چاہئے تھا؟ پاکستان بننے کے بعد صورتِ حال میں ایک نئی اور بُنیادی تبدیلی آئی، وہ تبدیلی جو ۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۶ء کے مقابلے میں ایک بُنیادی تبدیلی تھی۔ آج سے ایک نئے دَور کا آغاز ہو رہا تھا، آج ایک ایسا مُلک وجود میں آرہا تھا جس کا اعلان یہ تھا یہ یہاں شریعت کے احکام کے مُطابق نئے انداز سے زندگی کا رنگ ڈھنگ شروع کیا جائے گا۔ یہاں کے قوانین اِسلام کے مطابق ہوں

گے، یہاں کی بینکنگ، یہاں کی معیشت، یہاں کی حکومت، معاشرت، ہر چیز شریعت کے مطابق بنائی جائے گی۔ اب یہاں مستقبل کے مقاصد تبدیل ہو گئے۔ وہاں مستقبل یہ تھا کہ صرف گملے کو محفوظ رکھنا ہے، اُس کو بھی چھپا کے رکھنا ہے، یہاں مقصد یہ تھا کہ پوری زمین کو آباد کرنا ہے، اِس کے لئے کھاد کی فراہمی کی ضرورت ہے، گلستان کو دوبارہ آباد کرنا ہے۔ اِس لئے میں ذرا تفصیلی تمہید کے بعد یہ عرض کرنا چاہتا ہوں، کہ پاکستان بننے کے بعد دِینی تعلیم کے تقاضوں میں وُسعت پیدا ہو گئی اور وُسعت پیدا ہونی چاہئے تھی۔ اور اِس وُسعت کے تقاضے اُس مختصر اور محدود ذِمے داری کے تقاضوں سے مختلف ہیں۔ اگر گملے کی مثال سامنے رکھی جائے کہ آپ گملے کا تحفظ کرنا چاہیں تو اُس کی ذِمے داریاں اَور ہیں، اس مقصد کے لئے اَور طرح کے وسائل درکار ہوں گے، اَور طرح کی مہارتیں درکار ہوں گی۔ اگر آپ ۵۰۰ ایکڑ پہ نیا گلستان لگانا چاہیں، جس میں ہر مُلک و مِلت کے پھول ہوں، جس میں ہر موسم کے گل و گل زار پائے جاتے ہوں، جس میں ہر قسم کا پھل پایا جاتا ہو، ہر قسم کا میوہ موجود ہو، دُنیا کے ہر اِنسان کی ضرورت کے لئے طِبّی اور غذائی سامان وہاں موجود ہو، اُس کے تقاضے بھی اَور ہیں، اِس کے لئے مہارتیں بھی اَور طرح کی درکار ہیں، اِس کے لئے بہت کچھ غور و خَوض کی ضرورت ہے۔ اِس لئے میری اِس گفت گو یعنی "دِینی تعلیم اَور عصری تعلیم کے امتزاج کے نقصانات و فوائد کیا ہیں" کا اِس نئے سیاق و سباق میں جائزہ لیں۔

۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء کے دَور کو فی الحال گفت گو سے نکال دیں، اِس لئے نہیں کہ وہ دَور اہم نہیں ہے، بل کہ وہ دور بھی بالکل اہم ہے، اِسی دَور میں وہ گملے محفوظ رہے، جن سے آپ کو بیج لینے ہیں، جن سے آپ کو قلم لگانے ہیں، لیکن آج کے تقاضے اَور ہیں۔ پہلے یہ دیکھ لیں کہ دِینی تعلیم سے مُراد کیا ہے؟ اور عصری تعلیم سے مُراد کیا ہے؟ ایک علمی گفت گو میں ضروری ہے کہ جو بات کی جائے پہلے موضوع کا تعین کر لیا جائے کہ ہماری مُراد کیا ہے؟

دِینی علوم میں آپ کو معلوم ہے کہ بُنیادی علوم تو قرآن پاک اور علومِ تفسیر،

علومِ حدیث اور اُصولِ حدیث، فقہ اور اُصولِ فقہ، کلام اور عقیدہ، تزکیہ اور احسان اور عربی زبان و ادب ہیں۔ ان علوم و فنون کی تدریس، ان علوم و فنون میں تعمق، ان علوم و فنون میں مہارت اور کماحقہٗ مہارت، مجتہدانہ بصیرت، یہ دینی علوم کا سب سے بڑا مقصد ہونا چاہئے۔ اگر کوئی دینی تعلیم ایسی ہے کہ اُس کے نتیجے میں ان تمام علوم میں وہ مہارت پیدا نہیں ہو رہی جو آج درکار ہے، جو اُمت کی رہ نمائی کے لئے ناگزیر ہے، جو اُمتِ مسلمہ کے مستقبل کی تشکیل کے لئے لابُدی ہے تو پھر وہ دینی تعلیم نہیں ہے یا کم از کم اُس معیار کی دینی تعلیم نہیں ہے، جس معیار کی آج ہمیں درکار ہے۔

مسلمانوں نے اپنے دَور میں علوم کی دو قسمیں بیان کی ہیں:

۱۔ علومِ اصلیہ: جن کی اصل ضرورت ہے۔

۲۔ علومِ آلیہ: جن کی ضرورت پہلی قسم کے علوم کو حاصل کرنے کے لئے ہے۔

چناں چہ بلاغت و بیان اور بڑی حد تک علومِ رجال اور علومِ روایت، منطق و عقلیات وغیرہ وغیرہ، اِن کو علومِ آلیہ کی حیثیت دی گئی۔ علومِ آلیہ دراصل اُن علوم کے خادِم تھے، جو حقیقت میں حاصل کرنا مقصود تھے۔ مقصود یہ ہے کہ قرآن پاک میں گہری بصیرت حاصل کی جائے۔ علومِ تفسیر، علومِ قرآن پر مجتہدانہ نظر رکھنے والے علما اور مُفسّرین پیدا کیے جائیں۔ لیکن چوں کہ اِس کے لئے بلاغت سے واقفیت بھی درکار ہے، لغت اور زبان سے واقفیت بھی درکار ہے اور بہت سے علوم و فنون سے واقفیت درکار ہے۔ اِس لئے طالب علم اور عالم کی تیاری کے لئے اِن علوم سے واقفیت ناگزیر سمجھی گئی ہے۔ علمِ حدیث میں ماہرانہ بصیرت حاصل کرنے کے لئے بہت سے ابتدائی علوم کی ضرورت ہے، جغرافیے کی بھی ضرورت ہے، تاریخ کی بھی ضرورت ہے، علمِ رجال کی بھی ضرورت ہے، تذکرہ و سوانح کی بھی ضرورت ہے۔ یہ فی نفسہٖ مقصود نہیں تھے لیکن علمِ حدیث کے حصول کے لئے اِن کو حاصل ناگزیر سمجھا گیا تو گویا دینی علوم سے مُراد یا دینی تعلیم سے مُراد وہ تعلیم ہے جس کا

مقصد اِن علوم وفنون کے متخصصین اور متعمقین اور مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے علما پیدا کرنا ہے۔ اِس لئے کہ جب تک ایسے علمائے محققین، متعمقین اور مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے حضرات موجود نہ ہوں، اُس وقت تک اُمتِ مُسلمہ کی رہ نمائی نہیں ہو سکتی۔

دوسری صدی ہجری میں جب اُمتِ مسلمہ میں غیر معمولی توسیع پیدا ہوئی اور اُس وقت کی معلوم دُنیا کے تین برّاعظموں تک اُمتِ مُسلمہ پہنچ گئی تو نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ رومن لا (Roman Law) سے واسطہ پیش آیا۔ ایرانی تصورات سے واسطہ پیش آیا، ہندوستانی تصورات سے، بدھ ازم سے، عیسائیت، یہودیت سے واسطہ پیش آیا۔ اِن میں سے ہر ایک کی طرف سے اعتراضات اِسلام پر وارِد ہوئے۔ اِس کا اِتنا پختہ جواب مُفکّرینِ اِسلام اور فقہاو متکلمین اور علمائے اُصول نے دے دیا کہ ایک ہزار برس تک اُس پر نظرِ ثانی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بنیاد اُن کے پاس موجود تھی جو صحابہ کرام ؓ اور تابعین سے اُن کو ملی تھی، لیکن اِس بنیاد یا اِس ذخیرے کی جو فارمولیشن تھی، یعنی جس طرح سے انہوں نے اس کو تعبیر کیا اور بیان کیا اُس میں عقلی استدلال بھی تھا، اس میں یونانیوں کے اعتراضات کا جواب بھی تھا، ایرانیوں کے تصورات کا جواب بھی تھا، ہندوستانی ویدازم کا جواب بھی تھا مصر کے نوافلاطونی فلسفیوں کا جواب بھی تھا اور یہ جو پیکیج ہم کہہ سکتے ہیں، یہ جو مجموعہِ علوم یا مجموعہِ ثقافت تھا اُس میں اِن تمام مسائل کا مؤثر جواب موجود تھا، جس کے نتیجے میں علمی، فکری اور تہذیبی سطح پر کسی کو مُسلمانوں کے مقابلے میں کھڑا ہونے کا یارانہ رہا۔ یہ صورتِ حال ہزار برس تک جاری رہی۔

جس دَور میں یہ پُوری صورتِ حال جاری تھی، اُس دَور میں بھی جو عصری علوم تھے اُن سے مُسلمانوں نے ہمیشہ اعتنا کیا، حال آں کہ وہ اُمتِ مُسلمہ کا دَورِ عروج تھا۔ اُمتِ مُسلمہ سیاسی اعتبار سے پوری دُنیا کی، آج کل کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ یونی پولر (uni-polar) (یک قطبی) دُنیا اُن کے کنٹرول میں تھی یک قطبی دُنیا پر اُن کا کنٹرول تھا اور کوئی قوت مُسلمانوں کے خلاف آواز اُٹھانے والی نہیں تھی، اور جس

نے آواز اُٹھائی وہ کام یاب نہیں رہا، وہ نا کام ہوا۔ اس لئے مسلمانوں کو کسی تہذیب یا کسی فکر یا ثقافت سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انہیں کوئی سیاسی تہذیبی چیلنج درپیش تھا کہ کوئی تہذیب اُٹھے گی اور اسلامی تہذیب کو مٹادے گی، ایسا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔

یونانیوں کی مثال آپ لیں کہ جب یونانی کتب کے ترجمے دوسری صدی ہجری کے اواخر میں شروع ہوئے تو یونانی مسلمانوں کے لئے کوئی فکری طور پر چیلنج کی حیثیت نہیں رکھتے تھے، نہ اُن کی کوئی سیاسی حیثیت تھی، نہ اُنہیں کوئی عسکری مقام حاصل تھا، نہ اُن کی کوئی اَور حیثیت تھی۔ یہ تو بعض مسلمانوں نے علمی دِل چسپی کی خاطر اُن کی کتابوں کے ترجمے کیے، صحیح کیے، غلط کیے؟ اللہ بہتر جانتا ہے۔ اس بارے میں دونوں طرح کی رائیں مسلمانوں میں رہیں، لیکن جب اِن کتابوں کے ترجمے ہوئے، تو اِن ترجموں سے بعض لوگ متاثر ہوئے، اُن کی تعداد مسلمانوں میں ایک فی صد تھی کہ ایک فی ہزار تھی؟ شاید ایک فی ہزار سے بھی زیادہ نہ ہو جو واقعی یونانی افکار سے متاثر ہوئے، یونانی گم راہیوں کے قائل ہوئے، وہ صرف چند لوگ ہوں گے، پوری دُنیائے اِسلام میں چند سو، چند ہزار ہوں گے، لیکن ان چند سو یا چند ہزار افراد کو بھی کسی فکری گم راہی میں جانے سے روکنا مسلمان علما نے اپنا فرض سمجھا۔ اُنھوں نے یونانی علوم و فنون کو حاصل کیا، یونی علوم و فنون کا مطالعہ کیا، جائزہ لیا، اِس میں کیا چیز قابلِ قبول تھی اور کیا نا قابلِ قبول تھی، اُس کو بیان کیا، دلائل سے اُس کا جواب دیا اور اُس میں جو مثبت حصّہ تھا اُس کو اِسلامی تعلیمات کو بیان کرنے کے لئے استعمال کیا۔

میں اپنی بہت سی گفت گوؤں میں امام غزالی کی مثال دِیا کرتا ہوں، امام غزالیؒ کو بجاطور پر حجۃ الاسلام کہا جاتا ہے۔ امام غزالیؒ کے بڑے بڑے کارنامے دو ہیں، جن کی وجہ سے غالباً یہ لقب اُن کو دیا گیا ہے۔

ایک تو یہ اُنھوں نے یونانی علوم وفنون کا جائزہ لے کر انہیں خالص علمی انداز میں بیان کیا کہ یونانیوں کے علوم یہ ہیں۔ اس کے بعد خالص عقلی انداز میں یونانی

اسلوبِ استدلال سے کام لے کر جس سے کوئی بڑے سے بڑا یونانی فلسفی، خود ارسطو اور افلاطون بھی ہوتا تو وہ اس اسلوبِ استدلال سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا، اِس اسلوبِ استدلال سے کام لے کر یونانیوں کی کمزوریوں کو واضح کیا، جو حصّہ قابلِ عمل تھا اُس کو لکھا کہ یہ قابلِ قبول ہے، ہمیں اِس سے استفادہ کرنا چاہئے اور جو نا قابلِ قبول ہے، اُس کے دلائل یہ ہیں، یہ اِس لئے نا قابلِ قبول ہے۔ جو حصّہ قابلِ قبول تھا اُس کو امام غزالیؒ نے خود اِسلامی علوم وفنون کی خدمت کے لئے استعمال کیا۔ جس زمانے میں اُنھوں نے المصفیٰ لکھی، جو اُصولِ فقہ کی چند بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ المصفیٰ لکھنے میں انھوں نے پوری منطق سے کام لیا۔ اِتنا کام لیا کہ المصفیٰ کے شروع کے ۵۰ صفحے اگر طلبہ کو پڑھادیں تو منطق کی کوئی اور کتاب پڑھانے کی ضرورت نہ رہے۔ امام غزالی نے کتاب کے شروع میں منطق کا خلاصہ اور عطر بیان کردیا ہے۔ اُس زمانے کے لحاظ سے اِس پوری کتاب کی اُٹھان اور اسلوب منطقی ہے۔ امام غزالیؒ کا انتقال ۵۰۵ ہجری میں ہوا۔ ۵۰۱ ہجری میں اگر کوئی یونانی زندہ ہو کے آجاتا، حکیم ارسطاطالیس، معلّمِ اوّل زندہ ہو کر آجاتا اور امام غزالی کے سامنے بیٹھ کے کتاب پڑھتا تو اپنی منطق کی روشنی میں اِس کتاب پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ اِس حد تک اُنھوں نے پختگی کے ساتھ اِس کو واضح کردیا۔ اِس بات کی یہ صرف ایک مثال ہے کہ مسلمانوں نے عصری علوم سے ہمیشہ اِستفادہ کیا اور عصری علوم کو خادِم بنا کے اِسلام کے کیمپ میں داخل کرلیا۔

بعض حضرات، بعض علمائے کرام جب اِس پر تامل کا اِظہار کرتے ہیں تو اُن کا تامل بالکل بجا ہوتا ہے۔ ان کا تامل اِس لئے ہوتا ہے کہ بعض لوگ اِسلامی علوم کو خادِم اور عصری علوم کو مخدوم بنا کے ایک جگہ جمع کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اِسلامی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔ اِسلامی تاریخ میں کسی بھی عصری علم یا عصری فن سے جب اِستفادہ کیا گیا تو اِسلامی علوم اَور اِسلامی ثقافت اور تہذیب کے خادِم کے طَور پر اس سے کام لیا گیا اور اِس خادِم نے اِسلامی علوم کو مخدوم بنا کر اُن کی خدمت کی۔ یہ آپ کو علمِ طب میں بھی نظر آئے گا، تفسیر میں بھی، حدیث میں بھی، فقہ میں بھی،

اُصولِ فقہ میں بھی، کلام میں بھی، حتیٰ کہ تصوف میں بھی۔ تصوف جیسے فن کی کتابیں جو خالص روحانیات کا میدان ہے اُس کو بھی اِتنے مضبوط عقلی اِستدلال سے بیان کیا گیا ہے۔ آپ دیکھ لیں ''تربیۃ السالک'' دو بڑی جلدوں ہیں اور بہت ساری کتابیں ہیں، جن کے میں نام لوں گا تو گفت گو طویل ہو جائے گی۔ وہ سب کی سب عقلی استدلال کی بُنیاد پر ہیں۔ اِس لئے یہ بات کہ عصری علوم سے استفادہ کوئی نئی چیز ہے، جس کی آج بعض لوگ دعوت دے رہے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔ عصری علوم سے استفادہ ہر دَور میں مسلمان اہلِ علم کرتے آئے ہیں۔ اِس شرط کے ساتھ کہ عصری علوم پر ناقدانہ نظر رکھتے ہوں، مقلّدانہ نہیں۔ مقلدانہ نظر تو خطرناک ہوتی ہے۔ ناقدانہ نظر، عصری علوم پر رکھتے ہوں تاکہ عصری علوم کو جو بھی جس زمانے کے علوم ہیں اُن کو اِسلام کی خدمت کے لئے اور اِسلامی علوم وفنون کو نئے انداز سے مرتب اور مدوّن کرنے کے لئے بیان کریں۔

آج کے سیاق وسباق میں عصری علوم سے کیا مُراد ہے؟ بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں، ایک بہت بڑے بزرگ ہمارے مُلک کے ہیں، اُن سے میں نے ایک مرتبہ بات کی، جب میں اِنتظامی طَور پر بعض معاملات سے وابستہ تھا، تو میں نے عصری علوم کی بات کی، تو انھوں نے بہت غُصّے سے مجھ سے پوچھا کہ کیا انجینئر نگ کالج میں مولوی تیار ہوتے ہیں، تو پھر مدرسوں میں انجینئر کیوں تیار ہوں؟ یہ بالکل غلط مبحث ہے۔ عصری علوم وفنون سے استفادہ کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک محدث کو حدیث کی درس گاہ سے اُٹھا کے انجینئر بنادیا جائے، ایک فقیہ کو دارالافتا سے اُٹھا کے کہا جائے کہ تم میڈیکل ڈاکٹر ہو جاؤ۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو غلط سمجھتا ہے۔ محدث کو محدث ہی رہنا چاہئے، لیکن محدث ایسا ہو جو علمِ حدیث پر ماہرانہ، مجتہدانہ بصیرت رکھتا ہو، اپنے وقت کا انور شاہ کشمیری ہو، اِس طرح کا محدث ہو لیکن علمِ حدیث پر جو آج اعتراضات کیے جارہے ہیں، آج کا تعلیم یافتہ آدمی جن اسباب سے علمِ حدیث کے بعض پہلوؤں پر شُبہات رکھتا ہے، ان کو وہ سمجھتا بھی ہو اور ان کا جواب دینے اور اعتراض کرنے والوں کو مطمئن کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ اِن شُبہات کو

سمجھنے کے لئے بعض چیزوں کا جاننا ضروری ہے۔ اگر وہ شُبہات نہیں جانتا، اگر وہ اِن اعتراضات کے منشا سے واقف نہیں ہے کہ وہ اعتراضات کیوں پیدا ہوئے ہیں، تو پھر وہ اُن کا جواب نہیں دے سکتا۔

یہ بات بہت ادب سے لیکن جرأت سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے بہت سے علمائے کرام یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام صرف فتویٰ دینا ہے، یہ بات درست نہیں ہے۔ فتوے سے کسی کا ذہن نہیں بنتا۔ فتویٰ اُس کے لئے ہوتا ہے جو دِین پر عمل کرنا چاہے اور آپ سے آ کر پوچھے، جو گمراہ ہے، شہر میں گمراہی پھیلا رہا ہے، آپ اُس کے خلاف فتویٰ دے کے کیا کر لیں گے؟ آپ کے فتوے سے وہ گمراہی سے باز آجائے گا؟ میں مثالیں دوں گا تو گفت گو لمبی ہو جائے گی۔ ہزاروں گمراہیوں کے خلاف فتوے آئے اور علمائے کرام نے یہ سمجھا کہ ہم نے فتویٰ دے دیا، ہمارا کام ختم ہو گیا، لیکن وہ کام ختم نہیں ہوا۔ اگر گمراہی اُس وقت ایک گملے میں تھی تو آج جنگل بن گئی ہے، کانٹے دار درخت اُس نے پیدا کر دیے ہیں، اِس لئے ضروری ہے کہ یہ سمجھیں کہ وہ گمراہی کیوں پیدا ہوئی؟ اور کہاں سے پیدا ہوئی؟ اور وہ سوالات جو پیدا ہو رہے ہیں، وہ کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟

میں پوری دُنیا میں جاتا رہتا ہوں۔ مُختلف مُلکوں میں جانے کا پچھلے تیس سال سے موقع ملتا رہتا ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اِنتہائے مشرق میں جہاں دِن میں پہلی مرتبہ سورج طلوع ہوتا ہے، جزائر فجی وہاں کا ایک عام تعلیم یافتہ شخص اور امریکا کی انتہائی مغربی ریاست سان فرانسسکو کا ایک عام تعلیم یافتہ شخص اسلام پر ایک ہی طرح کے اعتراضات کرتا ہے۔ پیرس میں جائیں، اور کسی سے اسلام پر بات کریں، تو وہ بھی وہی اعتراض کرے گا، ساؤتھ افریقہ میں جائیں تو وہ بھی وُہی اعتراض کرے گا۔ پاکستان میں کسی بڑے جدید تعلیمی ادارے میں جائیں، لمز (LUMS - Lahore University of Management Sciences) چلے جائیں تو وہاں بھی اِسی طرح کے سوالات کیے جائیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی طرح کے سوالات اور ایک ہی طرح کے اعتراضات اور ایک طرح کے شُبہات پوری دُنیا میں کیوں پیدا

ہو رہے ہیں؟ اِس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ تہذیب اور وہ فکری استیلا جو مغرب سے آیا ہے، اُس نے پوری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور اِس استیلا کی وجہ سے وہ شُبہات پیدا ہو رہے ہیں جو ہر اِنسان کے دِل میں پیدا ہو رہے ہیں۔ اب آپ یہاں بیٹھ کر فتوی جاری کر دیں کہ فلاں چیز گم راہی ہے تو جو لوگ پہلے سے گم راہی سمجھتے ہیں وہ مزید یقین سے گم راہی نہیں سمجھنے لگیں گے، لیکن جو اِسے گم راہی نہیں سمجھتے وہ آپ کے فتوے سے اِسے گم راہی نہیں سمجھنے لگیں گے، وہ اِس پہ بہ دستور قائم رہیں گے، جیسا کہ میں سیکڑوں مثالیں دے سکتا ہوں کہ لوگ قائم رہے اور آج بھی قائم ہیں۔ اِس لئے میری گزارش یہ ہے کہ اِس دَور کے محاورے کو سمجھنے کے لئے ہمیں بھرپور محنت اور تیاری کی ضرورت ہے۔ میں امام ابو یوسفؒ کا یہ جملہ میں کئی مرتبہ دُہرا چکا ہوں:

من لم یعرف اهل زمان فهو جاهل

جو اپنے زمانے کے لوگوں کو نہیں جانتا وہ جاہل ہے۔

یعنی اُس کا علم قابلِ اعتبار نہیں۔ لہٰذا جس زمانے کے ماحول میں آپ دِین کی تعلیم دے رہے ہیں، اس ماحول کی زبان جاننا ہماری ضرورت ہے۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (۱)

اور ہم نے تمام رسولوں کو ان کی قوم ہی کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا، تا کہ وہ ان کے لئے کھول کر بیان کر سکیں۔

لسانِ قوم میں صرف اُردو یا پنجابی یا انگریزی شامل نہیں ہیں۔ لسان میں وہ پورا تہذیبی پس منظر بھی شامل ہے جو اُس زبان میں شامل ہوتا ہے۔ زبان محض کوئی وھیکل نہیں ہے، خیالات کے انتقال کا یا بیان کرنے کا محض کوئی وسیلہ نہیں ہے، ہر لفظ کے پیچھے پوری تاریخ اور پوری تہذیب اور پوری فکر ہوتی ہے۔ وہ فکر اور تہذیب خود بہ خود اِس لفظ کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

۱۔ابراہیم:۴

میں اپنا ذاتی تجربہ آپ کو بیان کروں۔ آج سے تقریباً ۴۰ سال پہلے میں نے نیا نیا ادارۂ اقتصاد الاسلامی میں کام شروع کیا تھا، تو میں نے ایک مضمون لکھا۔ اُس زمانے میں جو انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر تھے، اُن کو مضمون پسند آیا تو اُس زمانے میں اُردو میں ایک رسالہ نکلتا تھا، اُس میں میرا مضمون چھپا تو وہاں بنگلہ زبان میں بھی ایک رسالہ نکلتا تھا، یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ انھوں نے ایک بنگالی دوست سے کہا کہ اِس مضمون کا بنگلہ ترجمہ شائع کرو، تاکہ بنگالی بھی اِس کو پڑھیں۔ وہ بنگالی دوست جو اُردو بھی اچھی بولتے تھے، انگریزی بھی جانتے تھے اور مدرسے میں بھی کچھ وقت گزارا تھا تو اس لئے انہیں عربی سے بھی شُدبُد تھی، وہ میرے پاس آئے کہ کچھ مشکل الفاظ ہیں وہ ذرا میں سمجھنا چاہتا ہوں۔ اِس دَوران میں انھوں نے ایک لفظ بولا ''سناتن دھرم'' میں ایک دم چونکا، میں نے کہا یہ سناتن دھرم کیا بلا ہوتی ہے؟ کہنے لگے دینِ حنیف کا ترجمہ ہے۔ اناللہ وانا علیہ راجعون۔ میں نے اگر ہندو مذہب پر چند کتابیں نہ پڑھی ہوتیں اور سناتن دھرم کا پتا نہ ہوتا کہ سناتن دھرم کیا بلا ہوتی ہے، تو مجھے اس شدید غلط فہمی کا پتا بھی نہ چلتا۔ مجھے اندازہ تھا کہ سناتن دھرم کیا ہے۔ اب ہمارے بنگالی صاحبِ علم نے دینِ حنیف کا ترجمہ کیا ہے سناتن دھرم۔ اُن کو اِس میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن سناتن دھرم کے پیچھے جو پوری ہندوانہ تاریخ ہے، وہ دینِ حنیف کے ذریعے، دینِ حنیف کے بہ جائے وہ تاریخ آجائے گی۔ حنیف کا ایک خاص مفہوم جو سیّدنا ابراہیمؑ کے زمانے سے چلا آرہا ہے، جس کی جانب قرآن کریم نے کئی مقامات پر اشارہ فرمایا ہے، مثلاً فرمایا:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا (۲)

ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی بل کہ وہ تو سیدھی راہ پر چلنے والے مسلمان تھے۔

وہ مفہوم ختم ہوجائے گا، صرف ایک لفظ کے اِستعمال کی وجہ سے، اگر حنیفیت جس کا تعلق سیّدنا ابراہیمؑ سے ہے، اُس سے کاٹ کر سناتن دھرمیوں کے ساتھ اُس

۲۔ آل عمران:۶۷

کو جوڑ دیا جائے۔ اِس مثال سے آپ اندازہ کریں کہ زبان محض زبان نہیں ہوتی۔ لسانِ قوم سے مُراد محض وہ الفاظ یا عبارات نہیں ہیں، اس کے پیچھے پوری ثقافت اور پوری تاریخ، پوری تہذیب ہوتی ہے۔ اِس لئے ہر نبی جب آتا ہے تو اُس قوم کی پوری نفسیات سے، اُس کے مزاج سے، جسے انگریزی میں کہتے ہیں، اُس کے ''ایتھوز'' (Ethos) سے واقف ہوتا ہے۔ پھر وہ رہ نمائی اور دعوت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اِس لئے آج کل کے محاورے کو، آج کل کے ''ایتھوز'' (Ethos) کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جدید مغربی افکار سے واقفیت حاصل کی جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جو لوگ قرآن و حدیث اور فقہ کی تدریس سے وابستہ ہیں وہ اس کو چھوڑ کر کوئی اور پیشہ اختیار کرلیں، نہیں! بالکل نہیں! حاشاو کلاّ میرا بالکل یہ مقصود نہیں۔

جن چیزوں کو عصری علوم کہا جاتا ہے یا مغربی فکر و ثقافت کہا جاتا ہے، اُس کے تین حصّے ہیں:

۱۔ ایک حصّہ تو وہ ہے جو خالص عقلی اور فکری نوعیت کا ہے:

۲۔ دوسرا حصّہ وہ ہے جو تہذیبی اور ثقافتی نوعیت کا ہے:

۳۔ اور تیسرا حصّہ وہ ہے جو خالص تجدیدی نوعیت کا ہے۔

جب تک اِن تینوں کے درمیان الگ الگ فرق نہیں کیا جائے گا، تینوں کے لئے الگ حکم نہیں لگایا جائے گا، کوئی واضح فیصلہ کرنا، متعیّن راستہ طے کرنا بڑا مشکل ہے۔

جو حصہ عقلی و فکری ہے، اُس سے تعلق ہے اُن کے سوشل سائنسز (Social Sciences) کا یعنی اجتماعی علوم کا، تاریخ، سیاسیات، اجتماعیات، قانون، اِن سب کا تعلق فکری اور عقلی میدان سے ہے۔ اِسی سے انسانی علوم یعنی ''ہیومینیٹیز'' (Humanities) کا تعلق ہے، فلسفہ، نفسیات، یہ جو انسان کو سمجھنے کے علوم ہیں اور جو انسان کے معاشرے کو سمجھنے کے علوم ہیں اِن سب کی اُٹھان لادینی ہے۔ اِس کی جڑ اور بُنیاد میں لادینیت رکھی ہوئی ہے، دِین اَور دُنیا کی تفریق رکھی ہوئی ہے۔ لہٰذا جب

ایک شخص پہلے قدم سے ہی دین اور دُنیا کی تفریق کے تصور پر تربیت پائے گا، اب وہ قانون کے میدان میں، سیاست ہو، تاریخ ہو، کوئی علم ہو، معاشیات ہو، اُس کا ذہنی سانچہ جو تیار ہوا وہ لادینیت کے اُصول پر ہو گا۔ اِسی طرح کے سوالات وہ سوچے گا، اِسی نقطۂ نظر سے معاملات کو دیکھے گا، اِسی نقطۂ نظر سے ہر چیز کا جائزہ لے گا اور اگر گھر میں دینی تربیت اچھی ہو گئی تو وہ اپنی تربیت کی وجہ سے اپنے خیالات کا اِظہار نہیں کر سکے گا، لیکن دِل میں اُس کے بھی شُبہ رہتا ہے یا تو وہ دو خانے بنالیتا ہے، ایک دِین کا اور ایک دُنیا کا۔ یہی سیکولرازم (Secularism) ہے۔ یہی لامذہبیت ہے کہ دِین اور دُنیا کے خانے الگ الگ ہوں، اور دُنیا، دِین کی رہ نمائی سے خارِج ہو، سیکولرازم اِسی کا نام ہے کہ دُنیاوی معاملات کو وحیِ الٰہی کی رہ نمائی سے آزاد قرار دے دیا جائے۔ یہ بات نظری اعتبار سے ہو تو بہت بڑی گم راہی ہے، عملاً ہو تو بھی ایک طرح کا فسق ہے۔

دوسری بڑی بنیادی بات اِن علوم وفنون کے بارے میں یہ ہے کہ یہ اخلاقیات اور روحانیات کے تمام تصورات سے آزاد ہیں۔ آج مغربی دُنیا کا یہ طے شدہ تصور ہے کہ اکیڈمک (Academic) یعنی علمی معاملات کو، انٹیلکچول (Intellectual) معاملات کو، فکری سرگرمی کو اخلاقی تصورات سے آزاد ہونا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک آبجیکٹیو (Objective) چیز ہے اور ایک سبجیکٹیو (Subjective) چیز ہے۔ سبجیکٹیو (Subjective) یعنی داخلی، وہ جس میں آپ کی اپنی ذاتی پسند و ناپسند کو دخل ہو۔ آبجیکٹیو (Objective) وہ جس پہ آپ ذاتی پسند و ناپسند سے ہٹ کر کوئی فیصلہ کر سکیں۔ اب یہ کاغذ سفید ہے، کالا ہے۔ یہ ایک آبجیکٹیو (Objective) چیز ہے۔ اِس میں میری ذاتی پسند و ناپسند کو کوئی دخل نہیں کہ میں اِس کے سفید رنگ کو پسند کروں یا کالے کو، اِس کا رنگ سفید ہی رہے گا۔ اِس چاندنی کا رنگ سفید ہی رہے گا۔ یہ آبجیکٹیو چیزیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام علوم وفنون کو آبجیکٹیو ہونا چاہئے، سبجیکٹیو یعنی جس میں کسی کی ذاتی پسند و ناپسند کی وجہ سے کوئی رائے قائم کرنے کا موقع ہو اُس کو نکال دینا چاہئے۔ یہ جو آج نقاب پر پابندیاں ہیں، میناروں پہ پابندیاں

ہیں، پردے پہ پابندی ہے، یقیناً اِس کی وجہ مسلمانوں سے نفرت بھی ہے، لیکن اِس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جب پردہ کرکے خاتون چہرے کو ڈھکتی ہے تو وہ اپنے ذاتی مذہبی خیالات کی وجہ سے معاشرے میں ایک نیا رنگ پیدا کرنا چاہتی ہے۔ معاشرے کو آبجیکٹیو ہونا چاہئے۔ دواور دو چار کی طرح کسی عقلی بنیاد پر استوار ہونا چاہئے۔ ذاتی، اخلاقی یا روحانی تصورات کو معاشرے پر لاگو نہیں کرنا چاہئے۔ اِس لئے معاشرے کی بات ہو، اسکول، کالج، سرکاری دفاتر، پبلک مقامات، تو پھر ذاتی خیالات کو آپ اپنی حد تک رکھیں۔ یہ بات اِن کی گھٹی میں بیٹھی ہوئی ہے، آپ ڈریں اُس دِن سے جب ہمارے ہاں لوگ یہ مطالبہ اپنے دلائل کے ساتھ کرنے لگیں گے۔ اِس لئے کہ جو ذہنی تربیت اُن کی ہوئی ہے، وہ ہمارے ہاں بھی ہو رہی ہے۔ اِس لئے نتائج تو جیسے وہاں نکلے ہیں، وہ یہاں بھی نکلیں گے۔ گندم سے گندم پیدا ہوتی ہے، جو سے جو پیدا ہوتا ہے۔ پھر مغربی گم راہیاں، جن کے لئے کوئی اور مناسب لفظ نہیں ملتا، اِس لئے میں گم راہی کا لفظ استعمال کر رہا ہوں، یعنی مغربی مغالطے، مغربی تصورات کی بے شمار غلطیاں ہیں، جن کو یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔ یہ سارے علوم وفنون اِن کی بنیاد پر بنے ہیں۔

اگر آپ حضرات کو موقع ملے، خاص طَور پر علمائے کرام کو تو ایک چھوٹی سی کتاب ہے: ''جدیدیت'' کراچی میں شائع ہوئی تھی اور پروفیسر حسن عسکری، ایک بزرگ تھے، فلسفہ اور ادب اُن کا میدان تھا، اُنھوں نے یہ کتاب مفتی شفیع صاحبؒ کے کہنے پر لکھی تھی۔ (۳) اُس وقت مفتی صاحب کا خیال یہ تھا کہ مغربی افکار سے

۳۔ میری معلومات کے مطابق پہلی اور آخری بار محمد حسن عسکری مرحوم ومغفور کی یہ کتاب ''جدیدیت یا مغربی گم راہیوں کی تاریخ کا خاکہ''۔۱۹۷۹ء میں راول پنڈی سے شائع ہوئی تھی۔ اِس مختصر سی کتاب میں پروفیسر عسکری مرحوم کے دو مضامین یعنی ''جدیدیت: یا مغربی گم راہیوں کی تاریخ کا خاکہ'' اور ''اُن مغربی تصورات کی فہرست، جن سے دِین کے بارے میں غلط فہمیاں اور گم راہیاں پیدا ہوتی ہیں''، یک جا کر دیے گئے ہیں۔ بعد میں شاید، میں نے خود نہیں دیکھا ہے، صرف گمان ہے کہ لاہور سے کسی ناشر نے مجموعہ حسن عسکری کے نام سے کتاب شائع کی تھی، اُس میں یہ دونوں کتابچے بھی شامل ہوں۔

واقفیت کے لئے کوئی مختصر کتاب ہونی چاہئے، اس لئے انھوں نے ''جدیدیت'' کے نام سے یہ کتاب لکھی تھی، لیکن وہ اتنی مختصر ہے کہ اسے پڑھنا اور پڑھانا کسی ایسے آدمی کے بہت مشکل تھا جو مغربی تصورات سے اچھی طرح پہلے سے واقف نہ ہو۔ اِس لئے وہ زیادہ مقبول نہیں ہوئی۔ (۴) لیکن آپ میں سے اگر کسی کو دِلچسپی ہو تو ضرور پڑھیں، اِس لئے کہ اِس میں اُن گُم راہیوں کی فہرست دی گئی ہے، اور یہ فہرست پروفیسر حسن عسکری مرحوم نے مغربی علما کی تحریروں کی روشنی میں مرتب کی ہے، اپنی طرف سے نہیں کی۔ یہ تو ایک میدان ہے عقلی اور فکری۔

دوسرا میدان ہے تہذیبی اور ثقافتی، جس میں اصل زور مادّیت پر ہے، اخلاقیات اور روحانیات ان کے دائرۂ کار سے باہر ہیں۔ پھر جس کو ہمارے علمائے اُصول نے ضروریات، حاجات اور تحسینیات کا نام دیا ہے۔ اِسلامی شریعت میں زور ضروریات پر ہے اور اس کے بعد حاجات پر اور تحسینیات کی اجازت ہے، بعض حدود کے اندر۔ اُن کے ہاں یہ ترتیب اُلٹی ہے، اصل زور ''تحسینیات'' پر ہے، جتنی تحسینیات اِنسان حاصل کر سکتا ہے وہ حاصل کرے، چاہے دوسروں کی حاجات اُس سے قربان ہو جائیں، دوسروں کی ضروریات اُس کے نتیجے میں مجروح ہو جائیں، وہ اپنی اِن خواہشات کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کو معلوم ہے کہ سوڈان میں کتنے لوگ بھوکے مر رہے ہیں، اُن کو معلوم ہے کہ کس ملک میں فقر و فاقہ اور غربت ہے، لیکن اِس کے باوجود وہ اپنی تحسینیات جو اُنھوں نے حاصل کی ہیں، اُن کو مزید ترقی دینے کے لئے اور برقرار رکھنے کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مُلکوں کو تباہ کرنا پڑے تو اِس کے لئے آمادہ ہیں۔ قوموں کو تہہ تیغ کرنا پڑے تو وہ تہہ تیغ کرنے کے لئے

۴۔ مختصر ہونے کے باوجود، میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اِتنی مشکل کتاب نہیں ہے۔ بنیادی باتوں کا کم از کم علم تو ہو جاتا ہے۔ مزید پڑھنے پڑھانے کے لئے راستہ بھی مل جاتا ہے کہ کس مسئلے یا موضوع پر مزید پڑھنا چاہئے۔ بنیادی طور پر علما اور متخصصین و محققین کے لئے ہی کتاب لکھی گئی تھی۔ حسن عسکری مرحوم زبردست کارنامہ سرانجام دے گئے۔ اللہ رب العزت اُن کے اِس کام کو قبول فرمائیں۔ آمین!

آمادہ ہیں۔ یہ اُن کی مزاج کا حصّہ ہے اور یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ اُن کی کتابوں میں، تحریروں میں روز شائع ہوتی ہے۔ مادّیت پر زور دینے کی وجہ سے جو مغربی تہذیب اور ثقافت کا رنگ ہے، اُٹھان ہے، وہ رنگ اور آواز کی بنیاد پر ہے۔ رنگ پر زور اور آواز پر زور۔ اِس رنگ کے پیچھے کیا ہے؟ اِس آواز میں کیا کہا جا رہے؟ اِس آواز کے کیا نتائج نکل رہے ہیں؟ وہ آواز کہاں سے آرہی ہے یہ اُن کی دِل چسپی کا میدان نہیں ہے۔ ہمارے آپ کے اِسی ملککے سب سے بڑے مفکر اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مغربی اثرات کے بعد سے، ۱۸۵۷ء کے بعد سے آج تک دُنیاے اِسلام نے اِتنا بالغ نظر مفکّر پیدا نہیں کیا، جس نے مغربی تہذیب پر اِتنی گہری نظر سے گرفت کی ہو۔ اِقبالؒ نے ایک جگہ لکھا ہے:

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
کہ بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ

یعنی وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ رنگ اور آواز جس پر ساری تہذیب کی اُٹھان ہو رہی ہے، وہ کیا ہے؟ بہت خوب صورت ہو گئے تو طاؤس ہو جاؤ گے، بہت اچھی آواز ہو گئی تو بلبل ہو جاؤ گے، تو کیا بلبل اور طاؤس کی تقلید کرنا ہی مقصود ہے؟ یہ تو وہ چیزیں ہیں جس پر کم لوگ غور کرتے ہیں۔ اِس لئِے کہ جو تیسری چیز ہے جو میں نے کہا تھا تجربی علوم، اُن کی چکاچوند نے بہت سے لوگوں کی نظروں کو دھُندلا دِیا۔ اور مغربی علوم وفنون سے دِل چسپی رکھنے والوں کی بڑی تعداد وہ ہے جو تجربی علوم کی کامیابیوں کی روشنی میں یہ چاہتی ہے کہ لوگوں کی فکری اور جو تعلیمی افکار ہیں یا تہذیبی اور ثقافتی انداز ہے، اُس سے صرفِ نظر کرلیں۔ بہت سے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کے تجربی علوم سے اِستفادہ کرنے میں کوئی ہرج نہیں، اُن کی گُم راہیوں سے اگر احتراز کیا جائے اور صرف تجربی علوم کو سامنے رکھا جائے، تو یہ ہمارے لیے مفید ہے۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ ایسا ہونا چاہئے لیکن یہ اِنتہائی نازک اور بڑی بھاری ذِمے داری کا کام ہے، اِس لئے کہ جن کو خالص تجربی علوم کہا جارہا ہے ان میں بھی بہت سی چیزیں ملی جُلی ہیں۔ ان میں بھی ان فکریات کا غُبار موجود ہے، اُس

لادینی تصور کی پرچھائیاں موجود ہیں، جس نے ساری گمراہیاں پیدا کی ہیں۔ اِن گمراہیوں سے واقفیت، یہ عصری تعلیم کا مقصد ہونا چاہئے۔ عصری تعلیم کا مقصد کم سے کم میری ناچیز دانست میں یہ نہیں ہے کہ ایک محدث کو علم حدیث سے اُٹھا کر معاشیات کا پروفیسر بنادیا جائے، نہیں! ایک محدث، جب وہ احادیث بیان کرے، جن میں معاشی احکام بیان کیے گئے ہیں تو اُس کو آج کل کی معاشیات سے اگر اتنی واقفیت ہو تو وہ اِن احادیث میں موجود اُصولوں کو آج کی معاشی زبان میں دُنیا کے سامنے بیان کر سکے تو وہ زیادہ مؤثر انداز میں، پیغمبرانہ رہنمائی کو عامۃ الناس تک پہنچا سکے گا۔

دینی تعلیم میں نے عرض کیا کہ پاکستان بننے کے بعد اِس کے مقاصد اور اہداف کا تعین ضروری تھا۔ ہمارے ہاں دینی تعلیم بڑے پیمانے پر مدارس میں ہورہی ہے۔ کسی حد تک سرکاری جامعات اور یونیورسٹیز میں ہورہی ہے۔ اور بعض مختصر متفرق ادارے ہیں، جو بعض حضرات نے قائم کر کیے ہیں، جن میں اُن کے اپنے خیالات اور فہم کے مطابق دینی تعلیم دی جارہی ہے۔ یہ آخری چوں کہ بہت محدود ہے، اِس لئے اِن کا میں ذِکر نہیں کرتا۔ بڑے میدان یہی دو ہیں دینی تعلیم کے۔ مدارِس کی تین مختلف قسمیں ہیں اور تین مختلف سطحیں بھی ہیں، تین مختلف نوعیتیں بھی ہیں۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں، ابتدائی مدارِس بھی ہیں، متوسِّط ہیں، جن میں متوسّط تعلیم درسِ نظامی کی ہورہی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ادارے بھی ہیں، جہاں تخصص ہورہا ہے اور بہت سے دوسرے کام ہورہے ہیں۔ اِسی طرح نوعیتوں میں بعض مکمل روایتی نوعیت کے ادارے ہیں، جن میں بڑی تعداد کا تعلق بلوچستان اور صوبہ سرحد سے ہے، کچھ نیم روایتی قسم کے ادارے ہیں کہ جن میں سے پنجاب اور سندھ کے اکثر مدارِس کا تعلق ہے اور بعض اِصلاح شدہ ادارے ہیں، جنھوں نے بہت بڑی تبدیلیاں اپنے نظام میں متعارف کرائی ہیں، جن سے آپ بھی واقف ہیں۔

یہ سمجھنا کہ درسِ نظامی جو ہم پڑھا رہے ہیں، مکمل درسِ نظامی ہے، درست نہیں ہے۔ درسِ نظامی کی تاریخ اگر آپ کے سامنے ہو تو آپ اس بات سے اتفاق

کریں گے کہ اب درسِ نظامی کا صرف نام باقی ہے۔اصل درسِ نظامی اب باقی نہیں رہا۔ درسِ نظامی میں بہت سارے مضامین جو شامل تھے وہ تو بالکلیہ اب نکل گئے، اب ریاضی شامل نہیں، اُقلیدس یا جیومیٹری شامل نہیں، فارسی شامل نہیں، اُس زمانے میں فارسی کا حصہ عربی سے بہت زیادہ تھا، جو درسِ نظامی مکمل کر کے نکلتا تھا، وہ فارسی کا بہت اچھا ادیب ہوتا تھا، شاعر بھی ہوتا تھا، نثر نگار بھی ہوتا تھا، وہ حصہ اب ختم ہو گیا، طب کا پورا حصّہ نکل گیا۔ یہ تو وہ علوم ہیں جو درسِ نظامی سے بالکلیہ طور پہ نکل گئے۔ جزوی طور پر منطق کی بہت سی کتابیں نکل گئیں۔ صوبہ سرحد اور افغانستان میں بعض کتب ابھی تک ہیں۔ پنجاب اور سندھ اور ہندوستان کے اکثر علاقوں میں نہیں ہیں۔ بنگلہ دیش میں نہیں ہیں۔ اِسی طرح سے قدیم فلسفے کی بہت سی کتابیں جو ایران میں ابھی تک پڑھائی جارہی ہیں، افغانستان میں پڑھائی جارہی ہیں، صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں پڑھائی جارہی ہیں، وہ اب ملک کے اکثر علاقوں میں نہیں ہیں۔ پھر درسِ نظامی میں مُلّا نظام الدین سہالوی کے زمانے میں حدیث شریف نہیں تھی۔ بعض بعض لوگ ''مشارق الانوار'' پڑھایا کرتے تھے۔ کہیں کہیں ''مشکوٰۃ'' شریف کے بعض ابواب تھے، ورنہ حدیث بہ طور فن کے شامل نہیں تھی، یہ دارالعلوم دیوبند نے پہلی مرتبہ شامل کی۔

اِن مثالوں سے جن میں اور اِضافہ بھی ہو سکتا ہے، میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ درسِ نظامی مکمل اور اصلی شکل میں دارالعلوم دیوبند میں پہلے دِن سے نہ تھا۔ لہٰذا درسِ نظامی کی دُہائی اور درسِ نظامی کو اکابر کا طریقہ اور بزرگوں کا طریقہ اور برکت وغیرہ قرار دینا درست نہیں، میں اِن باتوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ اگر برکت ہے تو فقط اللہ کی کتاب میں ہے، اور اُس کے رسول ﷺ کی سُنّت میں ہے یا اصحاب رسول ؓ، تابعین اور تبع تابعین کے اِرشادات اور اقوال میں ہے، باقی کسی ایرانی فلسفی یا شیعہ فلسفی کی باتوں میں کوئی برکت نہیں ہے۔ منطق و فلسفے کی بے شمار کتابیں شیعوں کی لکھی ہوئی ہیں، اُن میں کوئی برکت نہیں۔ اُس زمانے کی عصری ضروریات کے تحت اس وقت کے علما نے ان کو پڑھنا پڑھانا ضروری سمجھا، جب وہ

ضروریات ختم ہو گئیں، تو وہ چیزیں تاریخ کا حصّہ بن گئیں۔ آج اُن کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کی تفصیل بیان کروں گا تو بات لمبی ہو جائے گی کہ فلسفے کی کتابیں اس نصاب میں کیسے شامل کی گئیں۔ اِس کی ایک تاریخ ہے۔ پھر ان میں تبدیلی آتی گئی، حالات کے ساتھ ساتھ، وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آئی۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ سنٹرل ایشیا کی کتابیں، سمرقند اور بخارا کے علاقے کی کتب، مثلاً علّامہ تفتازانی اور سیّد شریف جرجانی کی تصانیف درس نظامی کا حصہ بن گئیں۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ ایرانی مصنفین کی کتابیں شامل ہو گئیں، ہمایوں وہاں (ایران) سے مدد لے کے آیا اور دوبارہ مغل سلطنت قائم ہوئی، تو انھوں نے طے کیا کہ اپنے ساتھ ہمارے اتنے علما کو بھی لے کر جانا ہو گا، چناں چہ ایرانی علما پہلی مرتبہ ایران سے ہمایوں کے ساتھ آئے، (۵) اور جگہ جگہ دَرس کے حلقے انھوں نے قائم کیے اور پہلی مرتبہ ہمایوں کی دوبارہ حکومت میں آنے کے بعد ایرانی مصنفین کی کتابیں فلسفے اور منطق کے میدان میں درس نظامی میں شامل ہوئیں۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ مُلّا صدرا اپنے زمانے کے سب سے بڑی فلسفی تھے، شیعہ تھے، بہت بڑے شیعہ تھے، شیعہ اُصول وعقائد پر اُن کی کتابیں ویسی ہی ہیں جیسے کسی بھی شیعہ آیت اللہ کی کتابیں ہوتی ہیں۔ لیکن چوں کہ فلسفی بہت بڑے تھے، اِس لئے اُن کی بعض کتابیں شامل کی گئیں۔ مُلّا صدرا کے نام سے جو کتاب ہے، ان ہی کی ہے۔ مُلّا صدرا اِن کا لقب تھا، نام تھا صدرالدین شیرازی۔ اِس لئے ہر زمانے میں جن جن چیزوں کی ضرورت سمجھی گئی درس نظامی میں اُن کو شامل کیا جاتا جارہا، اور جن چیزوں کی ضرورت کے بارے میں احساس ہوا کہ اب ضرورت نہیں رہی، وہ نکالی جاتی رہیں۔ درسِ نظامی کی تاریخ کو اگر دیکھا جائے تو یہ تمام چیزیں سامنے آجائیں گی۔

۵۔ خاص مغل حکمرانوں کے ہاں تو ایرانی علما پہلی بار ہمایوں کے ساتھ آئے تھے، مگر دکن کی ریاستوں میں ایران کے شیعی علما کی آمدورفت تو ظہیرالدین محمد بابرُ بادشاہ کی فتح اور آلِ تیمور (مغلوں) کی سلطنت کے قیام سے بہت عرصے پیشتر سے جاری تھی۔

(حواشی وتعلیقات: م۔ ص۔ ف۔ رفعت)

آج پاکستان میں ہمیں دِینی تعلیم کی کیوں ضرورت ہے؟ ہمیں دِینی تعلیم کی ضرورت ہے مسجدیں سنبھالنے کے لئے۔ اِس وقت پاکستان میں تقریباً چار لاکھ مسجدیں ہیں۔ جب میں وزارتِ مذہبی اُمور سے وابستہ تھا تو میں نے ایک سروے کروایا تھا تو اُس وقت پاکستان میں تین لاکھ اسّی ہزار مساجد تھیں، اب دس سال ہو گئے ہیں، ممکن ہے بیس ہزار، تیس ہزار اور بڑھ گئی ہوں۔ اِن تین لاکھ اسّی ہزار میں سے یا چار لاکھ مساجد میں سے ستّر فی صد سے زائد مساجد وہ تھیں، جن کے ائمہ کے پاس کوئی تعلیم نہیں تھی، کچھ پڑھے لکھے ہوئے نہیں تھے، صرف قرآن پاک کی چند سورتیں یاد تھیں۔ بڑے شہروں میں چند فی صد مساجد تھیں، جن کے ائمہ باقاعدہ تعلیم یافتہ تھے۔ اب یہ ایک ایسی ذِمے داری ہے جو یا تو حکومت انجام دے، حکومت نے کیا کوشش کی ہے؟ گفت گو لمبی ہو جائے گی، پھر غیبت بھی ہو گی بلا وجہ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ حکومت نے کچھ نہیں کیا بہ ظاہر آئندہ بھی اُمید نہیں ہے کہ حکومت کچھ کرے گی۔ اِن چار لاکھ کی تعداد میں موجود مساجد کے لئے جن کی تعداد میں روز اِضافہ ہو رہا ہے، ائمہ کی تیاری، دِینی مدارِس کی ایک بنیادی ذِمے داری ہے۔ مسلم معاشرے کا بنیادی فریضہ ہے، مسجدوں کا اہتمام اور اقامت صلوٰۃ۔

لیکن اگر آپ اِن چار لاکھ مساجد کے لئے ائمہ تیار کرنا چاہتے ہیں تو اِس اِمام کو شرح مطالع پڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ شرح مطالع پڑھ کے وہ اِمام کیا کرے گا؟ آپ اُس کو گلبرگ کی مسجد میں جب اِمام بنا کے بھیجیں گے تو پوری زندگی ۵۰ سال اُس سے کوئی نہیں پوچھے گا کہ جزءلایتجزی کے بارے میں فلاسفہ اِسلام کی رائے کیا ہے؟ کوئی نہیں پوچھے گا! اور اگر وہ بیان کرے گا تو لوگ کہیں گے کہ پتہ نہیں یہ مولوی صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟ جو سوالات گلبرگ کے لوگ اُس سے پوچھیں گے وہ اُس نے پڑھے نہیں ہوں گے، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اچھا اِمام تیار نہیں ہو رہا ہے۔ آپ ایک ایسے شخص کو جو اِمامت کرنا چاہتا ہے غیر ضروری طور پر اُس پر بوجھ لاد رہے ہیں، مدرسے کے وسائل ضائع ہو رہے ہیں، اساتذہ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ وہ اِس میں نہ دِل چسپی رکھتا ہے، نہ اُس میں اہلیت ہے۔ وہ اِمامت کرنا

چاہتا ہے۔ امامت کے لئے ضروری ہے کہ وہ حافظِ قرآن ہو، قاری ہو، سبعہ کا ہو تو بہت ہے، بہ قدرِ ضرورت عربی جانتا ہو، قرآن پاک کا ترجمہ پڑھا ہو، تفسیر کی دو ایک کتابیں پڑھی ہوں، حدیث جانتا ہو، روزمرہ کے فقہی مسائل سے واقف ہو اور معاشرے کے عام مسائل، جو لوگ پوچھتے ہیں، وہ جانتا ہو، اگر اِتنا علم ہو جو میرے خیال میں مدرسے میں داخل ہونے کے بعد تین سال میں حاصل ہو سکتا ہے، تو ایسے شخص کے لئے کافی ہے، اور وہ ایک اچھا امام ثابت ہو سکتا ہے۔ اب جو شخص تین سال میں یہ علم حاصل کرنے کے بعد اِمامت کی ذِمے داریاں اچھی طرح نبھا سکتا ہے، آپ اُس کو سلم العلوم اور مسلم الثبوت کیوں پڑھانا چاہتے ہیں؟ اُسے آپ یہ کیوں رٹواتے ہیں الکلمۃ لفظ وضع لمعنی مفرد، مفرداً مفرد۔

ایک جگہ یونیورسٹی میں بات ہوئی، تو میں نے کہا کہ ہمارے ہاں مدرسوں میں قواعد و ضوابط اور نحو و گرائمر پر اِس طرح زور دیتے ہیں، میں نے یہ مثال دے کے بتائی۔ میں نے یہ کہا کہ پہلے کافیہ کو رٹتا ہے، کافیہ کے بعد وہ شرح جامی میں اِسی مسئلے پر اُلجھا رہتا ہے، پھر ہمارے پٹھان بھائیوں کو تحریر سنبٹ، سوال کابلی اور سوال باسولی بھی یاد کرنا ہوتا ہے۔ اُن سب میں یہی مسائل زیرِ بحث آتے ہیں۔ اِس کے بعد، یہ سارے مسائل یاد کرنے کے بعد، وہ پشاور میں کسی مسجد میں امام ہو جاتا ہے، پھر پوری زندگی میں اُس سے نہ کوئی ''تحریر سنبٹ'' پوچھتا ہے، نہ ''سوال باسولی'' نہ ''سوال کابلی''، تو اُس سے پوچھیں کہ بھائی تو نے کیوں یہ وقت ضائع کیا اپنا؟ اپنے اساتذہ کا ضائع کیا؟ مدرسے کا ضائع کیا۔ اِس لئے ایک سطح یہ ہونی چاہیے، جس کا ابھی ذکر کیا، اور اُس کو بہ قدرِ ضرورت آج کل کی سوشل اسٹڈیز (Social Studies) سے واقفیت ہونی چاہئے۔ پاکستان کے مسائل سے تھوڑی سی واقفیت اور اگر جیسا کہ میں نے سنا، یہ درست ہے کہ مدارِس میں داخلہ میٹرک کے بعد ہونے لگا ہے، تو میٹرک میں جتنا علم آج کل کے لحاظ سے آتا ہے وہ کافی ہے۔ اب اِس کی ایک بنیاد موجود ہے، اب اپنے طور پہ وہ مزید امتحانات کی تیاری کرنا چاہتا ہے تو وہ کرلے گا۔ یہ ایک ذِمے داری ہے جو مدارِس یا دِینی تعلیم کے اداروں کے پیشِ نظر

ہونی چاہئے۔

دوسری ذِمے داری یہ ہے کہ ہمارے پاکستان کے ہر تعلیمی ادارے میں بہ شمول ابتدائی دِینی مدارس، اسلامیات اور دِینیات کے معلّمین در کار ہیں۔ اسلامیات اور دِینیات کے معلّمین کا کام یہ ہے کہ وہ سرکاری اسکولوں میں، سرکاری کالجوں میں اور ابتدائی دِینی مدارِس میں طلبہ کو ابتدائی دِینی تعلیم دیں۔ اب جو شخص اِبتدائی دِینی مدارِس میں دِینی تعلیم دے گا یا سرکاری اسکولوں میں اسلامیت یا عربی پڑھائے گا، اُسے کوئی ضرورت اِس بات کی نہیں ہے کہ وہ اِس بحث میں پڑے کہ ایمان میں کمی بیشی کے بارے میں امام بخاریؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے درمیان اگر کوئی اختلافِ رائے ہے تو وہ کیا ہے؟ نہ طالب علم یہ پوچھے گا کہ سر! ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے کہ نہیں ہوتی؟ اور نہ اُستاد بتائے گا، جو طالبِ علم سمجھ ہی سکے گا۔ اِس لئے ایک ایسے شخص کے لئے جس کو اسکول میں ٹیچری کرنی ہے یہ مسائل غیر ضروری ہیں۔ اِس کے لئے کچھ اَور نصاب چار، پانچ سال ہونا چاہئے۔ اُس کے بعد ضرورت ہے کہ خود اِن دِینی مدارِس میں اعلیٰ مدرسین درکار ہیں۔ اِن اعلیٰ مدرسین کے لئے اعلیٰ تعلیم ہونی چاہئے، جس میں درسِ نظامی بھی ہو اور بھی بہت کچھ ہو، پھر اعلیٰ مدرسین کے بعد محققین کی تیاری ضروری ہے۔ ایسا محقق جو اپنے زمانے کا سیّد سلیمان ندویؒ ہو۔ کراچی میں میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ آپ کے پاس ایک تقی عثمانی ہے، میں چاہتا ہوں کہ پاکستان میں ہزاروں تقی عثمانی ہوں۔ اگر ہمارے پاس ایک تقی عثمانی کے بہ جائے دس ہزار تقی عثمانی یا کم از کم دس ہزار نہ ہوتے، ایک ہزار بھی ہوتے تو آج پاکستان کا نقشہ اَور ہوتا۔ میں نے اُن کو بہت قریب سے دیکھا ہے، میں اُن کے ساتھ کمیٹیوں میں رہا ہوں، مختلف جگہ، پچھلے بیس پچیس سال سے ایک ساتھ مختلف مواقع پر کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ ایک آدمی اپنے علم سے اور فکر سے اور اپنی واقفیت سے اگر اتنے اثرات پیدا کر سکتا ہے، تو اِس طرح کے اگر ہزاروں افراد ہمارے پاس ہوتے تو وہ مل کر کتنے اثرات پیدا کرتے۔ ہندوستان میں ایک مولانا ابوالحسن علی ندویؒ تھے، علی میاں، انھوں نے اپنی عربی دانی سے اور دُنیا کی واقفیت سے پوری

عرب دُنیا کے ہر آدمی کو متاثر کیا۔ میں اپنے ذاتی تجربے اور واقفیت کی بنیاد پر عرض کرتا ہوں کہ عرب دنیا میں مراکش سے لے کر قطر تک اور شام سے کی سرحدوں سے سوڈان کے جنوب تک شاید کوئی تعلیم یافتہ، دِین دار آدمی ایسا نہ ہے جو مولانا علی میاں کی تحریروں اور خیالات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ پھر علی میاں کے خیالات اور تحریروں کے ذریعے برِّ صغیر کے بڑے بڑے اہل علم کے خیالات، دُنیائے عرب تک پہنچے ہیں۔ اِس طرح کے افراد اِس ملک کی ضرورت ہیں کہ نہیں؟

اگر اِس ملک کو اِسلامی دُنیا کی قیادت کرنی ہے، اگر اِس ملک میں شریعت کا قانون بننا ہے، اگر اِس ملک میں پوری زندگی کی تشکیل نو شریعت کی بنیاد پر ہونی ہے تو ایسے لوگ درکار ہیں جو اِس دَور کے تقاضوں کو جانتے ہوں، جو قانون سے واقف ہوں۔ جن علوم و فنون کی عصری علوم و فنون میں سے ضرورت ہے، وہ دو طرح کے ہیں اگر درسِ نظامی میں داخلہ میٹرک کے ہو رہا ہے تو اتنی بنیاد کافی ہے کہ اِتنی ریاضی، اتنی جنرل سائنس انہیں آتی ہو، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ اگر کہیں گنجائش ہو یا کوئی چاہے تو مزید ایک دو سال آپ اُس کو تھوڑی سی ریاضی اَور پڑھادیں۔ ایف اے تک پڑھادیں، لیکن دِینی تعلیم یا دِینی تخصصات کے لئے اُس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جن تخصصات کی ضرورت ہے، وہ قانون، معاشیات اور اجتماعی علوم کا ایک عمومی مطالعہ ہے۔ ملکی قانون سے جب تک واقفیت نہ ہو، جس پر پورے ملک کا نظام چل رہا ہے، اُس وقت تک اِس نظام کو بدل کر شریعت کے مطابق بنانا آسان کام نہیں ہے۔ میں آپ سے عرض کروں، میں دو مرتبہ اِسلامی نظریاتی کونسل کا رکن رہا ہوں۔ اِسلامی نظریاتی کونسل کی ذِمّے داریوں میں یہ بھی لکھا ہے، اور یہ دستورِ پاکستان میں لکھا ہوا ہے کہ پاکستان کے تمام رائج الوقت قوانین کا جائزہ لے کر اُن کو شریعت کے مطابق بنایا جائے اور کونسل ان قوانین کو شریعت کے مطابق بنا کر اپنی سفارشات پارلیمنٹ کو پیش کرے۔ رائج الوقت قوانین سے مُراد وہ ہیں جو آج پاکستان میں رائج الوقت ہیں، اُن میں قدیم ترین قانون سترہ سو کچھ عیسوی کا ہے، جب انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے طور پر آئے تھے اور بنگال کے

ایک علاقے پر قابض ہوئے تھے، اُس وقت انھوں نے وہ قانون بنایا تھا پھر جیسے جیسے ہندوستان پہ قبضہ کرتے گئے وہ قانون وسعت پاتا گیا، اُس وقت سے لے کر آج تک وہ قوانین ایک ایک کرکے نافذ ہورہے ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً ساڑھے پانچ ہزار ہے۔ آج یہ تعداد کتنی ہے مجھے نہیں پتا، جب میں اِسلامی نظریاتی کونسل کا آخری مرتبہ ممبر بنا (۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۱ء تک) اُس وقت ان کی تعداد ساڑھے پانچ ہزار تھی۔ یہ ساڑھے پانچ ہزار قوانین جتنی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں، ان کے لئے شاید اِیک الماری کم پڑے، وہ قوانین زیادہ ہیں۔ اب اِن قوانین کا جائزہ لے کر ان کو شریعت کے مطابق بنانا چاہیے یا نہیں بنانا چاہیے؟ بنانا چاہیے، ان میں یہ طے کرنا چاہئے کہ یہ چیز شریعت کے متعارض ہے اس کو نکال دیا جائے، یہ چیز شریعت سے ہم آہنگ ہے اس کو برقرار رکھا جائے۔ یہاں مزید اِضافے کی ضرورت ہے، وہ اِضافہ کیا جائے۔ یہ ایک بہت لمبا کام ہے۔ اُس وقت سیاسی قائدین نے مطالبہ کیا کہ کام سات سال میں ہو جانا چاہئے۔ چھ سال تو میں ممبر رہا، میں نے بہت وقت بھی صرف کیا لیکن یہ کام اِتنا آسان نہیں ہے، اِس کے لئے افرادِ کار نہیں ملتے۔

میں ایک چھوٹا سا لطیفہ عرض کروں۔ جب میں پہلی مرتبہ کونسل کا رکن مقرر ہوا۔ ۱۹۹۰ء میں تو اُس وقت کے جو چیئرمین تھے جسٹس حنیف صاحب (پاکستان کے چیف جسٹس) انھوں نے مختلف کمیٹیاں بنائیں تو ایک کمیٹی کا چیئرمین مجھے بنادیا، وہ تھی لیگل ریفارمز کمیٹی (Legal Reforms Committee) یعنی قوانین پر نظرِ ثانی کی کمیٹی اور ہمارے ذِمّے یہ کام لگایا کہ یہ کمیٹی اُن تمام قوانین پر نظرِ ثانی کرکے سفارشات مرتب کرے۔ میں ۱۹۹۰ء میں بہت نوجوان بھی تھا، پرجوش بھی زیادہ تھا، تو میں نے کہا کہ میں یہ کام تین سال میں کردوں گا، تو میں نے اپنے وقت کا آدھا حصّہ اِس کام کے لئے رکھا، میں یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا، وہاں بھی میری ذِمے داریاں تھیں، اُس سے فارغ ہونے کے بعد میں نے وہ سارے قوانین اپنے گھر منگوائے۔ ایک کمرہ اُن کے لئے رکھا اور ایک ایک کرکے اس کو پڑھنا شروع کیا۔ بیشتر حصّہ پڑھا اور پڑھنے کے بعد مجھے یہ لگا کہ اِن میں سے خاصا بڑا حصّہ ایسے

قوانین کا ہے جو محض انتظامی نوعیت کے ہیں، ان میں کسی چیز کے شریعت سے متعارض یا غیر متعارض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ٹریفک کے قوانین کہ لال بتی ہو رُک جاؤ، ہری ہو تو چلے جاؤ۔ پہلے دائیں طرف والے کا حق ہے پھر بائیں طرف والے کا ہے۔ وہ نشان ہو یہ مطلب ہے، یہ نشان ہو تو یہ مطلب ہے۔ یہ قوانین شریعت سے متعارض نہیں ہیں بل کہ ایک طرح سے موافق ہی ہیں، کیوں کہ یہ انسانی جان و مال کے تحفظ کے لئے ہیں۔ اِس طرح کے جو خالص انتظامی نوعیت کے قوانین تھے، اُن کی میں فہرست بنائی تو غالباً (اگر مجھے صحیح یاد ہے) ایسے قوانین ہزار کے لگ بھگ تھے۔ کچھ وہ تھے کہ جن میں جزوی تبدیلیاں در کار تھیں۔ اِن جزوی تبدیلیوں کا میں نے جائزہ لیا تو وہ قوانین جن میں جزوی تبدیلیاں در کار تھیں کوئی پچیس، تیس قسم کے احکام شریعت تھے۔ میں نے وہ احکام مرتب کیے، انگریزی میں ان کا ایک مسودہ تیار کیا۔ مثال کے طور پر ہر قانون میں ایک جگہ یہ لکھا ہوتا ہے کہ اگر اِس قانون پر نیک نیتی سے عمل کیا جارہا ہو اور کسی کو نقصان ہو جائے تو ریاست ذِمّے دار نہیں ہے، مثلاً بجلی کا محکمہ ہے، کہیں بجلی کے کھمبے لگا رہا ہے، اُس نے دیانت داری سے یہاں کھمبا لگایا اور اُس کے نتیجے میں کوئی کرنٹ لگ کر مر گیا تو محکمہ بجلی ذِمّے دار نہیں۔ مجھے یہ چیز شریعت سے متعارِض معلوم ہوئی۔ شریعت کا ایک اُصول ہے:

خطاء القاضي في بيت المال

قاضی اگر کوئی غلطی کرے اور اس کے نتیجے میں کوئی غلط بات ہو جائے تو اُس کا تاوان بیت المال سے دِیا جائے گا۔

تو اگر محکمہ بجلی کی غلطی سے کوئی آدمی مر گیا (بے گناہ) تو محکمہ بجلی اُس کی دیت ادا کرے۔ اِس طرح کے کچھ پچیس، تیس احکام تھے، اُن کو میں نے ڈرافٹ کیا۔ میں نے اس سلسلے میں ڈھائی تین سال خوب محنت کی اور باقی ارکان کو بھی تیار کیا۔ کمیٹی کے سب ارکان نے اس مسودے سے اِتفاق کرلیا۔ اِتفاق کرنے کے بعد جب ہم کونسل میں لے گئے تو وہ ایک بزرگ تھے (اِس وقت حیات ہیں)،

انھوں نے کہا میں تو اتفاق نہیں کرتا۔ اچھا، جو بات انھوں نے کہی وہ ایسی تھی کہ سب خاموش ہو گئے، ایک دم سے ایک جملے میں بدل گئے، وہ اُن کے ساتھ ہو گئے کہ نہیں حضرت صحیح کہتے ہیں، انھوں نے کہا کہ ''کسی قانون کے بارے میں حکومت کو یہ رائے دینا کہ یہ شریعت سے متعارض نہیں ہے، یہ بالکل صحیح ہے۔ یہ عند اللہ اور عند الناس گواہی ہے''۔ عند اللہ گواہی تو بہت بڑی چیز ہے، اللہ کے حضور گواہی کہ یہ قانون جو انگریز نے بنایا تھا، میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ تیری شریعت کے خلاف نہیں ہے، اللہ اور رسول ﷺ کی تعلیم کے خلاف نہیں ہے۔ یہ تو عند اللہ اور عند الناس گواہی ہے۔ آپ تو انگریزی جانتے ہیں، آپ گواہی دے سکتے ہیں، میں تو انگریزی نہیں جانتا، لہٰذا یا تو اُن تین ہزار قوانین کا ترجمہ کروا کر مجھے دو، اور میں پڑھ کے خود فیصلہ کروں یا کوئی انگریزی داں بیٹھے اور انگریزی داں میں لے آ کر آؤں گا، وہ دونوں بیٹھ کر مجھے زبانی بتائیں، سارے قانون پڑھ کے ایک ایک لفظ بتائیں، تب ہی ہم فیصلہ کر سکیں گے کہ یہ قوانین شریعت کے مطابق ہیں یا نہیں؟ پھر بقیہ علما نے بھی کہا کہ یہ تو گواہی ہے عند اللہ اور عند الناس بھی، ہم تو، تمہارے کہنے پر نہیں دے سکتے، تم سچے آدمی ہو، مخلص ہو، یہ مانتے ہیں لیکن اللہ کے ہاں جا کر ہم کیسے کہیں کہ ہم نے ایک قانون کو فلاں کے کہنے پر شریعت کے مطابق کہہ دیا تھا۔ ہم تو اپنے عمل کے مکلّف ہیں۔ لہٰذا وہ کام نہیں ہو سکا۔ کاغذات کے انبار میں اس مسودے کا پلندا اسلامی نظریاتی کونسل میں پڑا ہو گا۔

لیکن میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اِس کام کے لئے اُس وقت مجھے خیال ہوا کہ اگر سارے علما، مولانا تقی عثمانی جیسے ہوتے تو آج یہ رُکاوٹ نہ پیدا ہوتی۔ اِس لئے علما کے لئے قانون سے تھوڑی سی واقفیت بھی درکار ہے۔ یہ بات آج تو پاکستان بننے کے باسٹھ سال بعد میں کہہ رہا ہوں۔ آج سے اسّی سال پہلے اُس شخصیت نے جس کے نام پر یہ ادارہ اشرف التحقیق قائم ہوا، انھوں نے یہ لکھا تھا کہ ''میں یہ چاہتا ہوں کہ مدرسے میں تعزیراتِ ہند اور ریلوے اور ڈاک کا قانون پڑھایا جاوے، مگر میری سنتا کون ہے؟''۔ یہ میں نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات میں

پڑھا ہے، اور شاید یہاں موجود بزرگوں میں سے بھی کسی نے پڑھا ہو، یہ انھوں نے لکھا ہے۔ جس چیز کی ضرورت کا احساس حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے آج سے اسّی سال پہلے کیا وہ آج تک پوری نہیں ہوئی۔ پاکستان بننے کے بعد بہ طریق اولیٰ ہونی چاہئے تھی۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کا بنایا ہوا نصاب، مولانا زاہد الراشدی نے مجھے دیا تھا۔ مطبوعہ موجود ہے۔ جس میں انھوں نے یہ دعوت دی ہے کہ جدید قوانین اور انگریزی زبان درسِ نظامی کے مضامین میں شامل ہونے چاہئیں۔ گویا اپنے زمانے کی دو جیّد ترین ایسی شخصیتیں جو دو مختلف ذوقکی ترجمان اور نمائندہ ہیں، انھوں نے اِس ضرورت کا احساس پاکستان بننے سے بہت پہلے کیا۔ اِس لئے قانون سے تھوڑی سی واقفیت ناگزیر ہے۔ قانون سے واقفیت کے لئے میرے ذہن میں یہ ہے کہ ایف اے۔ اور بی اے کی سطح کی شہریت اور پولیٹیکل سائنس(Political Science) پہلے پڑھادی جائے، اگر بچہ میٹرک کر کے آیا ہے تو ایف اے کی شہریت یا سوکس (Civics) میں بنیادی چیزیں پاکستان کے نظام کے بارے میں مل جاتی ہیں۔ پھر سیاسیات پڑھادی جائے، اُس کے بعد پاکستان کے دستور کے بارے میں کچھ لیکچرز دے دیے جائیں۔ اس طرح کچھ کورس ایسا بن جائے گا جو ان ضرورتوں کا احاطہ کرلے اور یہ مشکل نہیں ہے۔ پھر دستور جاننے والا، ایک مہینے میں دِینی مدارِس کے درجہ رابعہ کے طلبہ کو دستورِ پاکستان پڑھا سکتا ہے، جو طالب علم ''ہدایۃ'' پڑھ کے سمجھ سکتا ہے، اُس کے لئے دستورِ پاکستان کیا چیز ہے؟ کچھ نہیں ہے! ایک مہینہ بھی بہت ہے۔ ایک مہینے میں اُس کو پڑھایا جا سکتا ہے کہ یہ دستورِ پاکستان ہے، تاکہ وہ سمجھ سکے کہ پاکستان کا دستوری ڈھانچہ کیا ہے؟

پھر تعزیراتِ پاکستان، ضابطہ فوجداری اور ضابطہ دیوانی، بس اِس کے بعد طالب علم میں ان پانچ لاکھ قوانین کو پڑھنے کی صلاحیت خود ہی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب انہیں طالب علم خود ہی پڑھ لے گا۔ بنیادی قوانین یہی تین چار ہیں۔ معاشیات میں دو، تین اچھے مضامین پڑھ لے، دِینی معاملات کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ اسے معاشیات کا محقق یا ایکسپرٹ بننے کی ضرورت نہیں۔ اِسی طرح سے ایک دو موضوعات ہیں، جن

سے ابتدائی لیکن ناقدانہ واقفیت ہو جانا کافی ہے۔ میں بار بار کہتا ہوں کہ مقلّدانہ واقفیت سے خرابی پیدا ہوتی ہے، مغلوبانہ واقفیت سے خرابی پیدا ہوتی ہے۔ ناقدانہ واقفیت سے خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ ان موضوعات کے علمائے کرام، جو نقصانات بتاتے ہیں وہ اس میں حق بہ جانب ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس طرح اِسلامی تخصصات سے صرفِ نظر ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے پڑھ کر چھوڑ دیا۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پھر مدارِس سے لوگ وابستگی ختم کر دیتے ہیں، اداروں میں، یونیورسٹیوں میں جاکر سرکاری نوکری کر لیتے ہیں۔ اگرچہ میں اِس بات کو زیادہ پسند نہیں کرتا، اگر ایک شخص کو آپ نے اچھی طرح دِین پڑھایا، اُس کو محقق، عالم، فقیہ بنایا، محدث بنایا اور وہ پرائیویٹ ایم اے کر کے پنجاب یونیورسٹی میں استاد ہو گیا تو آپ ہی کا کام کر رہا ہے۔ وہ جو کام یہاں درس گاہ میں بیٹھ کر کرتا ہے، وہ وہاں درس گاہ میں بیٹھ کر کر رہا ہے، تو اِس لئے اِس میں آپ کا نقصان کیا ہے؟ بل کہ فائدہ ہی ہے۔

ہمارے ڈاکٹر سیّد عبداللہ تھے (پنجاب یونیورسٹی کے)، وہ درسِ نظامی پڑھے ہوئے تھے۔ درسِ نظامی پڑھ کے یونیورسٹی میں آئے تو یونیورسٹی کے ماحول میں انھوں داڑھی بھی صاف کر دی، سوٹ بوٹ پہننے لگے لیکن خیالات بالکل وُہی رہے جو پہلے تھے۔ اُن کے اُستاد تھے مولانا احمد علی لاہوریؒ۔ اُن کے بہت عقیدت مند تھے، اُن کے درس میں کبھی کبھی جایا کرتے تھے اور شرم سے کہ اُستاد نہ دیکھیں پیچھے بیٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ اُستاد نے دیکھ لیا، مولانا لاہوری نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آگے آجاؤ، آگے آجاؤ۔ ڈاکٹر صاحب بہت شرما کے، سر نیچا کر کے، ندامت سے آگے بیٹھ گئے۔ داڑھی صاف تھی اور حُلیہ بھی اَور طرح کا تھا، تو ایسے گردن جھکا کے بیٹھ گئے، تو مولانا نے کہا ڈاکٹر صاحب گھبراؤ نہیں، ہم بھی سپاہی ہیں، تم بھی سپاہی ہو۔ فوج کا سپاہی عام حالات میں وردی میں بھی لڑتا ہے اور جب خطرناک حالات میں اُسے بھیجیں تو وردی اُتار کے بھیجتے ہیں، تو آپ وردی کے بغیر سپاہی ہو، خطرناک حالات میں کام کر رہے ہو، اِس لئے گھبراؤ مت۔ ہم وردی والے سپاہی ہیں، آپ بغیر

وردی کے سپاہی ہیں۔

تو اگر آپ کا سپاہی بغیر وردی کے جا کے لڑے گا تو آپ کو خوش آمدید کہنا چاہیے۔ آپ اُس پر بہ جائے ناراض ہونے کے، خوش ہوں!

ایک واقعے کے گواہ مولانا زاہد الراشدی ہیں۔ مولانا زاہد الراشدی صاحب نے، مجھے، صلاح الدین صاحب مرحوم (تکبیر کے ایڈیٹر) کو اور ڈاکٹر سید سلمان ندوی صاحب کو دعوت دی کہ انگلستان آئیں اور وہاں کے بعض مدارس اور دینی تعلیم کے اداروں کو دیکھیں۔ (یہ اگست ۱۹۹۴ء کی بات ہے)۔ چودہ اگست کو میرا، سید سلمان صاحب اور صلاح الدین صاحب کا بی بی سی نے انٹرویو لیا۔ میرا انٹرویو جس نے لیا، وہ ہندوستان کا کوئی ہندو تھا۔ اُس نے کہا کہ پاکستان کے بعض قوانین بڑے مضحکہ خیز ہیں۔ آپ تو بڑے پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں، سمجھ دار معلوم ہوتے ہیں، اور مجھے یہ بھی کسی نے بتایا ہے کہ پاکستان میں قوانین وغیرہ سے آپ کا تعلق رہا ہے، تو آپ کی موجودگی میں، آپ کے ہوتے ہوئے، یہ مضحکہ خیز قوانین کیوں ہیں؟ مجھے معلوم تھا کہ وہ کس قانون کی طرف اشارہ کرے گا، اس لئے میں نے اُس کا ذِکر نہیں کیا۔ وہ فوراً اینٹی قادیانی لا کے بارے میں کہتا، توحید رسالت والے قانون کے بارے میں کہتا، یہ دو مثالیں دیتا، یا پھر حدود ورجم کی مثال دیتا۔ میں نے کہا، دیکھئے کون سا قانون مضحکہ خیز ہے، کون سا نہیں، یہ فیصلہ کرنے کا اُس ملک کے لوگوں کو اختیار ہے، جنھوں نے قانون بنایا ہے۔ اب مثلاً ہندوستان، اِتنی بڑی جمہوریت ہے، دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ میں بہ طور قانون کے طالب علم کے آپ کے ملک کے قوانین کا مطالعہ بھی کرتا رہتا ہوں۔ آپ کے دستور میں جہاں ریاست کے بنیادی فرائض لکھے ہیں، ایک باب میں ریاست کی بنیادی ذِمے داریاں بیان ہوئی ہیں، وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ ریاست گائے کا تحفظ بھی کرے گی۔ تو مجھے یہ بات بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ریاست گائے کا تحفظ کیوں کرے گی، بکری کا کیوں نہیں کرے گی؟ بھینس کا کیوں نہیں کرے گی؟ مرغی کا کیوں نہیں کرے گی؟ یہ سارے جانور انسانوں

کے لئے مفید ہیں۔ تو مجھے یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مجھے اِس کو مضحکہ خیز قرار دینے کا اِس لئے حق نہیں ہے کہ آپ اپنے حالات کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اِس انٹرویو کے بعد ہمیں آکسفورڈ جانا تھا، جہاں ایک بڑا اسلامک سینٹر، مولانا علی میاں نے بنایا تھا، اُس کے ڈائریکٹر آج کل ڈاکٹر فرحان نظامی ہیں، اُن کے والد تھے خلیق احمد نظامی، جو بڑے، صفِ اوّل کے مورخین میں تھے۔ ایک زمانے میں شام میں ہندوستان کے سفیر بھی رہے۔ انھوں نے بھی وہ انٹرویو سنا اور میرے اِس جواب سے بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ بھائی، یہ تو بڑا اچھا جواب دیا۔ بیٹے نے کہا یہی تو ہیں جو شام کو آپ سے ملنے آرہے ہیں۔ اُن کے ذہن میں تھا کہ کوئی جبّہ، دستار، قبا، لمبی ڈاڑھی، شیروانی، پگڑی، اِس طرح کا میرا حلیہ ہوگا۔ جب میں داخل ہوا تو انگریزی لباس پہنا ہوا تھا، دیکھ کر کہا اچھا آپ ہیں محمود غازی! میں نے کہا، جی ہاں۔ خوب گلے ملے، اِدھر بوسہ دیا، اُدھر بوسہ دیا۔ پھر گلے میں ہاتھ ڈال کر اندر کمرے میں لے گئے۔ کہنے لگے کہ میاں یہ جو تھوڑے سے بال ہیں نا، ان کو بھی صاف کردو۔ میں نے انہیں کچھ حیرت سے دیکھا۔ کہنے لگے کہ دیکھو بھئی بات یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں علما کی اور مشائخ کی کمی نہیں۔ اب حضرت علی میاں ہیں (اُس وقت حیات تھے)، تم اُن سے تو نہیں بڑھ سکتے، علی میاں کافی ہیں، اُن جیسے اَور بھی ہیں، ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی ہیں۔ ایسے لوگ تو کافی ہیں، ہمیں اور طرح کے لوگ چاہئیں۔ وہ ایسے ہوں کہ تمہاری طرح انگریزی بہت روانی سے بولتے ہوں،، سوٹ بوٹ پہنتے ہوں، کلین شیو ہوں، ڈاڑھی نہ ہو، باہر سے بالکل انگریز لگیں، اندر سے جن سنگھی مسلمان ہوں۔

جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آج ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی آدمی اچھا پکا آپ نے بنادیا اور وہ اندر سے جن سنگھی مسلمان ہے، باہر سے انگریز لگتا ہے، تو آپ کا کیا نقصان ہے؟ لگنے دیجئے۔ اِس لئے میں ذاتی طَور پر اِس سے متاثر نہیں ہوتا کہ جی فلاں نے مدرسے میں پڑھا تھا، جا کر کالج میں لگ گیا۔ لگ گیا، تو اچھا کیا! کالج میں وُہی بات پڑھاتا ہے، جو اس نے مدرسے میں پڑھی ہے۔

اِس لئے یہ جو اعتراضات علمائے کرام کے ہیں، میرے خیال میں یہ ماضی میں پہلے تھے، اب زیادہ نہیں ہیں اور دراصل اِس لئے پیدا ہوئے کہ جن لوگوں نے جدید تعلیم پائی، انھوں نے اُن مقاصد کے لئے نہیں پائی اور اُس انداز سے نہیں پائی جن مقاصد کے لئے اور جس انداز کی مطلوب تھی۔ دینی علوم میں اُن کا مطالعہ محققانہ اور مجتہدانہ نہیں تھا۔ وہاں بھی مقلدانہ تھا اور جب انگریزی تعلیم میں گئے تو وہاں بھی مقلدانہ تھا۔ تو ایک زندہ مقلد کی تقلید، مجتہد کی تقلید اور مردہ مجتہد کی تقلید میں تو فرق ہوتا ہے۔ ہمارے شیعہ لوگ کہتے ہیں کہ زندہ مجتہد کی تقلید افضل ہے۔

عصری تعلیم کے تقاضے جو میرے ذہن میں ہیں، وہ یہ ہیں، لیکن اِس کے لئے ضروری ہے کہ خود دینی تعلیم کے نصاب پر ٹھوس نظر ثانی ہو۔ نظر ثانی اِس اعتبار سے کہ جو محققین ہیں، اُن کے لئے تیاری درکار ہے، جو اعلیٰ مدرسین ہیں، یہاں، مثلاً ہدایہ پڑھانے کے لئے، ایک اچھا مدرّس درکار ہے۔ جو بہت بڑا فقیہ بھی ہو اور جب ہدایہ وہ پڑھائے تو آج کل کے معاشی مسائل سے اُس کو ریلیٹ (relate) بھی کرسکے۔ جہاں مضاربہ کی بحث ہو تو بینکاری سے بھی واقف ہو۔ بینکاری میں جس طرح سے مضاربہ سے کام لیا جاتا ہے، یا لیا جاسکتا ہے، یا لیا جانا چاہئے، اُس سے واقف ہو، تاکہ وہ طلبہ کو اس کے لئے تیار کرسکے۔ اِس کے بعد جو حضرات ابتدائی مدرِّس ہونا چاہیں یا اسکولوں میں جانا چاہیں، یا امام مسجد ہونا چاہیں، اُن کے لئے دیکھنا چاہئے کہ اُن کے تقاضے کیا ہیں اور ان کو کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ اُس کے لحاظ سے ایک امام مسجد کے لئے نصاب ہونا چاہئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ موجود آٹھ سالہ نصاب اِن تمام ضروریات کے لئے شاید ناکافی ہے، تھوڑی سی اصلاحات کے بعد ابتدائی معلم کے لئے کافی ہے۔ امام مسجد کے لئے اِتنے لمبے نصاب کی ضرورت نہیں ہے۔ میٹرک کے بعد تین سال، اڑھائی سال، چار سال کافی ہیں، بہ شرطے کہ اس نے حفظ القرآن کیا ہوا ہو اور قرآت سبعہ پڑھی ہو۔ یہ بات کہ جو آدمی امامت کرتا ہے وہ قرآن پاک کا حافظ نہ ہو، امام ہو قرآت سبعہ نہ جانتا ہو، بڑی نامناسب ہے۔

مجھے آج سے تقریباً پچیس سال پہلے جامعہ الازہر جانے کا موقع ملا۔ میں کئی ہفتے وہاں رہا۔ کافی لوگوں سے تبادلہ خیال ہوا، اُس زمانے میں (یہ بات ہے ۱۹۸۸ء کی غالباً یا ۱۹۸۷ء کی) انھوں نے یہ بتایا تھا کہ جامعہ الازہر کے ماتحت پورے مصر میں مساجد یا مدارس قائم ہیں، اُن کو آپ مدارس کا ایک طرح سے مشابہ کہہ سکتے ہیں اور یہ پورے مصر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اُس وقت اِن معاہد میں طلبہ کی تعداد پندرہ لاکھ تھی۔ پورے مصر میں پندرہ لاکھ طلبہ جامعہ ازہر میں تعلیم پارہے تھے۔ اِن معاہدِ ازہر میں سب سے اوّل درجہ کتاب (یعنی حفظ قرآن کے مکتب کا)، اُس کے بعد، حفظ کرنے کے بعد پرائمری جس میں دینی تعلیم کا بڑا بنیادی حصّہ تھا۔ اُس کے بعد ایف اے تک یہاں تعلیم ہوتی تھی، ایف اے کے بعد جامعہ ازہر میں جس کو آپ ایف اے کے برابر کہہ سکتے ہیں۔ اُس وقت یہ ساڑھے پندرہ لاکھ طلبہ اور جامعہ ازہر کے تقریباً سوا تین لاکھ طلبہ، یہ سب کے سب حافظ تھے۔ اُن میں کوئی بھی غیر حافظ نہیں تھا۔ انھوں نے اِس کا انتظام کیا تھا۔ تو اگر یہ انتظام مصر میں ہو سکتا ہے تو ہمارے ہاں بھی یہ ہو سکتا ہے۔ کم از کم اُن لوگوں کے لئے تو ہو سکتا ہے جو امامت کرنا چاہیں۔

اب یہ بات کہ مسجد موجود ہے، وہاں رمضان میں امام کی تلاش ہو رہی ہے، حافظ نہیں مل رہا۔ یہ بات افسوس ناک ہے۔ پاکستان میں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس کو مستقبل میں امام بننا ہے اُس کو منطق وغیرہ اور آٹھ سال پڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک بات عرض کرنا چاہوں گا، سوالیہ انداز میں۔ وہ یہ کہ جس بچے نے مستقبل میں دکان پر بیٹھنا ہے، ملازمت کرنی ہے، اُس کو میٹرک تک دس دس سال تک پڑھانا کیوں ضروری ہے؟ میٹرک تک دس سال پڑھانا اِس لئے ضروری ہے کہ میٹرک تک وہ بنیادی مضامین پڑھائے جاتے ہیں، جن کی ایک عام آدمی کو معاشرے میں ضرورت ہوتی ہے۔ آج ایک چھاد کان دار بننے کے لئے، اچھا تاجر بننے کے لئے، سمجھ دار تاجر بننے کے لئے، کچھ بنیادی معلومات حساب کی، ریاضی کی، لکھنے پڑھنے کی، نوشت و خواند کی، ابتدائی دینی مسائل، ابتدائی اُردو درکار ہیں۔ یہ بات کہ جو چیزیں دس سال میں پڑھاتے ہیں، آپ اُن کو پانچ سال

میں پڑھادیں، وہ الگ بات ہے۔ اگرچہ میرا خیال یہ ہے کہ مدارِس میں سرکاری اسکولوں میں جو کچھ دس سال میں پڑھایا جاتا ہے، اِس سے کم میں پڑھایا جاسکتا ہے۔ اِس لئے کہ وہاں کا نظام ایسا ہے کہ بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔ وہ الگ مسئلہ ہے۔ آپ ان چیزوں کو دس کے بجائے سات میں پڑھادیں، آٹھ میں پڑھادیں۔ لیکن وہ چیزیں ایسی ہیں کہ پورے معاشرے میں یکسانیت پیدا کرتی ہیں۔ ایک سطح پیدا کرتی ہیں۔ پورے معاشرے میں ایک فکری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اِس کا نتیجہ یہ نہیں نکلتا کہ جو یہاں سے محدث بن کے نکلے اُس کی بات سمجھنے والا اُس کے مدرسے کی چار دیواری کے باہر کوئی نہ ہو۔ اِس کی وجہ یہ ہو گی کہ دونوں نے ایک سطح تک مشترک تعلیم پائی ہو گی، اُن کو پتہ ہو گا کہ اُس کی بنیادی تعلیم کیا ہے، اور میری بنیادی تعلیم کیا ہے۔ اِس لئے پاکستان میں یک جہتی کی خاطر، پاکستان میں افکارِ وحدت کی خاطر، یہ ضروری ہے کہ ایک سطح تک تعلیم مشترک ہو اور وہ سطح موزوں، میٹرک کی معلوم ہوتی ہے۔ اُس کے بعد طالب علم جو تخصص کے لئے آئے وہ دینی مدارِس میں آئے اور جو کہیں اَور جائے، وہ کہیں اَور جائے۔

وما علینا الا البلاغ

مسلمانوں کی تعلیمی روایت اور عصر حاضر

ادارۂ خیر المعارف ملتان کے افتتاح کے موقع پر خطاب

مسلمانوں کی تعلیمی روایت اور عصر حاضر

برادران گرامی

علمائے کرام!

سب سے پہلے میں دل کی گہرائیوں سے ادارہ خیر المعارف کے کارکنان، منتظمین، طلبہ واساتذہ کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں جنہوں نے خیروبرکت کے وہ مظاہرے ہمارے سامنے پیش کیے، جن کو دیکھنے کی مدت سے لوگوں کے دلوں میں تمنائیں تھیں، جن کو دیکھنے کی آرزو میں کتنی ہی نسلیں ہمارے ہاں سے گزر گئیں، لیکن یہ خواب جو سال ہا سال سے اکابر اسلام دیکھتے چلے آرہے تھے، آج اس کی تعبیر کا سامان نظر آتا ہے۔

برادران محترم! برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیمی روایت انتہائی تابناک اور انتہائی خوش آئند رہی ہے۔ برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کا بارہ سو سالہ دور حکومت علمی، تعلیمی اور فکری اعتبار سے ایک نمایاں اور قابل ذکر دور ہے۔ یہاں کے اہل علم نے تعلیم کے میدان میں جو روایات قائم کیں، ان سے کسب فیض کے لیے وسط ایشیا اور موجودہ رشین فیڈریشن کے انتہائی آخری کناروں سے، حتیٰ کہ مشرقی یورپ کے علاقے بوسنیا سے، مصر سے اور عرب دنیا کے مختلف گوشوں سے اہل علم اور طلبہ کسب فیض کے لیے آیا کرتے تھے۔

کل ہی بوسنیا کے رئیس العلما اور شیخ الاسلام ڈاکٹر مصطفیٰ قریشی نے بتایا کہ ان

کے جدامجد برصغیر کے مختلف علاقوں سے کسب فیض کر کے گئے تھے اور یہاں کی علمی روایت کا چرچا وہ بچپن میں اپنے والدین، دادا اور اپنے بزرگوں سے سنتے چلے آئے ہیں۔

ٹھٹہ جو ایک بڑا دور افتادہ شہر تھا، ٹھٹہ کبھی مرکز سیاست نہیں تھا، کبھی مرکز حکومت نہیں تھا، کبھی تجارت کا مرکز نہیں تھا، ثقافت کا کوئی نمایاں مرکز نہیں تھا، لیکن ٹھٹہ جیسے شہر میں چار سو مدارس کی موجودگی کا مورخین نے ذکر کیا ہے۔ دہلی کے اس زمانے میں جب دہلی اپنی حیثیت کھو چکی تھی، جب میر تقی میر اپنا مشہور قطعہ دہلی کے بارے میں کہہ چکے تھے کہ:

ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

جب وہ اجڑا دیار بن چکا تھا، اس وقت مغربی تذکرہ نگاروں اور سیاحوں نے لکھا ہے کہ اس وقت بھی دہلی کے شہر میں ایک ہزار مدارس موجود تھے۔

محمد تغلق جو برصغیر کے اسلامی دور کے وسطی زمانے میں ایک بڑا نام ور حکم ران رہا ہے، اس کے زمانے میں مشہور سیاح ابن بطوطہ نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ محمد تغلق کے دربار میں اس کو کئی مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس نے کہا کہ محمد تغلق دستر خوان پر اس وقت تک نہیں بیٹھتا، جب تک کم از کم چار سو علما و فقہا اس کے دستر خوان پر موجود نہ ہوں۔ گویا جب بادشاہ کے دربار میں چار سو علما و فقہا موجود ہوں گے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ معاشرے میں علم و تعلیم کا چرچا کتنا رہا ہو گا۔

ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ جب انگریز ہندوستان میں آئے تو اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کی سطح کا معیار سو فیصد تھا۔ یہ ۱۸۳۹ء کی بات ہے، یعنی مسلمانوں میں تعلیم کی سطح سو فیصد تھی اور بہ حیثیت مجموعی پنجاب میں، جو دور افتادہ صوبہ تھا، مرکز حکومت بھی نہیں تھا اور مرکز ثقافت بھی نمایاں طور پر نہیں تھا۔ یہ تو لکھنو، شیراز اور دوسرے علاقے تھے۔ یہاں مسلمانوں اور غیر مسلم دونوں کو ملا کر ۸۴ فیصد تعلیم کی شرح تھی۔ گویا کہ بہ حیثیت مجموعی پنجاب میں ۸۴ فیصد اور مسلمانوں میں سو فیصد تعلیم تھی۔ لیکن جب انگریز یہاں سے گئے جو اس دعوے

سے آئے تھے کہ ہم دنیا کو تہذیب سکھانے نکلے ہیں، White Man's Burden کی اصطلاح آپ نے انگریزی اور فرانسیسی کتب میں سنی ہو گی کہ وائٹ مین کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ کالوں اور رنگ داروں کو تعلیم و تہذیب سے آشنا کرے۔ جب وہ تعلیم و تہذیب سے آشنا کر کے چلا گیا تو ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں تعلیم کی سطح چار فیصد تھی۔ گویا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ قوم کو تعلیم سے محروم کرنے کے لیے آئے تھے۔ کم از کم نتائج اور ثمرات بدنے یہی دکھایا۔ واقعات نے یہی بتایا کہ وہ Educated (تعلیم یافتہ) قوم کو De-educated (غیر تعلیم) یافتہ کرنے کے لیے آئے تھے۔

برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیم میں ایک نمایاں چیز یہ ہے کہ جو نظام تعلیم یا نصاب تعلیم وہاں کے اہل علم نے وضع کیا، دین و دنیا دونوں کی جامعیت کا آئینہ دار تھا۔ اس نظام تعلیم نے مجدد الف ثانیؒ جیسے بزرگ بھی پیدا کیے، جن کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے ایک جگہ لکھا ہے:

The greatest religious genius India has produced.

کہ مسلم ہندوستان میں سب سے بڑا مذہبی عبقری جو پیدا ہوا ہے تو وہ حضرت مجددؒ کی ذات گرامی ہے۔

شیخ احمد سرہندی اور نواب سعد اللہ خان دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ نواب سعد اللہ خان وہ سیاست دان ہیں، جو شاہ جہاں کے دور میں پورے ہندوستان کے وزیر اعظم تھے۔ یعنی موجودہ افغانستان، موجودہ پاکستان، موجودہ ہندوستان، موجودہ مشرقی پاکستان، موجودہ سری لنکا اور موجودہ نیپال، کم از کم یہ چھ ملک اتنی بڑی سلطنت میں شامل تھے جس کا نواب سعد اللہ خان کم از کم اڑتالیس سال وزیر اعظم رہا ہے۔ گویا بڑی بڑی سلطنتیں چلانے والے مدبرین اور اعلیٰ سے اعلیٰ دینی قیادتیں فراہم کرنے والے بزرگان (جو مجدد الف ثانیؒ کے درجے کے لوگ ہوں) وہ اسی ایک نظام تعلیم نے پیدا کیے۔

تاج محل جس مہندس (انجینئر) نے بنایا، وہ امریکا یا برطانیہ کا تربیت یافتہ نہیں تھا، بل کہ وہ اسی نظام تعلیم کا ہی پڑھا ہوا تھا۔ ان ہی چٹائیوں پر بیٹھ کر یہی صرف و نحو

کی کتابیں پڑھ کر اور یہی ریاضی اور ہندسہ کی کتابیں اس نے پڑھی تھی۔ شرح چغمینی ہی پڑھ کر وہ مہندس بنا تھا، جس سے اس نے تاج محل جیسی عمارت بنائی، جو آج دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک نمایاں عجوبہ ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ طویل ترین تعلیمی روایت جو ایک دن یا دو ایک عشروں پر مشتمل نہیں تھی، بل کہ جس کے پیچھے بارہ سو سال کی تاریخ تھی، جس کے پیچھے ایسے ایسے نام ور ترین اہل علم مصنفین و شارحین موجود تھے، جن کی کتب آج بھی دنیائے عرب کی یونی ورسٹیوں میں زیر تدریس ہیں۔ آپ نے محب اللہ بہاری کا نام سنا ہو گا، جو اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں صدر الصدور رہے، یعنی محتسب اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہے، ان کی دو کتابیں ہیں جو درس نظامی میں مشہور ہیں۔ ایک منطق میں ہے سلم العلوم اور ایک اصول فقہ میں ہی مسلم الثبوت۔ مسلم الثبوت کے بارے میں دیکھ کر مجھے انتہائی خوشی ہوئی۔ مجھے آج سے کئی سال پہلے استنبول جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے ایک جدید ترین ادارے میں جانے کا موقع ملا۔ عشا کی نماز کے بعد میں نے دیکھا کہ طلبہ درس گاہوں میں تیاری کر رہے تھے۔ ان کے ہوسٹلوں کے کمروں میں دیکھا تو تیاری کر رہے تھے۔ ایک نوجوان کے ہاتھ سے میں نے ایک کتاب لے کر دیکھی تو وہ فواتح الرحموت تھی، جو مسلم الثبوت کی شرح ہے اور شرح بھی برصغیر کے ایک عالم مولانا عبدالعلیؒ کی لکھی ہوئی ہے۔ گویا شرح اور متن دونوں برصغیر کے ایک عالم کے لکھے ہوئے اور بیسویں صدی عیسوی کے آخری عشرے میں (۱۹۹۵ء کا ذکر ہے) استنبول کی ایک درس گاہ میں لوگ اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

آپ دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک چلے جائیں، مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک آپ کو تفسیروں میں، علم حدیث کی شروح میں، فن رجال اور جرح تعدیل جو علم حدیث کے مشکل ترین فن مانے جاتے ہیں، جرح و تعدیل پر سب سے بہتر کتاب جو پورے چودہ سو سال میں کسی مصنف نے لکھی، وہ ہمارے برصغیر کے ایک عالم نے لکھی ہے: لرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل۔ ابھی ایک دوست نے

شیخ ابوالفتاح ابو غدہ کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے اس کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ یہ ان کی رائے ہے، میں اپنی رائے کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا۔ شیخ ابوالفتاح ابو غدہ کی رائے ہے کہ جرح و تعدیل پر اس سے بہتر کتاب پورے حدیث کے ادب میں موجود نہیں ہے۔

یہ مثالیں جن میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اور ایسی سیکڑوں، ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں اور یہ مثالیں دینے کا وقت نہیں ہے، لیکن جو بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ دینی علوم میں تعمق، گہرائی و مہارت کے یہ نمونے ہیں جو ہمارے سامنے ہیں۔ دوسری طرف دنیاوی تقاضوں کی تکمیل کا سامان اس حد تک ہے کہ بڑے سے بڑے مہندس (علم ہندسہ کے ماہر) جو سات عجائبات میں سے ایک عجوبہ تیار کر کے دکھادیں، ایسے مدبر جو چھ ممالک پر مشتمل سلطنت کو کامیابی سے ۴۸ سال تک اس طرح چلا کر دکھادے کہ ہندوستان کو پورے یورپ میں اس زمانے میں سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا اور شاہ جہاں کے زمانے میں ہندوستان کی دولت، ہندوستان کی معاشی ترقی اور برصغیر کے مسلمانوں کی خوش حالی نے انگریز تاجروں کو، ڈچ اور ولندیزی تاجروں کو آمادہ کیا کہ وہ یہاں آئیں اور یہاں آ کر تجارت کریں۔ اس تجارت کا آغاز شاہ جہاں کے دور میں ہوا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ روایت کیوں کم زور پڑی اور وہ روایت کیسے ختم ہوئی؟

آپ نے سنا ہو گا سر ولیم میور، جو یوپی کا لفٹیننٹ گورنر تھا، اس نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اسلام دشمنی میں اور ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بدگوئی کرنے میں جو چند نمایاں ترین اور بدنام ترین مستشرقین ہیں، ان میں سے ایک ہے، جس کے جواب میں سر سید احمد خان نے اپنی مشہور کتاب لکھی تھی۔ اس نے لکھا کہ مجھے ہندوستان کے بعض تعلیمی اداروں اور مدارس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں طلبہ جو منطق و فلسفہ و ہندسہ کے طالب علم تھے، ان سے میں نے تبادلۂ خیال کیا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی سطح (طلبا کی جو فکری سطح ہے) وہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے طلبہ سے کسی طور پر بھی کم نہیں۔ وہ تقریباً ۱۸۲۴ء سے ۱۸۶۰ء کے قریب یوپی اور پنجاب میں لفٹیننٹ گورنر رہا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اس نے

ان مدارس کا دورہ کیا تھا۔ اس کے بعد آپ دیکھیں کہ یک بہ یک یہ ساری روایت ادھر سے لے کر ادھر تک مٹادی گئی اور ایسا لگا کہ برصغیر میں ان چھ ملکوں پر مشتمل ''براعظم'' میں کوئی ایک روشنی کی کرن بھی باقی نہیں رہی کہ جہاں سے دینی تعلیم کے چشمے پھوٹ سکیں، دینی تعلیم کی روشنی پیدا ہو سکے۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۶۵۔۶۷ء تک جب دارالعلوم دیوبند قائم ہوا، اور اس طرح کے دوسرے ادارے قائم ہوئے، یہ پورا عشرہ انتہائی تاریکی کا عشرہ معلوم ہوتا ہے۔ کیوں؟ یہ کیسے ہوا؟

اس کے لیے انگریز نے چار بڑے اقدامات کیے اور ان چار بڑے اقدامات کے نتیجے میں یہ ساری روایت دس سال کے عرصے میں اس طرح زمین بوس ہو گئی کہ پھر ایک طالب علم اور معلم نے، جن کا نام محمود تھا (اتفاق سے میری خوش قسمتی ہے کہ میرا نام بھی محمود ہے)، ایک انار کے درخت کے نیچے ایک نئی روایت کا آغاز کیا۔

۱۔ سب سے پہلے انگریز نے فارسی اور عربی زبان کو ختم کیا اور سرکاری زبان انگریزی قرار دے دی، جس کے نتیجے میں وہ تمام لوگ جو ۱۸۵۷ء تک تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے، وہ سب کے سب سرکاری اور انتظامی مناصب کے لحاظ سے اور ان کے تقاضوں کے مطابق غیر تعلیم یافتہ ہو گئے۔ چشم زدن میں اس نے ایک روایت کو بند کر کے دوسری روایت کو کھول دیا، حال آں کہ یہ اس معاہدے کی شدید خلاف ورزی تھی جو ۱۷۶۲ء میں اس واقعے سے تقریباً ۹۰ سال پہلے شاہ عالم ثانی اور انگریز کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان باقاعدہ طور پر طے پایا تھا۔ آپ کو پتا ہو گا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب ہندوستان کے تین چار صوبوں پر قبضہ کرلیا اور انگریز کی طاقت برصغیر میں ایک مسلمہ قوت بن گئی تو اس زمانے کے مسلم فرماں رواشاہ عالم ثانیؒ کے سامنے اب دو صورتیں تھیں۔ یا تو وہ مرہٹوں اور جاٹوں کی متحدہ طاقت کو ابھرنے دے اور برصغیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس طرح کا اکھنڈ بھارت بنادے کہ مسلمانوں کا وجود ہی ختم ہو جائے یا پھر انگریزوں سے کوئی معاملہ کر کے ان کی قوت کو تسلیم کرلے اور انگریزوں سے مطمئن ہونے کے بعد ہندوؤں اور جاٹوں سے نمٹنے کی کوشش کرے۔

آج مصنفین، مورخین لوگ بہت سی باتیں کہتے ہیں کہ یہ ہوتا، وہ ہوتا، یہ کرنا چاہیے تھا، لیکن اصل فیصلہ تو اس آدمی نے کیا جو اس فیلڈ پر تھا کہ انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کرکے ان کی قوت کو تسلیم کرنا چاہیے اور یقیناً قوت کو جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں کے متحدہ محاذ سے نمٹنے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ اس معاہدے میں جو الہ آباد میں ہوا تھا، انگریزوں نے یہ شرط تسلیم کی تھی کہ برصغیر میں حکمرانی مسلمان فرماں روا کی ہو گی۔ ہم نے اپنے بچپن میں اپنی دادی سے سنا تھا کہ جب سرکاری اعلان ہوا کرتا تھا تو اس طرح ہوتا کہ خدائی اللہ کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔ گویا یہ اس معاہدے کا ایک نمونہ تھا جو شاہ عالم ثانی نے انگریزوں سے کیا تھا کہ سیاسی اقتدار دستوری اور آئینی طور پر مسلمان کا رہے گا، شریعت کی بالادستی ہو گی، عدالتیں قانونِ شریعت کے مطابق فیصلہ کریں گی اور فقہ حنفی کے ماہر قاضی مقرر کیے جائیں گے، جو فقہ حنفی کے مطابق عدالتوں میں مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کریں گے۔

یہ تحریری معاہدہ باقاعدہ ۶۲-۱۷۶۱ء میں ہوا اور شاہ عالم ثانی کے ساتھ انگریزوں نے طے کیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے ادارے موجود تھے، مسلمانوں کی تعلیمی روایات پہلے کی طرح جاری تھیں۔ اس لیے کہ معاشرے میں جب تک کسی چیز کی امید اور طلب نہ ہو تو اس وقت تک وہ چیز پیدا ہی نہیں ہوتی۔ ہاں جب معاشرے میں ایک چیز کا چلن ہو جائے تو پھر معاشرے میں خود بہ خود وہ چیز سامنے آجاتی ہے۔ یہ طلب اور رسد کا ایک عام اصول ہے۔ لیکن انگریزوں نے اس معاہدے کو نظر انداز کیا اور ۱۸۵۷ء میں انہوں نے انگریزی قانون مکمل طور پر نافذ کر دیا، سرکاری زبان فارسی وعربی کو ختم کرکے انگریزی قائم کر دی، مسلمانوں کے اوقاف ختم کر دیے اور انگریزی قوانین ایک ایک کرکے نافذ کرنا شروع کر دیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان تعلیمی اداروں سے پیدا ہونے والے جو ماہرین وفاضلین تھے، ان کی معاشرے میں کوئی جگہ نہ تھی۔ جو تعلیمی اداروں کو امداد دینے والے اوقاف تھے، وہ ختم ہو گئے اور چوں کہ مسلمانوں کی جاگیریں اور جائیدادیں انگریز نے ضبط کرلی تھیں، اس لیے مسلمان اداروں کو مدد دینے کی

پوزیشن میں نہیں تھے۔ یہ صورت حال ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک جاری رہی۔

یہ اللہ رب العزت کی مہربانی تھی کہ برصغیر کی مسلم کمیونٹی میں ایک جان تھی، ایک احساس تھا اور ایک شعور تھا جو ہمیشہ تازہ اور بیدار رہا۔ انہوں نے انگریز کی تمام قوت و کاوش کے باوجود دینی مدارس کی روایت کو زندہ رکھا، لیکن دینی مدارس کے اس نصاب میں ذرا تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ اس روایت میں جو ۱۸۵۷ء سے پہلے تک چلی آرہی تھی، بہت سے ایسے علوم بھی شامل تھے، جن کو آپ اس زمانے کے لحاظ سے دنیاوی علوم کہہ سکتے ہیں۔ اس میں طب بھی پڑھائی جاتی تھی، اس میں علم ہندسہ بھی پڑھایا جاتا تھا، اس میں ریاضی بھی پڑھائی جاتی تھی، اس میں سائنس بھی پڑھائی جاتی تھی۔ الغرض وہ تمام علوم جو اس زمانے میں ناگزیر تھے، وہ سارے ہی پڑھائے جاتے تھے۔ وہ کتب آج بھی موجود ہیں اور آج بھی ایسے علما و ماہرین موجود ہیں، جو ان کتابوں کو پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہیں۔ اب چوں کہ ان علوم کی ضرورت نہیں تھی تو اس لیے اس زمانے کے علما نے دینی تخصصات پر، دینی مہارتوں پر اور صرف دینی علوم وفنون پر ہی زیادہ زور دیا اور تقریباً ۹۰ سال کی مسلسل کاوشوں کے ذریعے مسلمان قوم کو زندہ رکھا، اسلامی تعلیم کو زندہ رکھا، مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی اسی طرح باقی رہی، جس طرح ۱۸۵۷ء سے پہلے باقی تھی۔

اب پاکستان بننے کے بعد ضرورت تھی کہ ایک نئے دور کا آغاز ہو۔ نئے دور کا آغاز پاکستان میں ۲۷ رمضان المبارک ہی کو ہو جانا چاہیے تھا، جس رات پاکستان قائم ہوا تھا۔ یہ چیز پاکستان کے قائدین کے ذہن میں تھی کہ پاکستان میں ایک نیا نظام تعلیم ہونا چاہیے۔ آپ حضرات میں سے بعض کے علم میں ہوگا کہ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کے منظور ہونے کے فوراً بعد قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے اشارے پر مسلم لیگ نے ماہرین کی ایک کمیٹی قائم کی تھی، جس میں اس دور کے جید ترین اہل علم کو رکھا تھا اور خیر المدارس اور حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ کے حوالے سے میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اس میں جن اہل علم کو دعوت دی گئی، وہ تقریباً سب کے سب وہ تھے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی روایت اور سلسلے سے وابستہ

تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی اس کمیٹی کے چیئر مین تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (ان کا اس روایت سے تعلق نہیں تھا، لیکن وہ بھی اس کے رکن تھے)، ڈاکٹر ذاکر حسین خان جو مولانا محمد الیاس صاحب، بانی تبلیغی جماعت کے معتقد اور مرید تھے، جو بعد میں ہندوستان کے صدر ہوئے، وہ بھی اس کمیٹی کے رکن تھے۔ ایک دو اور حضرات بھی کمیٹی میں تھے۔ اس کمیٹی کے ذمے کام یہ تھا کہ نئی نئی معرض وجود میں آنے والی ریاست کے لیے تعلیم و ثقافت کا ایسا نظام وضع کرے، جس کے بہ موجب نئی ریاست کو اسلامی تقاضوں پر اور اس کے نظام تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق نئے انداز سے مرتب کیا جاسکے۔

اس کمیٹی کے ذمے تین کام تھے:

۱۔ نظام تعلیم

۲۔ نظام معیشت

۳۔ نظام سیاست

نظام سیاست کا خاکہ جو اس نے تیار کیا تھا، وہ مطبوعہ موجود ہے۔ نظام معیشت کا ابتدائی خاکہ تیار کیا جو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ضائع ہو گیا۔ تعلیم و ثقافت کے نظام میں یا تو کمیٹی کو کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملا یا اس کی رپورٹ سامنے نہیں آئی، لیکن اس سے یہ ضرور اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلم لیگ کے صف اول کے قائدین کے دل میں اس کا احساس موجود تھا اور اس دور کے جن اہل علم کو اس کام کے لیے مناسب سمجھا گیا، ان اہل علم کو ہی دعوت دی گئی۔

پاکستان بننے کے بعد (اگست میں پاکستان بنا) تین مہینے کے اندر اندر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قائداعظم محمد علی جناح کے کہنے پر پاکستان میں پہلی تعلیمی کانفرنس بلائی گئی، جس میں مشرقی و مغربی پاکستان سے ماہرین تعلیم کو دعوت دی گئی تھی۔ قائداعظم نے اس کانفرنس کے نام ایک پیغام بھیجا۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ موجودہ نظام تعلیم ہماری ضروریات کی تکمیل نہیں کر سکتا اور ہمیں ''رائٹ ٹائپ آف ایجوکیشن'' (مثبت نظام تعلیم) کے لیے اقدامات کرنے چاہییں۔ اس کے بعد

جب ان کا انتقال ہوا، اللہ نے ان کو بڑے وسائل دیے تھے، بڑی دولت دی تھی، پوری زندگی میں جو کمایا تھا، وہ تحریک پاکستان میں وقف کیا۔ ان کی وہ دولت جو انہوں نے ذاتی کمائی سے چھوڑی تھی، اس کے بارے میں کیا وصیت کی؟ یہ بڑی اہم بات ہے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میری یاد میں کوئی بڑا محل بنادینا، انگریزی سیکھنے کے لیے دے دینا، بل کہ انہوں نے کہا کہ اسلامیہ کالج پشاور، اسلامیہ کالج لاہور، علی گڑھ یونی ورسٹی اور سندھ مدرسۃ الاسلام کو میری جائیداد دے دی جائے۔ گویا وہ ادارے جو اس وقت جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تربیت کا بھی اہتمام کر رہے تھے، جو اسلامی تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے جدید علوم کے ساتھ ملا کر پیش کر رہے تھے (اس وقت جو بھی سطح تھی) ان چار اداروں کے لیے اپنی جیب کی کمائی کے بارے میں وصیت کی۔ یہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ بعض اوقات یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ پاکستان میں تعلیم کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں گیا یا پاکستان کے موسسین نے نئی ریاست کی تعلیمی ضروریات کا کبھی احساس نہیں کیا۔ احساس ہوا، لیکن ان کے جانے کے بعد جو لوگ آئے، علامہ اقبالؒ کا مصرعہ ہے، کسی خاص آدمی کی طرف اشارہ مقصود نہیں ہے:

زاغوں کے تصرف میں رہے عقابوں کے نشیمن

یہاں پر ''ہیں'' کی بہ جائے ''رہے'' اس لیے کہا ہے کہ اس طرح میں بھی اس کی زد میں آؤں گا، سوال یہ ہے کہ آج اگر اس بات کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور یہ ایک انتہائی خوش آئندبات ہے کہ مولانا محمد حنیف جالندھری اور ان کی طرح کے بعض دوسرے علمائے کرام کے دل میں اللہ نے یہ بات ڈالی کہ مستقبل میں پاکستان کی تعمیر کے لیے پہلا قدم ہے اور تعلیم ہی سے وہ نسل پیدا ہو سکتی ہے جو پاکستان کو اس کے مفہوم میں اسلامی ریاست بنائے، جس مفہوم میں اسلامی ریاست کو ہم اور آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔

اسلام خادم بننے کے لیے نہیں آیا، مخدوم بننے کے لیے آیا ہے۔ جو چیز مخدوم بن کر اسلام کے کیمپ میں داخل ہوتی ہے، بالآخر اسے خادم بنناہی پڑتا ہے۔ تاتاریوں

کی مثال لے لیں کہ تاتاری، اسلام میں فاتح بن کر داخل ہوئے، لیکن بالآخر اسلام کے خادم بن گئے۔ ان تاتاریوں نے جنھوں نے بغداد کو تباہ کیا تھا، جنہوں نے دریاؤں کے پانی کتابوں کی سیاہی سے سیاہ کر دیے تھے، انہوں نے ہی اسلام کا سات سو سال تک دفاع کیا۔

آج اگر انگریزی کی وجہ سے کچھ انگریزی خواں مسلمانوں میں مخدوم بننا چاہتے ہیں یا بنے ہوئے ہیں تو یہ ایک عارضی اور وقتی چیز ہے۔ ان شاء اللہ انگریزی زبان اور جدید کمپیوٹر، یہ سائنس اور یہ ٹیکنالوجی سب کی سب اسلام کی خادم بنیں گی اور اسلام کے لیے ''خادم سازی کا کام'' مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب نے شروع کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے کام میں برکت دیں، اللہ تعالیٰ اس کام کو قبول فرمائیں، اللہ تعالیٰ ان کی مثالیں زیادہ سے زیادہ عام کریں، اللہ تعالیٰ اس ادارے کی برکات کو پورے پاکستان اور پھر پوری دنیائے اسلام میں پھیلائے۔

یہ وقت کی انتہائی اہم ناگزیر ضرورت ہے۔ میں نے جو تھوڑی بہت شریعت کی تعلیم پائی ہے اور کم از کم پچھلے ۴۲ سال سے میرا یہ مشغلہ ہے، اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اس دور میں فرض کفایہ ہے، جو مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب پورا کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے حضرات بھی جید اہل علم کی سربراہی میں سامنے آئیں گے اور اسلامی روایت اور ذوق، مزاج اور مذاق کا لحاظ رکھتے ہوئے، اسلامی تخصصات و اسلامی تعمق کو برقرار رکھتے ہوئے بہ قدرِ ضرورت جو علوم آج کے لیے ناگزیر ہیں، ان علوم کی تعلیم سے وابستہ اور آراستہ اہل علم کی تیاری میں ان شاء اللہ حصہ لیں گے۔

ان الفاظ اور ان نیک خواہشات کے اظہار کے ساتھ میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اکیسویں صدی میں پاکستان کے تعلیمی تقاضے

۳ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور

کے زیر اہتمام پانچواں محمد رفیع الدین میموریل لیکچر

اکیسویں صدی میں
پاکستان کے تعلیمی تقاضے

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلی الہ واصحابہ اجمعین

میں اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے ایک ایسے موثر اور وقیع پلیٹ فارم سے گفت گو کرنے کی دعوت دی گئی ہے، جو نہ صرف برصغیر پاک وہند بل کہ پوری دنیائے اسلام میں بیسویں صدی کے ایک نام ور مفکر اور دانش ور کے نام نامی سے منسوب ہے۔ میری مراد ڈاکٹر رفیع الدین سے ہے جن کی فکری گہرائی، اسلامیت، توازن اور اعتدال کی نظیریں بیسویں صدی میں اسلامی فکر کی تاریخ میں مشکل سے ملیں گی۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین جیسی عظیم فکری اور مایہ ناز علمی شخصیت سے منسوب یہ سلسلۂ خطبات نہ صرف ان کی فکری عظمت اور علمی مقام و مرتبت کا اعتراف ہے، بل کہ ان کے اس تعلیمی مشن کا تسلسل بھی ہے جس نے ان کو اپنے اقران و معاصرین میں نمایاں مقام عطا کیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے اس صدقۂ جاریہ کو قائم و دائم رکھے اور ان کے قائم کردہ ادارے آل پاکستان اسلامک ایجوکیشنل کانگریس کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

گفت گو کو آگے بڑھانے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں تعلیم

کے تصور اور عہد نبوی میں نظام تعلیم کے موضوع پر ضروری تمہیدی گزارشات پیش کی جائیں۔ ان تمہیدی گزارشات سے اسلامی نظام تعلیم کی نظریاتی بنیادوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مزید برآں یہ تمہیدی مباحث زیر گفت گو موضوع کی تعیین حدود کے لیے بھی ناگزیر ہیں۔

قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اللہ کی کتاب مسلمانوں تک پہنچانے اور ان کا تزکیۂ نفس کرنے کے ساتھ ساتھ رسول کا کام یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کو کتاب اللہ اور حکمت و دانائی کی تعلیم دے۔ (۱) یہ فرائض سہ گانہ قرآن پاک میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ کتاب و حکمت کی تعلیم دینا نبی کا بنیادی اور اہم ترین فریضہ ہے۔ پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام کائنات کے لیے ہے، اس لیے لامحالہ آپ کی تعلیم بھی تمام کائنات کے لیے ہو گی۔ یہ بات کہ آپ کی تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت پوری دنیا کے لیے تھی اور پوری دنیا کے لیے ہونی چاہیے، تعلیمی دنیا کے لیے ایک بڑا انقلاب آفریں پیام تھا، جو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعے سے تکمیل کو پہنچ سکتا تھا۔

اسلام سے قبل جہاں دنیا میں بہت سی اجارہ داریاں قائم تھیں، وہاں تعلیم اور بالخصوص مذہبی تعلیم پر بڑی افسوس ناک اجارہ داری قائم تھی۔ عرب میں جب اسلام آیا تو خود قبیلۂ قریش میں، جو تمام عرب پر مذہبی اقتدار رکھتا تھا، بہ قول بلاذری سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ عرب سے باہر متمدن ممالک میں بھی عام آدمی کو لکھنے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ سینٹ پال نے مسیحیت کی ترویج کی تو اس نظام کے گرجاؤں میں ایک عام آدمی کا بار پانا آسان نہ تھا۔ ہندوؤں کے طبقاتی نظام میں اگر کسی غریب شودر کے کان میں بلاارادہ بھی وید کا کوئی اشلوک پڑ جاتا تو اس بے گناہ کی یہ سزا ہوتی کہ اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا جاتا۔

رحمۃ للعالمین نے جہاں اور ساری اجارہ داریوں کو ختم کیا، وہاں دنیا کے تمام

۱۔ البقرہ:۱۲۹۔ آل عمران: ۱۶۴۔ الجمعہ: ۲

انسانوں کو، خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، عورت ہو یا مرد، بچے ہوں یا بڑے، سب ہی کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینے کی ہدایت دی۔ قرآن مجید نے نہ صرف یہ کہ علم حاصل کرنے کی دعوت دی، بل کہ ہر شخص کا فرض قرار دیا کہ وہ علم حاصل کر کے انفس و آفاق پر غور کرے۔ (۲) نظام فلکیات، نظام شب و روز، باد و باراں، بحر و دریا، صحرا و کوہستان، غرض کون سی چیز ہے جس کا مطالعہ کرنے اور اس کی پوشیدہ حکمتوں کا پتا چلانے کی ترغیب نہیں دی گئی؟ قرآن پاک نے صاف طور پر اعلان کیا کہ خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں، جو صاحب علم ہیں۔ (۳) قرآن مجید نے تو واضح طور پر کہا کہ کیا علم رکھنے والے اور علم نہ رکھنے والے برابر ہو سکتے ہیں؟ (۴) قرآن مجید دراصل ان لوگوں کے لیے ہے جو عقل رکھتے ہیں، جو سوچتے ہیں، جو سمجھ رکھتے ہیں۔ اس میں علم و عقل، سمجھ، فہم اور اس کے مترادفات بار بار استعمال ہوئے ہیں۔ شاید اسی حصول علم کی خاطر مسلمانوں کو دور دراز مقامات تک سفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اہل علم پر سخت وعید فرمائی ہے جو اپنے علم کو اپنی ذات تک محدود کیے بیٹھے رہتے ہیں اور خلق خدا کو اس سے مستفید نہیں کرتے۔ ایک جگہ ایسے عالم کو جو ضرورت مندوں کو اپنے علم سے مستفید نہ کرے، گونگا شیطان قرار دیا گیا ہے۔ واضح طور پر ارشاد فرمایا گیا کہ قیامت کے دن اللہ تبارک و تعالیٰ کے نزدیک سب سے بدتر وہ عالم ہو گا، جس کے علم سے لوگ فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ اس علم کی مثال جس سے کسی کو فائدہ نہ ہو، اس خزانے کی سی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے۔ اس کی کیفیت خود اللہ تعالیٰ نے یوں بیان کی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳۴ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى

۲۔ حم السجدہ: ۵۳

۳۔ الفاطر: ۲۸

۴۔ الزمر: ۹۔ اصل آیت یوں ہے: قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

يِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾ (۵)

جو لوگ سونا اور چاندی سینت سینت کر رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ ایک دن آئے گا جب جہنم کی آگ میں یہ سونا اور چاندی دہکایا جائے گا اور پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا، (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے سینت کر رکھا تھا۔ اب چکھو اس دولت کا مزہ۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار نصیحت فرمائی کہ اللہ سے ایسا علم مانگو جو نفع بخش ہو۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو دعائیں مانگا کرتے تھے، ان میں یہ دعا بھی ہوتی تھی کہ اے اللہ! میں آپ سے علم نافع طلب کرتا ہوں اور اے اللہ! میں ایسے علم سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، جو بے فائدہ ہو، نفع نہ دے۔ (۶)

اسلام میں جہاں طلب علم کو فرض قرار دیا گیا ہے، وہاں اس فرضیت کی تفصیلات بھی واضح کر دی گئی ہیں۔ حصول علم کا ایک درجہ فرض عین، یعنی ہر شخص پر ذاتی طور پر فرض ہے، جب کہ دوسرا درجہ فرض کفایہ کا ہے، جو پوری ملت اسلامیہ پر اجتماعی طور پر فرض کیا گیا ہے اور اگر کچھ لوگ بھی اس کو پورا کر دیں تو پوری قوم بری الذمہ ہو جاتی ہے۔ شریعت کا بنیادی اور ضروری علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے فرض عین ہے اور اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام

۵۔ التوبہ: ۳۴، ۳۵

۶۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں کئی دعائیں منقول ہیں۔ ایک دعا کے الفاظ ہیں: اللّٰھم انی اعوذبك من علم لا ینفع ومن قلب لا یخشع (نووی۔ الاذکار۔ مکتبہ المامون، جدہ ۱۹۹۷ء: رقم ۳۶۳)

جب کہ ایک دوسری دعا یوں مروی ہے: اللّٰھم انی اسئلك رزقا طیبا وعلما نافعا وعملا متقبلا (ابن ماجہ۔ السنن۔ دارالمعرفۃ بیروت ۱۹۹۸ء: ج۱، ص۳۰۶، رقم ۹۲۵)

شہریوں کو اسلامی احکام کا ضروری اور بنیادی علم حاصل کرنے میں مدد دے۔ اگر کوئی شخص یہ بنیادی تعلیم حاصل نہ کرے تو سزا کا مستوجب ہو گا۔ حضرت عمرؓ نے خاص طور پر اس کام کے لیے ایک گشتی افسر مقرر کیا تھا۔ امام شافعیؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے لیے فرض عین ہے کہ وہ اپنے پیشے کے بارے میں تمام ضروری علم رکھتا ہو، مثلاً ایک تاجر کے لیے لازمی ہے کہ اسلامی اصول تجارت اور اس کے دوسرے طریقوں سے اچھی طرح آگاہ ہو اور ایک ڈاکٹر کا فرض ہے کہ فن طب کے بارے میں تمام ضروری علم حاصل کرے۔ اس کے علاوہ جتنے بدوسرے علوم وفنون ہیں، ان میں سے کسی کا، حتیٰ کہ خود اسلامی شریعت کا تفصیلی علم بھی ہر ایک کے لیے فرض عین نہیں، بل کہ فرض کفایہ ہے۔ اگر معاشرے میں کچھ لوگ یہ علم رکھنے والے موجود ہیں تو ٹھیک، ورنہ پورا معاشرہ قابل مواخذہ ہو گا۔

مسلم مفکرین نے ان تمام علوم سے بحث کی ہے جو فرض کفایہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ امام غزالیؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ نے ان میں سائنس، انجینئرنگ اور صنعت وحرفت کو بھی شامل کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ فنون جہاں سے بھی حاصل ہو سکیں، حاصل کرنے چاہییں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے مبارک دور میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ پوری رواداری اور بے تعصبی کے ساتھ جو مفید چیز جہاں سے ملی، اخذ کر لی گئی، لیکن اس کی افادیت کا تعین بہ ہر حال قانون شریعت ہی کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ اس مضمون کی بے شمار احادیث، کتب حدیث میں موجود ہیں۔

علمی مشاغل اور مذاکروں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عام عبادت سے بڑھ کر درجہ دیا۔ یہ تو مشہور حدیث ہے کہ شیطان کے لیے ایک عالم، ایک ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ (۷) یہ بھی بہت مشہور ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف لائے تو دیکھا کہ صحابہ کرامؓ کے دو گروہ الگ الگ دو محفلیں منعقد کیے بیٹھے ہیں۔ ایک محفل میں تلاوت قرآن، تسبیح اللہ اور ذکر

۷۔ ابن ماجہ: ج ۱، ص ۹۶، رقم ۲۲۲

ومناجات ہو رہی تھی اور دوسری محفل میں علمی مذاکرہ ہو رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو دیکھا اور خوش ہو کر فرمایا کہ دونوں اچھا کام کر رہے ہیں، لیکن افضل اور برتر درجہ ان لوگوں کا ہے جو علمی مذاکرہ کر رہے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے کہ:

انما بعثت معلماً

میں بھی تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

علمی مذاکرہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ (۸) ایک اور موقع پر بھی یہی صورت حال تھی تو آپ پھر علمی محفل کے ساتھ شامل ہو گئے اور فرمایا:

بھذا امرت (۹)

مجھے بھی اسی کا حکم دیا گیا ہے۔

اسی طرح ایک بار حضرت عمرؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ تمام رات علمی مذاکرہ اور گفت گو کرتے رہے۔ جب صبح کا وقت قریب ہوا تو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے یاد دلایا کہ امیر المومنین! نماز کا وقت ہونے والا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ بھی نماز ہی ہے، جس میں ہم اس وقت مصروف ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ حصول علم میں سب سے بلند اور اعلیٰ درجہ علم شریعت کا ہے، لیکن دوسرے مفید علوم وفنون کی تحصیل بھی رضائے خداوندی سے خالی نہیں۔ خود قرآن مجید میں بار بار کائنات اور مظاہر فطرت میں غور و فکر کرنے کی ترغیب دلائی گئی۔ متعدد احادیث میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ وہ لوگ اللہ کے بہترین بندے ہیں، جو چاند، سورج، ستاروں اور رؤیت ہلال وغیرہ کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس سے اللہ کی قدرت انہیں یاد آتی ہے یا اس سے ذکر اللہ کے لیے اوقات کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح کے ارشادات دوسرے علوم وفنون کے بارے میں بھی ہیں۔

۸۔ ایضاً: ج۱، ص۹۸، رقم ۲۲۹

۹۔ علی متقی الہندی۔ کنز العمال: رقم ۴۰۴۰

تعلیم کی یہ اہمیت جاننے کے بعد اب ہمیں مختصر طور پر دیکھنا چاہیے کہ پیغمبر تعلیم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کو عام کرنے کے لیے عملاً کیا کیا اقدامات کیے اور کیا کیا تدابیر اختیار کیں۔ ہجرت سے قبل کا زمانہ اگرچہ نہایت پریشانی کا زمانہ تھا اور مسلمانوں کو ایک لمحے کے لیے بھی نہ امن نصیب تھا اور نہ اطمینان، اور نہ کے میں کوئی اجتماعی نظم قائم ہو سکا تھا، لیکن اس کے باوجود خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خفیہ طور پر مشہور صحابی حضرت ارقم بن ابی الارقم ؓ کے گھر کو اسلام کی پہلی درس گاہ کے طور پر استعمال کیا۔ یہیں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو اسلام اور قرآن مجید کی تعلیم دیتے، یہیں لوگ نمازیں ادا کرتے اور یہیں قرآن مجید کی مختلف سورتوں اور رکوعوں پر مشتمل کتابچے تیار کیے جاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تعلیم یافتہ صحابہ بہ طور گشتی معلم، مکہ مکرمہ میں لوگوں کے گھروں میں جا کر ان کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ چناں چہ مشہور واقعہ ہے کہ جب حضرت عمر ؓ اسلام لائے تو اس وقت ان کی بہن کے گھر میں مشہور صحابی حضرت خباب بن الارت ؓ حضرت عمر ؓ کی بہن اور بہنوئی کو قرآن مجید پڑھا رہے تھے اور ان کے پاس ایک کتابچے میں سورۂ طہٰ لکھی ہوئی موجود تھی، جس کو پڑھ کر حضرت عمر بھی اسلام لے آئے۔

جب مدینہ منورہ میں اسلام کا آغاز ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت مصعب بن عمیر کو مسلمانانِ مدینہ کی تعلیم کے لیے مدینے بھیجا۔ مصعب بن عمیر پہلے مسلمان تھے، جو مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ گئے۔ ہجرت سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کے اسلام قبول کرنے والے لوگوں میں جن بارہ نقیبوں کا تقرر کیا، ان میں بھی ان کے تعلیم یافتہ ہونے کی صفت نمایاں تھی۔ ان میں متعدد اصحاب وہ تھے جو زمانۂ جاہلیت میں کامل، یعنی علامہ اور ہر فن مولا کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ ہجرت کے بعد جب مدینے میں اسلامی ریاست کی داغ بیل ڈالی گئی تو تمام داخلی اور خارجی خطرات اور ہنگاموں کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کی طرف اولین توجہ مبذول فرمائی۔ مسجد نبوی

کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اسلام کی پہلی باقاعدہ درس گاہ صفہ کا قیام بھی عمل میں آیا۔ یہ مسجد نبوی میں ایک احاطہ تھا، جو مقیم طلبہ کے لیے اقامت گاہ اور درس گاہ کا کام دیتا تھا۔ اس درس گاہ کے نگران اعلیٰ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ کے علاوہ دوسرے اساتذہ میں حضرت عبادہ بن صامتؓ، حضرت جابر بن عبد اللہؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت سعید بن العاصؓ کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ ان بزرگوں میں کچھ کے ذمے قرآن کی تعلیم، کچھ کے ذمے فقہ کی تعلیم اور کچھ کے ذمے لکھنا پڑھنا سکھانا تھا۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ لکھنے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ بچوں کو لکھنا سکھانے کے لیے الگ مکتب بھی قائم کیے گئے۔

صفہ میں نہ صرف مقیم طلبہ تعلیم پاتے تھے، بل کہ مدینے کے رہنے والے لوگ بھی بلالحاظ عمر وہاں علم سیکھتے تھے۔ مقیم طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ ان اصحاب کے اخراجات عموماً سرکاری مصارف سے پورے ہوتے تھے، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب مدینے کی ننھی سی ریاست مسلسل ہنگامی دور سے گزر رہی تھی۔ بعض اوقات سرکاری وسائل سے یہ اخراجات پورے نہ ہو پاتے تو اللہ کے غیور بندے کسی پر ظاہر نہ کرتے اور جو کچھ گزرتی، صبر شکر سے جھیل لیتے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے جو فضلائے مدینہ کے سرخیل ہیں، اپنی اس تنگ دستی کی بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں، جو صفہ میں قیام کے دوران ان پر گزریں۔ عموماً مختلف صحابہ کے ہاں رات کے کھانے پر دعوتیں ہوا کرتی تھیں۔ لوگ حسب استطاعت ایک ایک، دو دو اصحاب صفہ کو کھانے پر بلا لیتے تھے۔ اس معاملے میں رئیس خزرج حضرت سعد بن عبادہؓ عموماً سب سے بازی لے جاتے تھے۔ وہ ایک وقت میں ۷۰، ۸۰ سے کم لوگوں کو نہ بلاتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب صفہ کی تعداد ۹۰ اور ۱۰۰ کے قریب قریب رہتی تھی۔ ان ہمہ وقتی طلبہ کے علاوہ بیرون مدینہ سے مختلف لوگ آتے تھے اور مختصر عرصہ قیام کر کے دین کا ضروری علم حاصل کرتے تھے۔

صفہ میں دی جانے والی تعلیم کی بنیاد، اساس اور روح قرآن مجید تھا۔ صحابہ

کرام ؓ نے قرآن مجید ہی کے مدرسے میں پڑھا، قرآن مجید ہی سے تربیت پائی اور قرآن مجید ہی ان کے سارے علم کی اصل تھا۔ خود قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کو تمام علوم کا جامع بتایا گیا ہے:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (۱۰)

ہم نے اس میں کسی چیز کی کمی نہ رہنے دی۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۱)

ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کا تفصیلی بیان موجود ہے۔

یعنی انسانیت کے وہ گر اس میں بتادیے گئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر انسان ہر چیز کو پرکھ سکتا ہے۔ امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ سارا اسلامی لٹریچر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور سنت کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تشریح ہے اور خود سیرت وسنت قرآن مجید کی تشریح ہے۔ امام شافعیؒ کی اس رائے کی صداقت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کے مختلف مضامین کا احاطہ کرنے کے لیے امت مسلمہ نے جو جو فنون ایجاد کیے، ان کی تعداد قاضی ابو بکر بن العربیؒ نے ساڑھے چار سو سے زائد بتلائی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو مقدس ہستیاں خود صاحب قرآن اور مجسم قرآن سے قرآن پڑھتی ہوں گی، خود ان کو کیسے علوم حاصل ہوئے ہوں گے۔

جو اصحاب بہ راہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے تھے، وہ دس دس آیات پڑھتے تھے اور جب تک معانی ومطالب خوب ذہن نشین نہ ہو جاتے تھے، آگے نہ بڑھتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر ؓ نے صرف سورۂ بقرہ کے خصوصی مطالعے پر چودہ سال صرف کیے۔ اس زمانے میں عرب میں خاص طور پر درسی کتابوں کا رواج نہ تھا۔ قرآن مجید اور سنت رسول کے مجموعے ہی بنیادی درسی کتابیں تھیں۔ ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر رسائل لکھے جانے کا

۱۰۔ الانعام: ۳۸

۱۱۔ النحل: ۸۹

ذکر ملتا ہے۔ مثلاً جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن حزم انصاری ؓ کو فقہ کی تعلیم کے لیے نجران بھیجا تو ان کے لیے ایک کتاب لکھوائی، جس میں فرائض، سنن اور زکوۃ کے تفصیلی احکام درج تھے۔ اس طرح کا ایک مجموعہ حضرت علی ؓ کے پاس بھی تھا۔ عہد نبوی میں اس طرح کے مجموعوں اور ان کے درس و تدریس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، جن کی کچھ تفصیل مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی کتاب ''تدوین حدیث''، ترکی کے ڈاکٹر فواد سیز گین کی جرمن تصنیف ''اسلامی علمی ورثے کی تاریخ'' اور ڈاکٹر مصطفی اعظمی کی فاضلانہ انگریزی تحریروں میں مل سکتی ہیں۔ بعض دوسرے علوم وفنون میں بھی کتابیں لکھے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ آخر زمانے میں زکوۃ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایتیں دی تھیں، ان کو باضابطہ لکھ کر مرتب کرلیا گیا تھا اور یہ حضرت عمر ؓ کے خاندان میں محفوظ تھا اور وہیں سے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس کی نقل لی تھی۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا تھا، اس کو یمن کے ایک صحابی ابو شاہ کو لکھوا کر دیا گیا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے تھے، بیٹھ کر لکھتے جاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف فرامین کو بھی صحابۂ کرام ؓ نے قلم بند کرلیا تھا، تاکہ آگے چل کر ان سے شرعی مسائل مستنبط ہو سکیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں طلبہ کو باقاعدہ سند جاری کرنے کا رواج شروع نہیں ہوا تھا، لیکن مختلف صحابہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ مختلف علوم میں ان کی مہارت کو زبانی سند دربار رسالت سے جاری ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ ان اصحاب سے ان کے اختصاصی علوم میں رجوع کریں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب ؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ کی قرآن فہمی کی گواہی دی، حضرت عمر ؓ کے مجموعی علم کی تعریف کی، علم فرائض، علیٰ ہذا علم حساب میں حضرت زید بن ثابت ؓ کی مہارت اور عدالتی امور میں حضرت علی ؓ کی صلاحیتوں کو سراہا۔ حضرت معاذ بن جبل ؓ کے بارے میں ارشاد ہوا کہ وہ حلال و حرام کا سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔

خالص دینی علوم کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے رائج الوقت مفید علوم کے سیکھنے کی نہ صرف ترغیب دی، بل کہ خود اس کا اہتمام فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ نشانے بازی، پیراکی، حساب، علم میراث، طب، علم الہیئت، فلکیات، علم انساب اور علم تجوید کی تعلیم ضرور دی جائے۔ نشانے بازی کے مقابلے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نگرانی میں کرایا کرتے تھے۔ ہدایت تھی کہ اپنے بچوں کو تیرنا اور نشانے بازی ضرور سکھاؤ۔

ان امور کے لیے جس چیز کی ضرورت پڑتی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سیکھنے کے لیے کسی مناسب آدمی کو مقرر کر دیتے تھے۔ حضرت زید بن ثابت ؓ، جنہوں نے صفہ میں ہی علم حاصل کیا اور جنگ بدر کے مشرک قیدیوں سے لکھنا سیکھا تھا، نہایت ذہین اور خوش خط تھے۔ علم فرائض اور حساب میں آپ کی مہارت کو خود سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے سراہا تھا۔ حضرت زید ؓ دربار رسالت کے گویا کاتب خاص تھے۔ معاہدات کا لکھنا اور دوسری رازدارانہ خط و کتابت آپ کے سپرد تھی۔ اپنے شوق سے مدینہ منورہ آنے جانے والے مسافروں سے فارسی اور حبشی زبانیں سیکھیں۔ ایک مرحلے پر جب یہ محسوس ہوا کہ عبرانی زبان جاننے والا کوئی قابل اعتماد شخص ہونا چاہیے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عبرانی بھی سیکھنے کا حکم دیا۔ حضرت زید بن ثابت ؓ نے چند ہفتوں کی قلیل مدت میں عبرانی زبان میں بھی مہارت حاصل کر لی۔

مدینہ منورہ میں صفہ واحد درس گاہ نہ تھی، بل کہ یہاں اور بھی بہت سی مسجدیں خود عہد نبوی میں موجود تھیں اور قرب وجوار کے لیے درس گاہ کا کام انجام دیتی تھیں۔ مدینہ منورہ سے چند میل دور قبا کی مشہور مسجد میں بھی ایک درس گاہ قائم تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً فوقتاً اس کا معائنہ فرماتے رہتے تھے اور اگر کوئی نامناسب بات دیکھتے تو فوراً منع کر دیتے تھے۔ دور دراز کے مقامات پر بھی جوں جوں اسلام پھیلتا جاتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم معلمین مقرر فرماتے جاتے تھے۔ مختلف قبائل کے وفود آ کر اسلام قبول کرتے تو واپسی میں ان کے ہم راہ کسی نہ کسی

تربیت یافتہ اور تجربہ کار صحابی کو بھیج دیا جاتا تھا۔ ایک بار نجد کے علاقے میں تعلیم دینے کے لیے ۷۰ اہل علم صحابہ کی ایک جماعت بھیجی گئی، جن کو مشرکین نے بیر معونہ کے مقام پر دھوکے سے شہید کر دیا۔ ان اہل علم صحابہ کی شہادت کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر صدمہ ہوا کہ آپ مسلسل ایک ماہ تک قنوت نازلہ پڑھتے رہے اور دشمنوں کو بد دعا دیتے رہے۔

بعض اوقات کسی کو گورنر یا حاکم مقرر کرتے تو تعلیم کی ذمے داریاں بھی ذاتی طور پر اس کے سپرد کی جاتی تھیں۔ عمرو بن حزم کو جب یمن کا گورنر مقرر کیا تو ان کو خاص طور پر تاکید کی کہ لوگوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ کی تعلیم کا بندوبست اور نگرانی کریں۔ طبری کے بیان کے مطابق یمن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ناظر تعلیمات بھی مقرر کیا تھا، جس کا کام یہ تھا کہ مختلف اضلاع کا دورہ کر کے وہاں کی تعلیمات کی نگرانی کرتا رہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے علاقوں میں بھی ایسے ناظر تعلیمات مقرر کیے گئے ہوں۔

غزوۂ بدر کے جو قیدی فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل نہ کر سکتے تھے، ان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں تو وہ چھوڑ دیے جائیں گے۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔ باہر سے جو مہاجر آتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو انصار کے حوالے کر دیتے کہ وہ مہمان داری کے ساتھ ان کو قرآن پاک کی تعلیم بھی دیں۔ وفد عبد القیس اور وفد بنی تمیم اور ایسے ہی کئی اور دوسرے وفود کے ارکان مدینہ منورہ میں رہ کر قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد کے امرا و عمال کو کتاب و سنت کی تعلیم دینے کا حکم دیتے اور اس کو ان کے لیے فرض قرار دیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن سعید بن العاص ؓ کو خاص طور سے حکم دیا کہ مدینہ منورہ کے لوگوں کو لکھنا سکھائیں۔ علامہ سمہودی نے وفاء الوفاء میں تقریباً چالیس ایسی مسجدوں کا ذکر کیا ہے، جو عہد رسالت میں مدینہ منورہ میں موجود تھیں اور ان میں باقاعدہ تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کی تعلیم کا بھی پورا اہتمام کیا۔ ہفتے میں ایک روز آپ نے خواتین کی خصوصی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مقرر فرمایا تھا، جس میں آپ خود ان کے اجتماع میں جا کر ان کو تعلیم دیتے تھے۔ خود ازواج مطہرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خصوصی نگرانی میں وہ تعلیم و تربیت دی، جو اسلامی پردے کے احکام کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست دوسری عام خواتین کو نہیں دے سکتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خواتین کی تعلیم کا یہ سلسلہ ازواج مطہرات نے جاری رکھا۔ ازواج مطہرات میں علمی اعتبار سے حضرت عائشہ کو عظیم مرتبہ حاصل تھا۔ ان کو قرآن و سنت، فقہ، ادب، شاعری اور علم طب میں بڑا درک حاصل تھا۔ ازواج مطہرات کو خود تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ حضور اس کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ دوسری پڑھی لکھی خواتین سے بھی ان کی تعلیم مکمل کرادیں۔ چناں چہ ازواج مطہرات میں حضرت حفصہ ؓ اور ام سلمہ ؓ اس باب میں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ حضرت حفصہ کو خاص آں حضرت ؐ کے حکم سے ایک تعلیم یافتہ خاتون شفابن عبداللہ عدویہ ؓ نے لکھنا اور پڑھنا سکھایا۔

ازواج مطہرات ؓ میں سے حضرت عائشہ ؓ اور حضرت ام سلمہ ؓ کی زندگی طویل رہی، اس لیے ان دونوں امہات المومنین سے برابر علمی استفادہ کیا گیا۔ صحابہ کو جب بھی کسی معاملے میں اشکال ہوتا تو وہ حضرت عائشہ ؓ سے دریافت کرتے۔ دوسری صحابیہ خواتین بھی ان سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں۔ ایک صحابی ایسے ہی ایک موقع کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم لوگ مشہور صحابیہ خاتون ام درداؓ کے ہاں گئے اور وہاں علمی گفت گو کرنے لگے۔ کافی دیر گزر گئی تو ہم نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں، بل کہ علمی مذاکرے سے بڑھ کر کوئی چیز مجھے محبوب ہے ہی نہیں۔

علمی مذاکرے اور مباحثے صحابہ اور صحابیات میں نہایت پسندیدہ اور ضروری سمجھے جاتے تھے۔ حضرت انس ؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درس سے فارغ ہوتے تھے تو آپس میں مذاکرہ ضرور کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہم

لوگ پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ ہوتے تھے اور ہر شخص باری باری دہراتا تھا۔ اس سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی تھی کہ جو پڑھا ہے، گویا وہ دل پر لکھا گیا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کا لحاظ فرماتے تھے کہ تعلیم دینے میں تدریج اور سہولت سے کام لیں۔ ایک بار ہی اتنا نہ پڑھاتے کہ لوگ یاد نہ رکھ سکیں اور اکتا جائیں۔ جن لوگوں کو معلم بنا کر باہر بھیجتے، ان کو بڑی تاکید فرماتے تھے کہ نرمی سے کام لینا، لوگوں کو مشکل میں مبتلا مت کرنا، لوگوں کو برگشتہ اور متنفر نہ کرنا، بل کہ حوصلہ افزائی کرنا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام تفریح اور مردانہ کھیلوں کی طرف بھی پوری پوری توجہ دیتے تھے۔ گھڑ سواری، دوڑ، تیرنا، نیزہ بازی کی مشق، کشتی اور اس طرح کے کھیل جوان دنوں رائج تھے، مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی اور سرپرستی میں کھیلے جاتے تھے۔ اول آنے والوں کو خود دربار رسالت سے انعامات بھی ملتے تھے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک بار گھڑ دوڑ میں حصہ لیا۔ گھڑ دوڑ کا انتظام حضرت علیؓ کے سپرد تھا۔

عہد نبوی میں جس نظام تعلیم کی بنا ڈالی گئی تھی، وہ خلافت راشدہ اور بالخصوص حضرت عمرؓ کے دور میں اپنی پوری ترقی کو پہنچا۔ حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ ممالک میں بستی بستی اور گاؤں گاؤں قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام کیا، باقاعدہ تن خواہ دار اساتذہ مقرر کیے، بچوں کے لیے الگ مکتب، یعنی پرائمری اسکول قائم ہوئے، جہاں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے، شہ سواری وغیرہ کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ یہ تعلیم جبری تھی اور ہر شخص کے لیے لازمی تھی، حتیٰ کہ قیدیوں کو بھی جبراً پڑھایا جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک صاحب ابو عامر سلیم نوعمری میں جنگی قیدی بن کر آئے تھے اور جبری تعلیم پا کر بڑے محدث بنے۔ حضرت عمرؓ نے قرآن مجید کی بعض ضروری اور اہم سورتوں پر مشتمل ایک منتخب نصاب بھی مرتب کیا، جس کی بابت حکم دیا کہ اس کا تفصیلی مطالعہ ہر شخص کے لیے ضروری ہو گا، کیوں کہ ان میں احکام و فرائض مذکور ہیں۔ حضرت عمرؓ کے دور میں بڑے بڑے شہروں میں قرآن

مجید کی اعلیٰ تعلیم کے مراکز قائم ہوئے۔ شام کے تین بڑے شہروں دمشق، حمص اور فلسطین میں حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عبادہ بن صامتؓ اور حضرت ابو درداؓ جیسے کبار صحابہ قرآن مجید کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے۔ حضرت ابو درداؓ کے درس میں ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک روز شاگردوں کی تعداد شمار کرائی گئی تو سولہ سو ان کے حلقۂ درس میں موجود تھے۔ وہ فجر کے وقت دس دس طالب علموں کی جماعت بنا کر اپنے کسی تجربہ کار فارغ التحصیل شاگرد کی نگرانی میں دے دیتے تھے اور خود ٹہلتے جاتے اور پڑھنے والوں کی طرف کان لگائے رہتے تھے۔ جب کوئی طالب علم پورا قرآن مجید یاد کر لیتا تو براہِ راست حضرت ابو درداؓ کی شاگردی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں عربی زبان وادب کو بھی لازمی مضمون کی حیثیت دی گئی۔ اس کے علاوہ فقہ کی اعلیٰ تدریس کے لیے چند اہل علم صحابہ کو بڑی تعداد میں حضرت عمرؓ نے مختلف شہروں میں مامور کیا۔ فقہ کی تدریس کے لیے بعض صحابہ کو تن خواہیں بھی دی جاتی تھیں۔ ابو مسلم خولانی کا بیان ہے کہ حمص کی جامع مسجد میں تیس بڑے بڑے صحابہ فقہ کا درس دیتے تھے۔ ان میں جب کوئی اختلاف یا شک پیدا ہوتا تو حضرت معاذ بن جبلؓ کی طرف رجوع کرتے تھے، جو گویا اس شریعہ فیکلٹی کے سربراہ تھے۔

ان انتظامات کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ بازار میں کوئی ایسا شخص کاروبار نہ کرے، جو علم فقہ نہ جانتا ہو۔ حضرت عمرؓ ایسے لوگوں کو سزا دیتے تھے جو فقہ نہ جاننے کے باوجود بازار میں بیٹھیں۔ اس طرح آپ نے بازاروں کو تجارت گاہوں کے ساتھ ساتھ درس گاہیں بھی بنا دیا، جہاں لوگ باتوں باتوں میں فقہ سیکھتے جاتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں علم جغرافیہ کی خصوصی تربیت کے بھی شواہد ملتے ہیں۔ وہ مختلف مفتوحہ ممالک کے جغرافیائی سروے کرنے کے لیے ماہرین کی جماعتیں بھیجتے رہتے تھے۔ اس طرح کی ایک سروے رپورٹ حضرت عمرو بن العاصؓ نے بھیجی تو وہ اس قدر جامع اور تفصیلی تھی کہ حضرت عمرؓ پکار اٹھے: اے عاص کے بیٹے! خدا کی

کو جزائے خیر دے، تم نے تو ایسی رپورٹ بھیجی ہے جیسے کہ میں خود مصر کو دیکھ رہا ہوں۔ عرصہ ہوا مشہور فرانسیسی اخبار لہ فگارو نے اس رپورٹ کا ترجمہ شائع کیا تھا اور لکھا تھا کہ اس کو بلاغت، جامعیت اور واقفیت کے ایک اعلیٰ نمونے کے طور پر تعلیمی اداروں کے لازمی مطالعے میں شامل کیا جائے۔ حضرت علیؓ کے دور میں عربی گریمر کے اصول بھی آپ کی ذاتی نگرانی میں مرتب ہوئے اور غیر عرب طلبہ کے لیے نصابِ تعلیم میں ایک نئے مضمون کا اضافہ ہوا۔

اکیسویں صدی کے تعلیمی تقاضوں پر گفت گو اور غور و خوض کے لیے اس تمہید کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے سامنے بیسویں صدی کے تعلیمی تجربے کا پورا نقشہ موجود ہو اور ہم اس تجربے کے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں کا کامل شعور رکھتے ہوئے مستقبل کی تصویر گری کریں۔ ماضی سے صرف نظر کر کے نہ حال کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کی جا سکتی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

سر زند از ماضیٔ تو حالِ تو
خیزد از حال تو استقبالِ تو
مشکن از خواہی حیاتِ لازوال
رشتۂ ماضی و استقبال و حال

بیسویں صدی میں نہ صرف مسلمانانِ برصغیر، بل کہ مسلمانانِ عالم کے تعلیمی تصورات و نظریات ایک بڑی تبدیلی، بل کہ قلبِ ماہیت کے عمل سے گزرے ہیں۔ دینی تعلیم کی سابقہ ضروریات اور تقاضے اب اس دور میں غیر متعلق قرار پائے، قدیم فنی تعلیم کو نئی سائنس اور ٹیکنالوجی نے شکست دے دی، مسلمانوں کے روایتی اجتماعی اور انسانی علوم کو نئے حقائق کے پیشِ نظر از کار رفتہ سمجھ لیا گیا، نئی سائنسی تعلیم جس سے کسی قدر خیر اور مثبت پیش رفت کی امید تھی، مسلمانوں کے لیے شجرِ ممنوعہ قرار پا گئی۔ گویا بیسویں صدی قدیم نظام ہائے تعلیم کی مکمل شکست و ریخت اور نت نئے تعلیمی تجربات کی صدی ہے، لیکن بیسویں صدی کے نصفِ اول میں کیے

جانے والے تعلیمی تجربات میں جو چیز سب سے نمایاں اور قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے کسی بھی عنصر کا فقدان تھا۔ حتیٰ کہ خود علی گڑھ کالج میں، جو مسلمانوں میں مغربی تعلیم کے فروغ کی خود مسلمانوں کی طرف سے پہلی کام یاب اور سنجیدہ کوشش تھی، عرصۂ دراز تک سائنس اور ٹیکنالوجی کو بازیابی حاصل نہ ہو سکی اور سرسید کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا کہ ہمارے دائیں ہاتھ میں فلسفہ ہو، بائیں ہاتھ میں سائنس ہو اور سر پر لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ کا تاج ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ کالج کے قیام سے لے کر نصف صدی سے زائد عرصے تک وہاں مغربی فلسفے، انگریزی ادبیات، قانون اور اجتماعی علوم کا ہی غلغلہ رہا۔ علی گڑھ نے مغربی افکار اور مغربی تہذیب کے تو کئی اچھے شارح اور مبصر پیدا کیے، لیکن کوئی قابل ذکر سائنس دان نہ پیدا کیا۔ یہی حال خالص دینی علوم کا رہا۔ نہ صرف علی گڑھ، بل کہ کسی بھی جدید درس گاہ نے دینی علوم و معارف کے ایسے متخصصین پیدا نہیں کیے، جن کی علمی بصیرت اور دینی راہ نمائی پر عامۃ الناس بھروسا رکھتے ہوں۔ گزشتہ سو سال کے دوران برصغیر کی قریب قریب تمام دینی شخصیات کی بنیادی فکری تشکیل اور مذہبی ساخت قدیم طرز ہی کے اداروں میں، قدیم طرز ہی کے علما کے ہاتھوں ہوئی۔ برصغیر میں عامۃ الناس کی دینی زندگی پر بھی جن اہل علم کے اثرات نمایاں رہے ہیں، ان سب کی دینی تربیت قدیم طرز ہی کے علما کی مرہون منت رہی، لیکن قدیم دینی تعلیم کی اس غیر معمولی اثر انگیزی کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ دینی تعلیم کے ادارے علمی اور فکری میدانوں میں تیزی سے اپنی معنویت کھوتے چلے جا رہے ہیں۔ بلاشبہ انہوں نے عامۃ الناس کی اسلام سے جذباتی وابستگی برقرار رکھنے میں بے مثال کردار کا مظاہرہ کیا ہے، لیکن اس تکلیف دہ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دور جدید کے فکری اور علمی سرمائے اور اس کے اثرات میں ایک طوفان بلاخیز کی سی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور قدیم دینی روایت نے اس کے آگے بند باندھنے میں کوئی قابل ذکر کام یابی حاصل نہیں کی۔ جن دینی شخصیات کو اس

باب میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی، وہ خالص دینی روایت کے سو فیصد نمائندہ نہیں کہے جا سکتے۔

اجتماعی اور انسانی علوم کی سطح پر دیکھیے تو قدیم تعلیمی روایت کی سپر اندازی اور جدید مغربی تصورات کی اثر انگیزی کی رفتار اور بھی زیادہ حیرت انگیز نظر آتی ہے۔ آج اجتماعی اور انسانی علوم کی اصطلاح کا مطلب ہی مغرب کے اجتماعی اور انسانی علوم کا تصور ہے۔ آج یہ بات بیش تر تعلیم یافتہ لوگوں کی نظروں سے او جھل ہو چکی ہے کہ اجتماعی اور انسانی علوم میں مسلمانوں کی شان دار روایات کیا ہیں؟ تاریخ کا اسلامی تصور، اجتماعی اخلاقیات کی بابت قرآنی اصول و ہدایات، قوموں کے عروج و زوال کے الٰہی احکام، منطق استقرائی، علم حضوری بہ مقابلہ علم حصولی اور اس طرح کے دوسرے بہت سے میدانوں میں اسلامی تعلیم اور مسلم اہل دانش کی کاوشوں سے آج کا تعلیم یافتہ طبقہ بڑی حد تک ناآشنا ہے۔ مغرب کی سائنس اور ٹیکنالوجی کو نظر انداز کر کے وہاں کے سیکولر اور مادہ پرستانہ اجتماعی اور انسانی علوم کو جوں کا توں بغیر کسی تنقیدی رویے کے دل و جان سے اپنا لینے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج کے بیش تر تعلیم یافتہ حضرات فکری لحاظ سے سیکولر اور طرزِ عمل کے اعتبار سے غیر شعوری طور پر مادہ پرست بن چکے ہیں۔ زبانی اعلانات اور جذباتی اظہار کی حد تک اسلام سے وابستگی بھی وقت کے ساتھ ساتھ کم زور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ بنیادی طور پر یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل سے مغربی افکار و نظریات کی بنیاد دو چیزوں پر رہی ہے:

۱۔ سیکولر اور لادینیت، یعنی مذہب اور اجتماعی زندگی کی علیحدگی کا تصور۔

۲۔ نظریۂ ارتقا، جس کی ڈارونی تفصیلات نے اخلاق و مذہب کی رہی سہی بنیاد کو بھی ڈھا دیا۔

ان دونوں بنیادوں نے مغرب کے اجتماعی اور انسانی علوم کے مزاج اور انداز کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا بھر میں تعلیم کا سارا تصور، علوم کا سارا دھارا اور افکار و نظریات کا پورا مزاج سیکولر اور لامذہبی ہو کر رہ گیا

ہے۔ نہ صرف مغربی ممالک میں، بل کہ بیش تر مشرقی ممالک میں (چند ایک کے جزوی استثنا کے ساتھ) نظام تعلیم کا اصل وظیفہ یہ رہ گیا ہے کہ مغرب کی فکری بالادستی اور تہذیبی امامت اور سیاسی واقتصادی بالادستی کے تسلسل اور بقا کے لیے کام کرتی رہیں، وہ تہذیبی امامت، جو مغرب نے گزشتہ دو سو سالہ استعماری دور میں قائم کی ہے۔

یہ صرف مغرب کے ساتھ ہی خاص نہیں، دنیا کے ہر بڑے اور قابل ذکر نظام تعلیم نے ہمیشہ اس تہذیب اور تمدن وثقافت کو پروان چڑھانے میں مقدمۃ الجیش کا کردار ادا کیا ہے، جس میں اس نظام نے جنم لیا ہو۔ دنیا کی ہر زندہ قوم اپنے نظام تعلیم کو اس طرح مرتب کرتی ہے کہ اس کے نتیجے میں جو نسل پروان چڑھ سکے اور جو قوم تیار ہو سکے، وہ اس نظریے کی علم بردار، اس تہذیب پر کاربند اور اس تمدن کی نقیب ہو، جس کے تحفظ کے لیے وہ نظام تعلیم ترتیب دیا جاتا ہے۔ دور جدید میں مغرب کے تعلیمی تصورات کے بارے میں بڑی مرعوبیت اور سادہ لوحی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ نظریے اور اخلاق کے بارے میں غیر جانب دار ہیں، حال آں کہ تھوڑے سے تامل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ مغرب کا سارا نظام تعلیم (اپنے اندرونی تنوع اور داخلی اختلاف کے باوجود) ایک معاملے میں یک سو ہے اور وہ مغربی تہذیب وتمدن کی موجودہ اساس (سیکولرازم اور آزاد معیشت) ہے، جس کے بارے میں وہاں کوئی نرمی یا مداہنت نہیں پائی جاتی۔ یہ بات کہ مغربی علوم وفنون کی ساخت مادہ پرستانہ اور لادینی ہے، یوں تو دور جدید کے تمام علوم وفنون پر صادق آتی ہے، لیکن اس مرض، بل کہ سرطان کا سب سے زیادہ شکار اجتماعی اور انسانی علوم ہوئے ہیں۔ یہاں ان تمام علوم کا الگ الگ مفصل جائزہ تو دشوار ہے، تاہم بات واضح کرنے کے لیے دو ایک مثالیں دینا بے محل نہ ہو گا۔

سوشل سائنسز اور انسانیات کے دائرے میں آج کے مقبول علوم میں معاشیات اور بشریات، یعنی انتھروپالوجی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آج کے مغربی علم معاشیات کا آغاز ان تصورات اور تجارتی رواجات سے ہوا، جو یورپ میں صنعتی انقلاب کے

دوران پیدا ہوئے۔ آزاد تجارت، سودی کاروبار، غیر محدود نفع اندوزی، پیداوار کی وسعت اور صرفی معاشرے کا فروغ، یہ وہ چند بنیادی عناصر ہیں، جن سے جدید معاشی فکر نے جنم لیا ہے۔ یہ جدید معاشی فکر جس کا زور وشور سے یہ دعویٰ ہے کہ وہ اقدار کے معاملے میں غیر جانب دار اور لااقداری، یعنی Value Neutral or Amoral ہے، اسلامی اقدار و تصورات سے جگہ جگہ متصادم ہے۔ اول تو اقدار کے معاملے میں غیر جانب دار ہونا ہی اسلام سے انحراف کا پہلا قدم ہے۔ دوسرے یہ دعویٰ بھی محل نظر ہے کہ جدید معاشی فکر لااقداری ہے۔ اس فکر کے بنیادی عناصر کا بہ غور جائزہ لیا جائے تو یہ بے شمار اقدار شر اور عناصر مادیت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

اس مادہ پرستانہ معاشیات نے جو ذہن اور مزاج بنایا ہے، اس کا سب سے بڑا نقصان ایک بالغ نظر مفکر کی رائے میں یہ ہے کہ اس سے نہ صرف انسان پر سرمائے کی فوقیت قائم کر دی گئی ہے، بل کہ پورے معاشی نظام اور تجارتی سرگرمی کو اس طرح مرتب کر دیا گیا ہے کہ اس میں انسان کی حقیقی ضروریات، انسان کا مقام و مرتبہ اور انسان کی اعلیٰ اخلاقی اور بہتر روحانی ضروریات تو دور کی بات ہے، انسان کی بہ حیثیت انسان خالص جسمانی اور فطری ضروریات کی تکمیل بھی ایک ثانوی درجے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس فکر میں سرمائے کو صرف سرمایہ کھینچتا اور بڑھاتا ہے۔ مغرب کی مادہ پرستانہ معاشیات کے فروغ اور انسان پر سرمائے کی فوقیت نے جو بے شمار منفی نتائج پیدا کیے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ سود کی لعنت۔

۲۔ ارتکاز دولت۔

۳۔ معاشرے کی طبقات میں تقسیم۔

۴۔ معاشرے کے ناداروں اور حاجت مندوں، قرآن کی بلیغ اصطلاح میں مستضعفین کی تعداد میں روزافزوں اضافہ۔

۵۔ دولت کے اجارہ داروں اور قرآن کی بلیغ اصطلاح میں مترفین کی تعداد، قوت اور اثر ورسوخ میں اضافہ۔

۶۔ کم زور اور زیرِ دست اقوام کا دست یاب ذرائع پیداوار کا نامکمل اور ناکافی استعمال۔

۷۔ بالادست اور بااثر اقوام کو دست یاب دولت اور ذرائع پیداوار کا مزید دولت اور مزید ذرائع پیداوار کے حصول کے لیے استعمال۔

۸۔ معاشرے کی خالص اخلاقی، روحانی، فکری، تمدنی اور تہذیبی ضروریات کے لیے وسائل کا کم سے کم استعمال اور ان مقاصد کے لیے پہلے سے موجود سرمائے کی حتی الامکان واپسی اور باز خواست۔

۹۔ اس آخری نتیجے کا مزید نتیجہ یہ نکلا کہ اب تعلیم اور صحت، دونوں کو تجارت بنا دیا گیا ہے۔ اب معاشرے کی یہ دونوں بنیادی ضروریات جو اسلامی تعلیم کی رو سے فرض عین اور فرض کفایہ کا درجہ رکھتی ہیں، صرف کاروبار اور تجارت کا موضوع بن گئی ہیں۔ جس طرح ماضی میں لوگ تجارت میں سرمایہ کاری کیا کرتے تھے اور نفع کے امیدوار رہتے تھے، اسی طرح آج تعلیم اور صحت کے میدانوں میں سرمایہ کاری کی جاتی ہے اور نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے یہ کاروبار کرنے والے کروڑوں، بل کہ اربوں کے مالک بن جاتے ہیں۔ اب یہ وبا مسلم معاشروں میں بھی پھیلتی جا رہی ہے، جہاں ایک زمانے میں تعلیم اور صحت کی فیس یا معاوضہ لینا ایک گھناؤنا انسانی جرم سمجھا جاتا تھا۔ آج بھی پاکستان کے خالص دینی اداروں کی تعلیم بالکل مفت ہے۔ آج بھی قدیم طرز کے اطبا کی بڑی تعداد مریض کو دیکھنے کی کوئی فیس وصول نہیں کرتی۔ خود ہمارے اسی ملک میں سعید ملت حکیم محمد سعید مرحوم نے پچاس سال کے دوران قریب قریب نوے لاکھ مریضوں کا علاج کیا، لیکن کسی سے ایک پیسہ بھی فیس وصول نہیں کی۔

۱۰۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اب مذہب بھی سامانِ تجارت بننا شروع ہو گیا ہے:

چہ ملائی چہ درویشی چہ سلطانی چہ دربانی
فروغ کار می جوید بسالوسی ورزاقی

ہم گزشتہ ایک سو چونسٹھ سال سے اپنی بیش تر کاوشیں، سرگرمیاں، توانائیاں

اور وسائل ان علوم کو پڑھنے پڑھانے میں صرف کر رہے ہیں۔ ہماری ساری تعلیمی کوششیں اور وسائل واسباب ابھی تک عملاً اسی ہدف کے حصول کے لیے استعمال ہو رہے ہیں، جو ۱۸۳۴ء میں میکالے نے طے کر دیا تھا، یعنی ایک ایسی نسل کی تیاری جو یہاں کے کروڑوں باشندوں اور انگریزوں (اب امریکیوں) کے درمیان ترجمانی کا فریضہ انجام دے سکے، ایسی نسل جو رنگ ونسل میں تو ہندوستانی (اب پاکستانی) ہو اور رائے اور ذوق اور مزاج ومذاق میں برطانوی (اب امریکی) ہو۔

اس روایت کے مطابق جو نسلیں تیار ہوئی ہیں، ان میں سے بعد میں آنے والی ہر نسل کا رویہ اپنے سے پہلی نسلوں کے مقابلے میں مشرقی تہذیب سے دوری اور مشرقی زبانوں سے بے خبری کی وجہ سے روز بہ روز معاندانہ اور تمسخرانہ ہوتا چلا گیا ہے۔ من جھل شیئاً عاداہ کی قدیم عربی ضرب المثل کے مصداقات اس طبقے میں بہ کثرت روز نظر آتے ہیں۔ اس طبقے کی ہر نئی پود پہلے سے زیادہ انگریز یا امریکی بننے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ اس طبقے کے نزدیک مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کو تو عرصہ ہوا اچھوت کا درجہ حاصل ہو چکا، اب مذہب کی باری معلوم ہوتی ہے۔ حال ہی کے ایک سروے کے مطابق مغربی ماحول میں تعلیم پانے والی ''مسلمان'' نوجوان نسل کی ایک خاصی تعداد اپنے کو لامذہب اور ملحد قرار دیتی ہے۔ چند ماہ قبل ایسا ایک سروے امریکا میں کیا گیا، جہاں اسی نوے لاکھ مسلمان بستے ہیں۔ اس سروے کی رو سے کم وبیش ایک تہائی ''مسلم'' نوجوانوں نے اپنے آپ کو لامذہب اور ملحد ٹھہرایا۔

تعلیم کی قلم رو سے مذہب واخلاق کی ملک بدری کے ابتدائی اثرات کا اندازہ علامہ اقبال نے آج سے کم وبیش ۷۰، ۸۰ سال قبل کر لیا تھا۔ اس وقت تک یہ وبا صرف یورپ تک محدود تھی اور مسلم ممالک کافی حد تک اس سے آزاد تھے۔ علامہ اقبال نے تعلیم میں مذہب کو ایک موثر عنصر کی حیثیت سے شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا تھا:

> مذہب قوم میں ایک متوازن سیرت پیدا کرتا ہے، جو حیاتِ ملی کے مختلف پہلوؤں کے لیے بیش بہا سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہ حیثیت

مجموعی یورپ نے اپنے باشندوں کی تعلیم و تربیت میں سے مذہب کا عنصر حذف کر دیا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس بے لگام انسانیت کا حشر کیا ہو گا۔

مسئلہ محض مذہب و اخلاق کی زبوں حالی اور لادینیت کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے عفریت کا ہی نہیں، خالص مادی ضروریات کی تکمیل کا بھی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مغربی افکار و نظریات میں رچی بسی اور مغربی علوم و فنون سے آراستہ اس نسل نے ملک و ملت کو کسی مادی ترقی سے واقعتاً ہم کنار کر دیا ہے؟ کیا تعلیم کی اس ہمہ ہمی نے سچ مچ ہمیں اقوام عالم کی صف میں کھڑا کر دیا ہے، جس کا سبق روز اول سے نئی نسل کو سکھایا جاتا ہے؟ افسوس کہ ان سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ مزید دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ خالص مادی مفادات کی میزان میں بھی یہ سودا ہلکا ہی ہے۔

تعلیم یافتہ، بل کہ ڈگری یافتہ بے کاروں کی آج نسلیں کی نسلیں ہمارے مسائل میں روز بہ روز اضافے کا سبب بن رہی ہیں۔ بے روز گاری آج ہمارے معاشی مسائل و مشکلات کی فہرست میں نمایاں مسئلہ، بل کہ شاید ام المسائل کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی بے کاری، بل کہ بہت سی صورتوں میں معاشرے کے لیے بے مصرفی صرف برصغیر پاک و ہند کا ہی مسئلہ نہیں ہے، تیسری دنیا کے ان تمام ممالک کو یہی صورت حال درپیش ہے، جنہوں نے مختلف مغربی ممالک کے سوشل سائنسز کو جوں کا توں اختیار کر کے اپنے ہاں نظام تعلیم کی اساس بنا رکھا ہے۔ اب جب کہ برس ہا برس کے بعد یہ احساس پیدا ہونا شروع ہوا ہے کہ اس تعلیم اور حقائق زندگی اور ضروریات زندگی کے مابین مطابقت کی بڑی کمی ہے تو اس کا جو حل سمجھا یا جا رہا ہے، وہ اعلیٰ تعلیم کی راشننگ، سیلف فائنانسنگ اور ایسی ہی تدابیر کی شکل میں ہے۔ اس پورے عمل کی افادیت پر از سر نو غور کر کے اس میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی ضرورت کا ابھی احساس عام نہیں ہوا۔ آخر ہم اس پر غور کیوں نہیں کرتے کہ ہمارے ہاں تعلیم بالغاں کی ساری اسکیمیں کیوں ناکام ہوتی

ہیں؟ دیہات کے بچوں کی بڑی تعداد سرکاری اسکولوں سے کیوں بھاگتی ہے؟ خواتین کی بڑی تعداد اس تعلیم کے حصول سے کیوں متنفر ہے؟ اس ناکامی، اس فرار اور اس تنفر کی ایک بڑی وجہ اس تعلیم کا غیر عملی، غیر حقیقی اور غیر افادی ہونا بھی ہے۔ چولستان کا ایک صحرائی باشندہ، ہزارہ کا ایک کوہستانی یا سندھ کے دیہات کا ایک کسان اپنے بچوں کو انگریزی زبان میں کتا، بلی، بھیڑیے اور خنزیر کے ناموں سے واقف کرا کے آخر کیا حاصل کرے گا اور کون سی مادی ترقی حاصل کر لے گا؟ اس بے مصرف تعلیم کا فوری نتیجہ اس کے نزدیک یہ نکلتا ہے کہ بچہ کھیت پر کام کرنے سے بھی جاتا ہے اور کچھ اور کرنے کے قابل بھی نہیں بنتا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم عملی نتائج کے اعتبار سے استعماری نظام تعلیم نے برصغیر کے لوگوں کو بالعموم اور یہاں کے مسلمانوں کو بالخصوص تعلیم سے محروم (Diseducate) کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ ملک کے ایک مشہور فاضل نے اپنی ایک تقریر میں ایک تعلیمی رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ انیسویں صدی کے اوائل میں پنجاب جیسے نسبتاً دور افتادہ صوبے میں خواندگی کی شرح مجموعی طور پر چوراسی فیصد اور مسلمانوں میں سو فیصد تھی، لیکن جدید تعلیم اور جدید تہذیب کی بارآوری کے سارے دعاوی کے باوجود جب سوا سو سال کے بعد ۱۹۴۷ء میں انگریز یہاں سے رخصت ہوا تو پنجاب کے مسلمانوں میں خواندگی کی شرح صرف چار فیصد رہ گئی تھی۔ گویا جس تعلیم و ترقی کا چرچا سو سال جاری رہا، اس کا ماحصل قوموں کو تعلیم سے محروم کرکے صرف وفاداروں اور چاپلوسوں کا طبقہ پیدا کرنا تھا۔

ان گزارشات کا یہ مطلب قطعاً نہ لیا جائے کہ یہاں تمام مغربی علوم وفنون کی افادیت سے انکار کیا جا رہا ہے۔ بلاشبہ بہت سے مغربی علوم وفنون ایسے ہیں کہ جن کی افادیت سے انکار کرنا واقعے اور حقیقت کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔ یہاں جو بات کہی جا رہی ہے، وہ یہ ہے کہ اول تو جن علوم وفنون میں واقعتاً افادیت تھی، ان سے اکثر وبیشتر یہاں کے لوگوں کو محروم رکھا گیا۔ دوسرے جو علوم وفنون رائج کیے گئے، ان کو جوں کا توں بلا تنقید مسلمانوں میں رائج کر دینے سے بہت سے منفی

اور خطرناک نتائج پیدا ہوئے۔

یہاں علم طب (ایلو پیتھی) کے بہ ظاہر خالص فنی اور مفید علم. کی مثال دینا غیر موزوں نہ ہو گا۔ بلاشبہ مغربی ایلو پیتھی نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ سرجری اور جراحی کے میدانوں میں مغربی ماہرین کی حالیہ کام یابیاں تبریک و تحسین کی مستحق ہیں، لیکن یہ ساری کام یابیاں بیش تر بیسویں صدی کے ربع آخر میں سامنے آئی ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں مغربی ایلو پیتھی کہاں کھڑی تھی؟ اس کے مقابلے میں چار ہزار سال پرانی آیورویدک اور ڈھائی ہزار سال پرانی طب یونانی اس وقت کس مقام پر فائز تھی؟ اس فرق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذرا اس نقصان کا اندازہ لگایے جو ایلو پیتھی کو برصغیر میں سرکاری سرپرستی میں رائج کرنے اور یہاں کی مقامی طبی روایات کو نظرانداز کر دینے، بل کہ کچل دینے کے نتیجے میں بھگتنا پڑا۔ طب کی تعلیم کے قدیم ادارے ایک ایک کر کے بند ہونا شروع ہو گئے، خدمت خلق کے خالص اسلامی تصور پر مبنی طبی روایات نے ایک ایک کر کے دم توڑنا شروع کر دیا، قدیم طبی تجربات اور معالجات پر تحقیق اور تجربے کا عمل رک گیا اور اطبا نے نوابوں اور درباروں سے وابستگی ہی میں اپنی بقا دیکھی۔ درباروں سے وابستگی کی وجہ سے طب کی ترجیحات بھی بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئیں۔

اس کے برعکس اگر برصغیر کے لوگ ایلو پیتھی پر اس طرح نہ ٹوٹتے، بل کہ اس کے مثبت پہلوؤں سے استفادہ کرتے اور نئے تحقیقی اسالیب سے کام لے کر قدیم طب کو ترقی دیتے تو آج کم از کم طب کے میدان میں تو وہ یقینا مغرب سے آگے ہوتے۔ آخر جس ابن سینا، جس رازی اور جس ابن بیطار کی کتابوں سے استفادہ کر کے اہل مغرب نے ایلو پیتھی کو ترقی دی، اسی ابن سینا، اسی رازی اور اسی ابن بیطار کی قوم کیسے پیچھے رہ سکتی تھی، اگر وہ اسی ناقدانہ اور مجتہدانہ بصیرت سے کام لیتی، جو ان ائمہ طب کا طرۂ امتیاز تھی؟

بیسویں صدی کی یہ تعلیمی صورت حال تھی، جس کے رد عمل کی تاریخ ہی دراصل برصغیر میں تعلیمی فکر کی تاریخ ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ

مغربی فکر کا تنقیدی جائزہ اور ایک نئی اسلامی فکر کی تدوین و تشکیل وہ میدان ہے، جہاں برصغیر کے اہل علم کا کام دنیائے اسلام میں سب سے نمایاں ہے۔ گہرائی اور تنوع میں برصغیر کی تعلیمی فکر کا درجہ دنیائے اسلام میں سب سے بلند اور سب سے نمایاں ہے۔ یہاں علم اور تعلیم کے باب میں خالص فکری کام بھی بہت ہوا ہے اور عملی تجربات بھی بڑی تعداد میں کیے گئے۔

برصغیر کے نمایاں مفکرین جنہوں نے جدید مغربی نظام تعلیم پر ناقدانہ نظر ڈالی، ان میں اکبرالٰہ آبادی، علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ ان حضرات نے نہ صرف مغرب سے درآمد شدہ تعلیمی نظریات و تصورات کے تنقیدی مطالعے کی نئی نئی جہتیں کھولیں، بل کہ مستقبل کے مسائل کی پیش بینی کر کے آئندہ کی راہیں بھی سجھائیں۔ یہاں ان سب حضرات کے تعلیمی افکار کا جائزہ لینا تو مقصود نہیں ہے کہ یہ ایک مستقل بالذات تصنیف، بل کہ تصانیف کا متقاضی موضوع ہے، البتہ ان حضرات نے مغربی تعلیمی نظام پر جو عمومی تبصرہ کیا ہے، اس کی چند مثالیں بیان کرنا بے محل نہ ہو گا۔

اکبرالٰہ آبادی کو جدید دنیائے اسلام کی تاریخ کا شاید وہ پہلا بالغ نظر مفکر قرار دیا جا سکتا ہے، جس نے مغربی فکر اور مغربی تہذیب و تمدن کی چکاچوند سے ذرہ برابر مرعوب ہوئے بغیر مغربی افکار کا گہری تنقیدی بصیرت سے جائزہ لیا اور اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو الگ الگ کر کے دکھایا۔ اکبرالٰہ آبادی نے خاص طور پر مغربی فلسفے، تصور تعلیم اور نظریۂ علم کو اپنی خصوصی توجہ کا موضوع بنایا۔ ان موضوعات پر ان کے بلیغ اور عمیق اشعار میں ایسے تیکھے تبصرے کیے گئے ہیں، جن سے مغربی فکر کے کم زور پہلو واضح ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔

اکبرالٰہ آبادی اور ان کے جلیل القدر نیاز مند اور معاصر علامہ اقبال دونوں کے کلام میں عقل اور دل، دو ذرائع علم کی علامتیں ہیں۔ عقل سے مراد وہ خالص مادہ پرستانہ اور عقلی علم ہے، جس کو روحانیت اور انسان کی روحانی ضروریات و حاجات

سے کوئی علاقہ نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں دل یا قلب سے مراد وہ گہرا روحانی شعور ہے، جس کی اساس وحی الٰہی اور انسان کے اعلیٰ روحانی جذبات واحساسات پر ہو۔ اکبر الٰہ آبادی کے نزدیک خالص عقل اور علم انسان کو حیرت اور شک میں مبتلا کر سکتا ہے، اس کو کوئی دیرپا سکون اور قلبی اطمینان عطا نہیں کر سکتا۔ کہتے ہیں:

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل اور علم و تجربے کے ساتھ ساتھ دل اور روحانیت کے تقاضوں کو کس طرح سمجھایا جائے؟ ظاہر ہے کہ نہ عقل سے استغنا برتا جا سکتا ہے اور نہ اکبر عقل کو نظرانداز کرنے کے قائل ہیں۔ وہ صرف عقل و قلب کے تقاضوں میں توازن پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ عقل کے ساتھ قلب کا عنصر شامل کرنے کے لیے روحانی تربیت اور فرد کی دینی تشکیل ضروری ہے۔ یہ مقصد اہل دین اور اہل دل کی صحبت اور تربیت سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اکبر الٰہ آبادی کو بڑی شدت سے اس امر کا احساس تھا اور وہ زندگی بھر اس کا اظہار بھی کرتے رہے کہ جدید مغربی تعلیم اپنے مزاج اور اٹھان کے اعتبار سے لادینی اور لامذہبی ہے۔ انہوں نے جابجا اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ اس تعلیم کے نتیجے میں جو نسل تیار ہو گی، وہ لامذہب اور اسلامی عقائد سے بے بہرہ ہو گی۔ وہ بار بار اپنے قارئین کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ جدید تعلیم کے مذہب شکن نتائج سے ہوشیار رہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی زوائد پر
گرا کے چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

ان کو اس بات کا دکھ تھا کہ علما اور دینی طبقوں کی صف اول کے لوگ اپنی روایات چھوڑ کر مغربی ثقافت اور تمدن کے علم بردار بنتے جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں:

فکر دنیا نے بھلایا سب وہ قرآن و حدیث
مولوی بھی محو قانون ونظائر ہو گیا

اکبر یہ سمجھتے تھے کہ مغربی نظام تعلیم محض چند نئے علوم وفنون کی تدریس کا نام نہیں، بل کہ یہ ایک مستقل بالذات ثقافت کا نقیب، ایک نئی تہذیب کا منادی اور ایک نئے تمدن کا علم بردار ہے۔ ان کو اس امر کا بہ خوبی اندازہ تھا کہ جیسے جیسے مغربی تعلیم کے نتائج سامنے آتے جائیں گے، مسلمانوں کی اجتماعی اور ملی زندگی کے اجزا ان کے اپنے ہاتھ سے نکلتے جائیں گے۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

علوم ان کے، زبان ان کی، پریس ان کے، لغات ان کے
ہماری زندگی کے سارے اجزا پر ہیں ہات ان کے

ستم بالائے ستم یہ کہ اس ساری نیاز مندی، اس مکمل خود سپردگی اور اس کامل سپر اندازی کے باوجود اہل مغرب نے اپنے وہ علوم وفنون، جن پر ان کی ترقی کا دارومدار تھا، یعنی سائنس کے اعلیٰ مضامین اور ٹیکنالوجی کے اونچے فنون، اپنے تک ہی محدود رکھے اور اہل مشرق کو ان کی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ اہل مشرق کے لیے صرف انگریزی زبان اور مغربی ادبیات، لسانیات، قانون، اجتماعی علوم اور فلسفے وغیرہ ہی کے ابواب وا تھے۔ بقیہ علوم وفنون کے دروازے ان کے لیے پہلے بھی بند تھے اور آج بھی بند ہیں۔ اکبر نے اس پہلو کی طرف لطیف اور ظریفانہ اشارے کیے ہیں:

علم پورا ہمیں سکھائیں اگر
تب کریں شکر مہربانی کا

اس بے مصرف علم کی نشرواشاعت کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم صرف ذریعۂ روزگار بن کر رہ گئی، اس لیے کہ ان علوم وفنون کی نشرواشاعت جنوبی ایشیا کے عوام اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے صرف اس حد تک کارآمد تھی کہ انگریزی دربار تک رسائی حاصل ہو جائے اور انگریزی حکومت میں نچلے درجے کی ملازمتیں حاصل ہو جائیں۔ اس مقصد سے ہٹ کر نہ ان چیزوں کی روزمرہ زندگی میں کوئی افادیت تھی اور نہ ہی ان معلومات کی بنیاد پر کوئی معاشی مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔

سرکاری ملازمتیں اس وقت بھی محدود تھیں اور اب بھی محدود ہیں، جب کہ پڑھنے والوں کی تعداد روز افزوں ہے۔ اس صورت حال میں بے روزگاری اور بے معرفی اس نظام تعلیم کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ اکبر نے اس صورت حال پر یوں تبصرہ کیا:

علمِ یورپ کا ہوا میداں وسیع
رزق میں ہندی کے تنگی ہو گئی

اکبر الٰہ آبادی اور علامہ اقبال دونوں یہ سمجھتے تھے کہ تعلیم اور نشر علوم کے نام پر مغرب کی یہ ساری سرگرمیاں اور اولوالعزمیاں کسی اور ہی مقصد کے لیے ہیں۔ ان کا مقصد نہ اہل مشرق کی تعلیم ہے اور نہ ہی ان کی تہذیبی ترقی، بل کہ ان کا اصل ہدف مغربی استعمار کے لیے سازگار فضا اور مناسب ماحول فراہم کرنا ہے۔ ان کا اصل مقصود اہل مشرق کے مزاج کو بدلنا اور افتادِ طبع کو اہل مغرب کی مصلحتوں کے مطابق ڈھالنا ہے:

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اکبر الٰہ آبادی نے جن خیالات کا اظہار اپنی طنزیہ شاعری کے ذریعے کیا تھا، ان کا انتہائی بھرپور، بلیغ، عالمانہ اور پرشکوہ اظہار علامہ محمد اقبال کی نظم و نثر میں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال جدید دور کے تعلیمی مفکرین میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے افکار میں جو وسعت، جو گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے، ان میں بیسویں صدی تو کیا، گزشتہ کئی سو سال میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ یہاں اقبال کے تعلیمی افکار پر کوئی مفصل گفت گو کا نہ موقع ہے اور نہ گنجائش، اس لیے کہ اقبال کے تعلیمی افکار پر متعدد علمی کتابوں کے علاوہ بہت سے تحقیقی مقالات بھی لکھے جا چکے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے یہاں اقبال کی تعلیمی فکر کے چند اساسی نکات کی طرف مختصر اشارے کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

عقل و دل کی کش مکش اور عقل و دل کے تقاضوں کے مابین توازن کا مسئلہ

اقبال کے تصور علم اور ماخذ علم کی بحث میں بنیادی مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب تک علم کے مصدر اور ماخذ اور اس کی آخری سند کا مسئلہ طے نہ ہو، علم کی قسمیں اور تعلیم کے مقاصد پر کوئی بامعنیٰ گفت گو ممکن نہیں ہے۔

اقبال کے نزدیک عقل و خرد کو علم و فکر کے باب میں ایک انتہائی اہم مقام حاصل ہے، لیکن عقل اگر قلب کے تقاضوں سے بے پروا ہو کر تن تنہا قیادت وسیادت کی ذمے داریاں سنبھال لے تو اس کا نتیجہ افراتفری اور انسانیت کی روحانی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے اقبال محض عقل پر تکیہ کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں:

تکیہ بر عقل جہاں بین فلاطوں نہ کنم
در کنارم دلکے شوخ و نظر بازے ہست
گرچہ شاہین خرد سرپروازے ہست
اندریں بادیہ پنہاں قدر اندازے ہست

اس کی وجہ یہ ہے کہ محض عقل کی بنیاد پر علم و حکمت کی جو عمارت تعمیر کی جائے گی، وہ انسان کی حقیقی ضروریات کی تکمیل سے قاصر رہے گی۔ عقل سے علم حصولی اور علم استدلالی تو حاصل ہو سکتا ہے، لیکن علم حضوری تک پہنچانے کے لیے عقل کی رہبری ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ جب تک عقل اور یقین مل کر راہ نمائی کا فریضہ انجام نہ دیں گے، انسانیت گم گشتہ راہ ہی رہے گی اور اس کے نتیجے میں جس علم و حکمت کا ظہور ہو گا، وہ انسانیت کے لیے کسی خیر کا ذریعہ نہ بن سکے گی۔ فرماتے ہیں:

خرد بے گانہ ذوق یقین است
قمار علم و حکمت بد نشین است
دو صد بوحامد و رازی نیرزد
بنا دانے کہ چشمش راہ بین است

علم و حکمت کو متوازن، متکامل اور متناسق بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں عقل و خرد کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ قلب و نظر کے تقاضوں کو بھی یک ساں

طور پر سمویا گیا ہو۔ اقبال اس علم کو کم بھری قرار دیتے ہیں، جس میں تجلیات کلیم اور مشاہدات حکیم ہم کنار نہ ہوں۔ اگر عقل و خرد اور قلب و نظر ایک دوسرے سے ہم کنار اور ہم آہنگ ہو جائیں تو توازن اور اعتدال خود بہ خود پیدا ہو جاتا ہے اور دونوں پہلوؤں کے افراط و تفریط کا آپ سے آپ تدارک ہوتا رہتا ہے۔ عقل کی طغیانی کا سد باب قلب و نظر سے، قلبی واردات کے عدم توازن کی اصلاح ہوش و خرد کی ترازو سے ہوتی رہتی ہے۔ اقبال نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم

اگر عقل و دل اور قلب و خرد یک جا نہ ہو سکیں اور ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو اقبال کا فیصلہ بلا تامل اور بلا تکلف قلب و نظر کے حق میں ہو گا۔ وہ اس عقل فلک پیما پر شب خون مارنے کے لیے تیار ہیں، جو قلب و نظر کی قید سے آزاد ہو:

بر عقل فلک پیما ترکانہ شب خوں بہ
یک ذرۂ درد دل از علم فلاطوں بہ
آں فقر کہ بے تیغے صد کشور دل گیرد
از شوکت دارابہ از فرد فریدوں بہ

اقبال نے جہاں مغربی تصور علم اور نظام تعلیم پر تنقید کی ہے، وہاں اس کے استعماری مقاصد اور نتائج بد کی نشان دہی کر کے ان سے اجتناب کرنے کی بھی جابہ جا تلقین کی ہے۔ اقبال اپنے طویل ذاتی مشاہدے، عمیق مطالعے اور عملی تجربے سے اس نتیجے پر پہنچے کہ مغرب میں علم کے مقاصد اصلاً استعماری ہیں۔ وہاں ظاہر میں خواہ کچھ بھی ہو، حقیقت بڑی بھیانک ہے۔ پیام مشرق میں خود اہل مغرب سے خطاب کر کے ان کو بتلایا ہے:

برون او ہمہ بزم، درون او ہمہ رزم
زبان او ز مسیح و دلش چنگیز است

اہل مغرب کی بیش تر کاوشوں کا ہدف کم زور اقوام کے وسائل پر قبضہ یا تصرف کر کے ان کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا ہے۔ کہتے ہیں:

امتے بر امتے دیگر چرد
دانہ ایں می کارد وآں حاصل برد

اقبال کا خیال تھا کہ مغرب کی یہ لادینی ساخت اور لامذہبی تعلیم نہ صرف خود اہل مغرب کو، بل کہ پوری انسانیت کو خطرناک نتائج سے دوچار کر دے گی۔ انہوں نے اس صدی کے آغاز ہی میں یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ مغرب کی تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی۔ اس پیش گوئی کے تقریباً تیس سال بعد انہوں نے ''پس چہ باید کرد'' میں لکھا:

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد
زیر گردوں رسم لادینی نہاد
مشکل حضرت انسان ازوست
آدمیت راغم پنہاں ازوست
درنگاہش آدمی آب و گل است
کاروانِ زندگی بے منزل است

اسی سلسلۂ بیان میں آگے چل کر کہتے ہیں کہ لادینی تصورات نے اہل مغرب کے طرز زندگی، ان کے تصور علم، حتیٰ کہ ان کے مذہبی تصورات پر بھی منفی اثرات ڈالے ہیں۔ فرماتے ہیں:

آہ از افرنگ واز آئین او
آہ از اندیشۂ لادین او
علم حق را ساحری آموختند
ساحری نے کافری آموختند

مادیت، لادینیت اور استعماری مقاصد کے سہ آتشہ نے کیا کیا خرابیاں پیدا کی ہیں، ان کا ذکر جابہ جا اقبال کی تحریروں میں ملتا ہے۔ زبور عجم میں فرماتے ہیں:

اے مسلمانان فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہر من اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب

اس تصور علم کا ایک واضح اور فوری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی ساری توجہ ازلی حقائق اور سرمدی معارف سے ہٹ کر فوری نوعیت کے مادی مظاہر پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں یقین و ایمان کی وہ کیفیت جو ازلی حقائق پر نظر رکھنے سے پیدا ہوتی اور قائم رہتی ہے، کمزور ہوتی جاتی ہے۔ بالآخر ان تمام امور کے بارے میں شک اور بے یقینی پیدا ہو جاتی ہے، جن پر دین کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ ''بند گی نامہ''میں جہاں غلامانہ ذہنیت رکھنے والی اقوام کے علوم و فنون اور آرٹ وغیرہ کا ذکر کیا ہے، وہاں فرماتے ہیں:

علم حاضر پیش آفل در سجود
شک بیفزود و یقین از دل ربود
بے یقیں را لذت تحقیق نیست
بے یقیں را قوت تخلیق نیست
بے یقیں را رعشہ ہا اندر دل است
نقش نو آوردن او را مشکل است
از خودی دور است و رنجور است و بس
رہبر او ذوق جمہور است و بس

علامہ اقبال نے مغرب کے نظریہ علم اور تصورات تعلیم پر بہت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی منظوم و منثور تحریریں اس باب میں انتہائی وقیع خیالات کی ترجمان ہیں۔ خاص طور پر پیام مشرق، زبور عجم اور ضرب کلیم میں تو انہوں نے تعلیم و تربیت اور فنون و ادبیات کے موضوع پر جو جواہر پارے عطا فرمائے ہیں، وہ جدید اسلامی فکر کا شاہ کار ہیں۔ ان کے خیالات کا خلاصہ تین عنوانات کے تحت یوں پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مغرب کا نظریۂ علم اور اس کی اساسات

۲۔ مقاصد علم غرب

۳۔ نتائج علم غرب

علامہ اقبال کی تحریروں میں مغرب کے نظریۂ علم کی جن بنیادوں کی نشان دہی کی گئی ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ سیکولرازم، یعنی مذہب وریاست اور دین و دنیا میں تفریق کا نو مسیحی تصور، جو دراصل پاپائے روم کے استبداد کے خلاف مسیحی حکم رانوں اور اقوام کی بغاوت کو فکری جواز فراہم کرنے کے لیے پیدا کیا گیا۔

۲۔ بہ طور ماخذ علم وحی والہام سے انکار، جو سیکولرازم کا ایک لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔

۳۔ عقل و مشاہدے کو واحد ذریعۂ علم قرار دینا، جو مذکورہ بالا پہلی دونوں بنیادوں کو تسلیم کر لینے کے بعد آپ سے آپ ماننا پڑتا ہے۔

۴۔ ان تینوں بنیادوں کے نتیجے میں وجدان اور داخلی شعور، وارداتِ قلبی اور احساسِ روحانی محض اوہام وخرافات کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

۵۔ پھر علم حصولی اور علم استدلالی ہی اصل علم بن جاتا ہے اور علم حضوری پہلے طاق نسیاں کی زینت اور پھر ایک بے حقیقت، بل کہ وہمی چیز قرار پاتا ہے۔

۶۔ ان سب بنیادوں کے بعد آخری بنیاد علم کا اخلاق واقدار سے غیر متعلق ہو جانا ہے۔ اس کے بعد علم ایک خالص میکانیکی چیز رہ جاتا ہے، جو اگر بداخلاقی اور فحاشی نہیں تو کم از کم لااخلاقی اور لااقداری اسلوبِ زندگی تو ضروری سکھاتا ہے۔

اسی طرح مقاصد علم غرب پر علامہ کے ہاں انتہائی وقیع مباحث ملتے ہیں۔ ان کی رائے میں جدید (بیسویں صدی کے آغاز کے) یورپ میں مقاصد علم کچھ یوں ہیں:

۱۔ مذہب واخلاق کی دنیائے علم وفن سے ملک بدری:

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

۲۔ زندگی کے مادی مظاہر پر زور اور باطنی حقائق سے صرف نظر:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

۳۔ فکر معاش اور مادی ضروریات کی تکمیل پر اصل توجہ کا مرتکز ہو جانا:

در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروان زندگی بے منزل است

ان اساسات اور مقاصد نے جو نتائج پیدا کیے، ان کا ماتم اقبال نے جابہ جا کیا ہے۔ ایک اعتبار سے پورا کلام اقبال نتائج علم غرب پر ایک تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ نتائج علم غرب اقبال کی نظر میں مختصراً یہ ہیں:

- قلب و نظر کا فساد
- تکدر چشمہ ہائے علم و عرفاں
- فتنہ ہائے علم و فن
- خرد بے گانۂ دل
- سینہ بے نور
- مرگ امومت
- بے منزلئ کارواں

مذکورہ بالا امور کے لیے محض بہ طور نمونہ اور فوری حوالہ چند اشعار حاضر ہیں:

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
مکدر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفاں را
جہاں را تیرہ تر سازد چہ مشائی چہ اشرقی

اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب
خرد بے گانۂ ذوق یقین است
قمار علم و حکمت بدنشین است
خرد بے گانۂ دل، سینہ بے نور
کہ از تاگ نیاگاں مے نخوردی
درنگاہش آدمی آب و گل است
کاروان زندگی بے منزل است
تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امت
ہے حضرت انساں کے لیے اس کا ثمر موت

علم اور تعلیم و تعلم پر ان نظری مباحث کے پہلو بہ پہلو بر صغیر میں بہت سے متنوع اور نت نئے تعلیمی تجربے بھی ہوئے۔ تعلیمی تجربات کے تنوع میں شاید دنیائے اسلام کا کوئی دوسرا ملک بر صغیر کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں قائم ہونے والے دو اہم تعلیمی اداروں دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کے اساسی اور Seminal تجربات کے نتیجے میں بیسویں صدی میں اور بھی بہت سے دوسرے تجربات ہوئے، جن میں سے چند نمایاں ترین یہ ہیں:

ا۔ ندوۃ العلماء کا تجربہ، جس کو اکبرالہ آبادی نے ملت اسلامیہ کی زبانِ ہوش مند سے تعبیر کیا، طبقۂ علما کی طرف سے اس امر کا برملا اعتراف تھا کہ جدید سے مکمل صرف نظر کر کے محض قدیم کے تحفظ اور تسلسل سے دور جدید کی ضروریات پوری نہیں کی جا سکتیں۔ ندوۃ العلماء کا قیام بر صغیر میں دینی تعلیم کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ گویا ندوۃ العلماء ایک نیا دیوبند تھا، جس پر علی گڑھ کی گہری چھاپ تھی۔ گزشتہ ایک سو سال کے دوران ندوی فضلا نے اسلام پر جو لٹریچر تیار کیا ہے، وہ اسلام میں مذہبی فکر اور اسلامی علوم و فنون کی تدوین نو کے ایک اہم مرحلے کا ترجمان ہے۔ جدید علم کلام، علم تفسیر میں نئے رجحانات، سیرت اور تاریخ اسلام کی نئی

تدوین، ادب و مذہب کے باہمی روابط، حدیث کی از سرِ نو ترتیب اور تصوف و فلسفۂ اسلام کی تدوین نو علمائے ندوہ کی علمی ترک تازیوں کے خصوصی میدان ہیں۔

۲۔ اگر ندوہ نیا دیوبند تھا، جو علی گڑھ کے زیرِ اثر وجود میں آیا تو جامعہ ملیہ نیا علی گڑھ تھا، جس نے دیوبند کے زیرِ اثر جنم لیا۔ تحریک خلافت کے پرجوش دور میں جب مسلمانانِ ہند میں گاندھی کے زیرِ اثر تحریک عدم تعاون زور و شور سے جاری تھی اور مسلمانوں کو بڑی عیاری سے اس سب کچھ سے محروم کرنے کی کوششیں جاری تھیں، جو انہوں نے ۱۸۵۷ء کی شدید ناکامی اور مایوسی کے بعد سیاسی اور انتظامی طور پر حاصل کیا تھا، یکایک بعض مسلمان راہ نماؤں نے علی گڑھ پر ہلہ بول دیا اور کوشش کی کہ علی گڑھ کا ادارہ بند ہو جائے۔ ان حالات میں ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک نئے ادارے کی بنیاد رکھی گئی، جو ۱۹۲۵ء میں دہلی منتقل ہو گیا۔ اس نئے ادارے کی تاسیس میں مولانا محمد علی جوہر، حکیم محمد اجمل خان اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری جیسے اکابر شامل تھے۔ اگرچہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام ایک شدید نوعیت کے ہنگامی اور ہیجانی دور میں ہوا اور بڑی حد تک علی گڑھ کی پالیسیوں کے ردعمل میں ہوا، لیکن خود علی گڑھ میں ایک ایسے ادارے کی ضرورت کا احساس کیا جا رہا تھا، جو انگریزی حکومت کے اثرات سے آزاد ہو، جہاں دینی تربیت پر خاص زور دیا جاتا ہو اور ذریعۂ تعلیم اردو ہو، البتہ انگریزی اور دوسرے جدید مضامین، لازمی مضامین کے طور پر شامل رہیں۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جامعہ ملیہ، علی گڑھ ہی کا ذرا مشرقی قسم کا ایڈیشن تھی، اس فرق کے ساتھ کہ یہاں جلد ہی سیاست در آئی اور کانگریس اور کمیونزم کے اثرات روز بہ روز بڑھتے چلے گئے۔

جدید تعلیم کے ان دو اہم اداروں کے پہلو بہ پہلو مسلمانانِ برصغیر نے ہندوستان کے طول و عرض میں اسلامیہ ہائی اسکول اور اسلامیہ کالجوں کے نام سے بہت سے ادارے قائم کیے، جن میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے قائم کردہ اداروں نے بڑی شہرت پائی۔ نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کے نقطۂ نظر سے تو ان اداروں اور علی گڑھ یا سرکاری جامعات (مثلاً الہ آباد یونیورسٹی یا پنجاب یونیورسٹی) میں کوئی خاص فرق نہ

تھا، البتہ دینی تربیت اور ملی حمیت میں ان اداروں کی کار کردگی علی گڑھ سے بہتر محسوس ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل سے ہی ملک میں جابہ جا اسلامیہ اسکولوں اور اسلامیہ کالجوں کا قیام مسلمانوں کی اس دبی ہوئی خواہش کا مظہر تھا کہ وہ دینی تربیت اور ملی حمیت کی قیمت پر جدید تعلیم حاصل نہیں کرنا چاہتے۔

بیسویں صدی کے اہم تعلیمی تجربات میں بہاول پور کی جامعہ عباسیہ، حیدر آباد کی جامعہ عثمانیہ اور بھوپال کی جامعہ احمدیہ بھی قابل ذکر ہیں۔ ان سب اداروں میں جو چیز قدر مشترک تھی، وہ یہ احساس تھا کہ نہ جدید تعلیم کو جوں کا توں بغیر کسی نقد و تحقیق کے اختیار کیا جا سکتا ہے اور نہ قدیم نصابِ تعلیم کو بغیر کسی نظر ثانی اور تجدید کے برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ ان اداروں، بالخصوص جامعہ عثمانیہ میں جو علمی کام ہوا، وہ انتہائی قابل قدر اور برصغیر کی علمی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے۔

جامعہ عباسیہ جو بھاول پور میں ۱۹۲۶ء میں قائم ہوئی، ایک اہم اور مفید کاوش تھی۔ یہ دینی تعلیم کا ایک ایسا ادارہ تھی جس نے برصغیر کے نام ور ترین اہل علم اور اہل دین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس میں دینی تعلیم کی ایک ایسی روایت کو جنم دیا گیا، جو اگر آج جاری رہتی تو پورے پاکستان کے لیے دینی تعلیم کا ایک نمونہ پیش کرتی۔ لیکن افسوس جدت پسندی کے شوق میں اس کا تیا پانچہ کر دیا گیا۔ اس کے ماتحت کالجوں اور مدارس کا جو جال پھیلا ہوا تھا، وہ سارا کا سارا سمیٹ دیا گیا۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ جامعہ عباسیہ کا احیا کیا جائے۔ اس جامعہ کے سارے وسائل اس کو واپس کیے جائیں اور اس کی عالی شان عمارت کو، جو شہر بھاول پور کے وسط میں واقع ہے، دوبارہ جامعہ عباسیہ کا مرکز قرار دیا جائے۔ اب جب کہ اسلامیہ یونی ورسٹی بھاول پور کی عمارت نئے کیمپس میں بن چکی ہے، سابقہ عمارتوں کو واپس کر کے جامعہ عباسیہ کا احیا کرنے میں کوئی انتظامی دشواری حائل نہ ہونی چاہیے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جو اہم تعلیمی تجربے رونما ہوئے، ان میں نمایاں اور قابلِ ذکر درج ذیل ہیں:

۱۔ اردو کالج، کراچی

۲۔ جامعہ اسلامیہ، بھاول پور (خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود)

۳۔ پاکستان کی قومی جامعات

۴۔ بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی

۵۔ بہت سے دینی مدارس میں کی جانے والی تجدید واصلاح کی کوششیں، جن میں جامعہ محمدیہ جھنگ، شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ، جامع العلوم ملتان، دارالعلوم بھیرہ، دارالعلوم شہابیہ سیالکوٹ، منہاج القرآن لاہور اور حال میں قائم ہونے والا ادارہ دانش کدہ قابلِ ذکر ہیں۔

۶۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اور انتظامی علوم پر زور دینے والے جدید ادارے، جن میں لاہور کی یونی ورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، ٹوپی کا غلام اسحاق خان انسٹی ٹیوٹ اور دوسرے سینٹر زآف ایکسی لنس شامل ہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ان سب تجربات میں بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی کا تجربہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد تجربہ ہے، جس میں گزشتہ ایک سو سال کی تعلیمی فکر سے استفادہ کرنے کی پہلی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ لیکن تجربات کے اس تنوع کے باوجود نظام تعلیم کا اصل دھارا اسکولر ہی رہا۔ علوم وفنون اور تعلیم و تعلم کا عمومی رخ مغربی انداز کا ہی رہا، نظامِ تعلیم کی اساس فلسفۂ مستعار پر ہی رہی، درس گاہیں بے یقینی اور تذبذب کا ریگ زار ہی رہیں، کسی بامعنیٰ نصب العین سے غفلت اور لاپروائی ہی ساری کاوشوں کا طرۂ امتیاز رہی۔ کتنے دکھ اور حیرت کی بات ہے کہ جس ملک میں ڈاکٹر رفیع الدین جیسے بالغ نظر مفکر نے نصب العین کے حصول کو تمام انسانی سرگرمیوں اور کاوشوں کا اساسی جذبۂ محرکہ قرار دیا ہو، وہاں نصب العین سے غفلت کا یہ عالم ہو۔

نصب العین سے لاپروائی کا ایک نمایاں نتیجہ سماجی زندگی کی وہ عمومی بے جہتی ہے، جس کا سارا معاشرہ شکار نظر آتا ہے۔ ہمارے مغربی نظام تعلیم اور مغربی تعلیمی تصورات کے علم برداروں نے نیک نیتی سے یہ سمجھا کہ مغربی علوم اور مغربی تعلیم کو مغرب کے مسیحی، بل کہ یونانی اور رومی عقائد، مغرب کی تہذیبی اقدار اور مغرب

کے ثقافتی تصورات سے الگ کر کے برتا اور اپنایا جا سکتا ہے اور ایسا بندوبست کیا جا سکتا ہے کہ مغربی علوم وفنون کو بلا تنقید اپنا کر بھی مسلمانوں کی مذہبی زندگی اور تہذیبی اقدار کو بچایا جا سکے، لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ اس عدم امکان کی سب سے بڑی وجہ تو یہی تھی کہ اسلام اور مغرب کے اساسی عقائد اور تصورات میں بنیادی تعارض پایا جاتا تھا۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ جدید مغربی انداز کے اداروں میں تعلیم پانے والوں کا اولین اور آخری مقصد سرکار کی نوکری اور ملازمت کا حصول تھا، جس کے لیے نہ دین کی ضرورت تھی اور نہ دین اس سارے عمل میں کہیں کام آتا تھا۔ لہٰذا دین سے وابستہ ہر چیز عملاً تعلیم کے لیے غیر ضروری اور اس پورے عمل سے غیر متعلق ہوتی چلی گئی اور یوں ان تعلیمی اداروں کا ماحول روز بہ روز دین کے لیے ناسازگار ہوتا چلا گیا۔

علامہ اقبال نے اس صورت حال کو اجتماعی نفسیات کے حوالے سے بھی دیکھا۔ وہ فرماتے ہیں:

> غلام قوم مادیات کو روحانیات پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر اس تعلیم سے بے زاری کے بہانے تلاش کرتا ہے، جس کا مقصد قوت نفس اور روح انسانی کا ترفع ہو۔

انہوں نے ''بندگی نامہ'' میں، جو ''زبور عجم'' کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اس مسئلے پر بڑی تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور بتایا ہے کہ غلام قوم کے افکار و نظریات میں غلامی کے اثرات سے کہاں کہاں اور کیا کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ضرب کلیم میں تو انہوں نے ایک مستقل بالذات باب ہی تعلیم و تربیت کے موضوع پر رکھا ہے اور ان نتائج و اثرات کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے، جو مغربی تعلیم کو جوں کا توں اپنا لینے سے سامنے آتے ہیں۔ ان نتائج کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو ایسے بہت سے قابل توجہ امور سامنے آتے ہیں، جن پر فوری غور و فکر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

انگریزی دور سے قبل تعلیم اور روزگار یا تعلیم اور ذریعۂ آمدنی کا وہ تعلق موجود نہیں تھا، جو گزشتہ دو صدیوں کے دوران قائم کر دیا گیا ہے۔ چوں کہ تعلیم سے مراد اب صرف انگریزی تعلیم ہے اور اس کی واحد غرض حصول روزگار ہے، اس لیے تعلیم اور روزگار لازم و ملزوم بن گئے ہیں اور اب تو تعلیم ایک ایسا کاروبار بن گئی ہے جو ہزاروں سے گزر کر اب لاکھوں اور کروڑوں کی آمدنی پیدا کرنے کا آسان اور شان دار راستہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم کا رشتہ روزگار کے بہ جائے اخلاق، انسانیت، تہذیب اور سب سے بڑھ کر دین سے جوڑا جائے، تعلیم کو ایک تہذیبی اور دینی ضرورت قرار دیا جائے اور تعلیم کا کاروبار کرنے والے اداروں کو کنٹرول کیا جائے۔ جو لوگ غیر ملکی یونی ورسٹیوں کے نام پر فرضی ادارے بنانے اور معصوم اور ناواقف طلبہ سے بھاری فیسوں کی شکل میں دولت جمع کر رہے ہیں، ان کی سرگرمیوں کو ایک مفصل قانون کے ذریعے کنٹرول کیا جائے۔

دوسری اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ اس تعلیم کے نتیجے میں ہمارا با اختیار طبقہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اصلاً سیکولر بن کر رہ گیا ہے۔ وہ اسلام کی صرف وہ اصطلاحات قابل قبول سمجھتا ہے، جو جدید عالمی سیکولر نظام میں کھپ سکیں اور جن سے اسٹیٹس کو کی تزئین و آرائش کا کام لیا جا سکے۔ جن اسلامی اصطلاحات سے مغرب خائف ہے، وہ ہمارے دانش ور کے نزدیک پرے رکھنے کی چیزیں ہیں۔ خلافت، جہاد، حجاب جیسے الفاظ یا ان پر مواد پاکستان کی شاید کسی بھی درسی کتاب میں موجود نہیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ہمارے با اثر اور تعلیم یافتہ طبقات کے لوگ جن اوصاف سے عموماً متصف ہیں (الا ماشاء اللہ) ان کو دیکھ کر اقبال کی مشہور نظم ''حکمت فرعونی'' یاد آتی ہے، جس میں انہوں نے حکمت فرعونی کے علم برداروں کے اوصاف گنائے ہیں۔ ان اوصاف کو دیکھیے اور آج ہمارے با اثر طبقات کی اکثریت کو دیکھیے۔ یہ طبقہ آپ کو:

۱۔ انگریز کا حامی

۲۔ مغرب کی تہذیبی اور فکری برتری کا علم بردار
۳۔ مسلمانوں کے استقلال کے بارے میں ڈھلمل یقین (Luke warm) رویے کا حامل
۴۔ مسلمانوں میں دینی حمیت رکھنے والوں کے عروج سے خائف
۵۔ مسلمانوں کی تعلیم کو مغرب کے نظام کا محض ایک ناپسندیدہ، لیکن لازمی اور ناگزیر تتمہ اور ضمیمہ بنادینے کا خواہش مند
۶۔ مذہب کو ایک گوشے میں محدود کر دینے کے لیے کوشاں
۷۔ اہل مغرب کے ایجنڈے پر ایمانِ کامل رکھنے والا

معلوم ہو گا۔ بہت سے حضرات ان اوصاف کو دیکھتے ہیں تو پریشان ہوتے ہیں اور چیں بہ جبیں ہو کر ان کو افراد کی انفرادی کمزوری قرار دیتے ہیں اور ان خرابیوں کی انفرادی اور جزوی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کوششوں کی جزوی افادیت اور مبنی براخلاص ہونے میں شک نہیں، لیکن یہ خرابی اتنی بنیادی اور ہمہ گیر ہے کہ جزوی اصلاح سے اس میں کسی بہتری کی توقع نہیں۔ یہ ایک عمومی فکری اور تہذیبی انحراف کی وہ کیفیت ہے، جس کو مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے ارتداد سے تعبیر کیا ہے۔ بلاشبہ اس انحراف کو تہذیبی ارتداد بلاخوفِ تردید قرار دیا جاسکتا ہے۔ مذہب کو جدید تہذیبی، تمدنی، سائنسی ضروریات کے لیے غیر متعلق قرار دینا فکر منحرف کا بنیادی ستون ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تعلیم کو محض تدریس سمجھ کر دینی تعلیمات اور اخلاقی اقدار کے پورے نظام سے اس کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بنیادی اسباب خدا بے زار فکر، اقدار بے زار تعلیم، مغرب سے مرعوبیت اور ابلاغ شر کا وہ سیلاب ہے، جو آئے دن اور ہر آئے دن کے ہر لمحے مسلمانوں کے سروں پر برس رہا ہے۔

ان خرابیوں کی اصل جڑ دین ودنیا کی جدائی کا سیکولر اور مغربی تصور ہے۔ دین ودنیا کی جدائی دراصل مشرکانہ عقائد کا ایک بڑا مظہر بھی ہے اور اصل سبب بھی۔ اس کے مقابلے میں ان دونوں کی اکائی، یعنی Ultimate Unity توحید کا لازمی تقاضا

ہے۔ یہ وحدتِ تصور تعلیم اور نظام تعلیم کی اساس ہونی چاہیے۔ اس توحید کا لازمی نتیجہ وحدت علوم بھی ہے۔ مسلمانوں میں وحدت علوم کا تصور روز اول سے ہی ان کے نظریۂ علم (Epistemology) کا ایک بنیادی پتھر رہا ہے۔ ابونصر فارابی جیسے خالص عقلی اور فلسفیانہ اسلوب کے حاملین سے لے کر امام غزالی جیسے خالص صوفی اور فقیہ تک بہت سے حضرات نے وحدت علوم کے اس تصور پر خامہ فرسائی کی ہے۔ امام غزالی نے اپنی مایہ ناز کتاب ''المستصفیٰ من اصول الفقہ'' کے مقدمے میں وحدت علوم اور عقل و نقل کے امتزاج پر جو عالمانہ گفت گو کی ہے، وہ اسلامی فکر کی تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہے۔

علوم و فنون کے بارے میں اس موحدانہ اسلوب کے اثرات کا جائزہ لینا ہو تو یونانی علوم و فنون کی عربی میں منتقلی کے تجربے کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مسلمانوں نے دوسری صدی ہجری کے اواخر سے یونانی علوم و فنون، بالخصوص منطق، فلسفے اور طب وغیرہ کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ کم و بیش دو سو، ڈھائی سو سال تک جاری رہا، لیکن اس نقل و ترجمے کے ساتھ ساتھ ان علوم و فنون کا تنقیدی مطالعہ بھی ہوتا رہا اور ان علوم و فنون کی تطہیر، تدوین نو اور تعمیر نو کا عمل بھی جاری رہا۔ اس پورے تجربے کی تاریخ کا مطالعہ اس لحاظ سے بڑا دلچسپ ہے کہ یونانیوں کے خالص عقلی اور تجربی علوم میں کس طرح اسلامیت کی روح سموئی گئی، کس طرح علوم و فنون کی وحدت کے تصور کو برقرار رکھا گیا، کس طرح ان متفرق اور بعض اوقات متعارض علوم کو تطہیر و تنقید کے عمل سے گزار کر ایک لڑی میں پرو دیا گیا، حتیٰ کہ قرون وسطیٰ کے خود یہودی اور عیسائی مفکرین، اسلام کے ان گہرے تہذیبی اثرات سے باہر نہ رہ سکے۔

وحدت علوم اور توحید دین و دنیا کا یہ ہدف صرف قرآن کو اساس بنانے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جب درسیات کا سارا عمل قرآن کے نقطۂ پرکار پر قائم ہو گا تو خود بہ خود وحدت علوم اور یک سانی فکر و نظر کی راہیں کھلتی چلی جائیں گی۔ اسلام کے گلستان علوم کا پہلا بیج قرآن مجید اور پہلی کیاری مسجد ہے۔ علوم و فنون کی اس وحدت

اور نصب العین کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

مذہب، فلسفہ، طبیعیات اور دیگر علوم و فنون، سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں، کیوں کہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنون حاضرہ کے باب کو کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں، اور اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسات پر رکھنے کے طریق کو مسترد کرنے کی تعلیم دی اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوئی۔

اس کے برعکس بعض حضرات ان سب حقائق کو نظرانداز کر کے نصاب تعلیم کو پڑوس کی نرسری کے گملے میں لگا ہوا ایک پودا سمجھتے ہیں، جس کو جب چاہا اور جس گھر میں چاہا، منگوا کر لگالیا۔ چناں چہ جو رطب و یابس مغرب کی نسبت سے آتا ہے، وہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ عالمی بینک کی ایک رپورٹ میں (آج سے کم و بیش ایک ڈیڑھ عشرے قبل) کہا گیا تھا کہ:

ترقی پذیر ملکوں کے نصابات کی تبدیلیاں شمالی امریکا کے نصابات کا چربہ ہوتی ہیں۔

مغرب اب ان تصورات سے قطعی بے گانہ ہو چکا ہے، جن پر دین کی اساس ہے۔ دوسری طرف مشرق اور دنیائے اسلام کا بڑا حصہ محض افسانوں اور بے اصل روایات کو دین سمجھے بیٹھا ہے۔ اساسِ صحیح پر ایک مکمل معاشرے کی تعمیر و تشکیل وقت کی فوری ضرورت بن چکی ہے:

مغرب ز تو بے گانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی

تعلیم و تعلم کے میدان میں اتنی طویل اور عمیق تفکیر اور تجربات کے اس قدر تنوع کے باوجود آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟ شاید یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ صورت ببیں حالت مپرس! آج صورت حال کیا ہے؟

۱۔ کم و بیش دو درجن، بل کہ اس سے بھی زائد تعلیمی رپورٹوں اور نصف درجن سے زائد تعلیمی پالیسیوں پر عمل درآمد کا معاملہ صفر سے ذرا ہی آگے ہے۔ ۱۹۴۷ء کے نومبر سے لے کر آج بیسویں صدی کے اختتام تک ہم نے تعلیم کے موضوع پر بلا مبالغہ سیکڑوں کانفرنسیں اور ہزارہا اجلاس منعقد کیے ہوں گے اور بہت سی اچھی اچھی خوش نما تجاویز مرتب کی ہوں گی، لیکن ان پر کس حد تک عمل درآمد ہوا؟ یہ ہم سب کے سامنے ہے۔

۲۔ مسجد مکتب اسکیم کو جو شاید پاکستان کی تاریخ میں پہلی قابل عمل، کم خرچ اور نتیجہ خیز اسکیم ثابت ہو سکتی تھی، سرکاری کاغذوں اور فائلوں سے باہر نکل کر پورے طور پر برگ و بار لانے کا یا تو موقع نہیں ملا یا، پھر اس کی اجازت ہی نہیں دی گئی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ملک کے چپے چپے میں قائم دو اڑھائی لاکھ مساجد میں سے صرف چند ہزار مسجدوں میں ہی مکتب اسکول بن سکے، اور وہ بھی جاں بہ لب ہیں۔ ان مکتبوں کو کام یاب بنانے میں نہ علمائے کرام نے کوئی خاص دل چسپی لی اور نہ ہی تعلیم سے وابستہ حضرات نے ان کو اہمیت دی۔

۳۔ ۱۹۷۹ء کی تعلیمی پالیسی کا رخ اس کے نفاذ کے فوراً بعد ان ہی لوگوں نے موڑ دیا، جو اس اسکیم کو چلانے کے ذمے دار تھے۔ قائداعظم کے پے در پے اعلانات اور دستورِ پاکستان کے واضح احکام کے مطابق اس پالیسی میں اردو کو بہ طور قومی زبان اپنانے کے لیے پہلی بار سنجیدہ اقدامات کیے گئے تھے، لیکن جلد ہی انگریزی زدہ اور انگریز گزیدہ اشرافیہ نے ان اقدامات کو کالعدم کرا دیا اور خود ان لوگوں سے جنھوں نے نہایت دھوم دھام سے یہ اسکیم تیار کرائی تھی، رجعت قہقری کا عمل شروع کرا دیا۔

۴۔ آج ہمارے ہاں تعلیم ایک باقاعدہ اور انتہائی نفع آور تجارت بن چکی ہے۔ اب استاد اور شاگرد کا رشتہ روحانی باپ اور بیٹے کا نہیں، بل کہ ایک دوکان دار اور خریدار، یا ایک صانع اور صارف کے رشتے میں تبدیل ہو چکا ہے۔

۵۔ بھانت بھانت کے تعلیمی ادارے معاشرے کو طبقات میں تقسیم در تقسیم

کے عمل کو پختہ سے پختہ تر کرنے کے عمل میں زور وشور سے حصہ لے رہے ہیں۔

۶۔ آج ہمارے بیش تر ادارے استعمار کی ایک نئی قسم، تہذیبی اور فکری استعمار کے لیے اسی طرح مخلص رجال کار تیار کرنے کے عمل میں جوش وخروش سے مصروف ہیں، جس طرح انیسویں صدی کے وسط میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفاتر کے لیے مقامی اور سستے کلرک تیار کیے جاتے تھے۔

۷۔ آج بے مقصد اور بے جہت تعلیمی اداروں کا سیلاب ملک میں آیا ہوا ہے۔ ان اداروں کے فارغ التحصیل حضرات نہ معاشرے کے کسی کام کے ہیں اور نہ ملک وملت کے۔

۸۔ اس سب کچھ کے باوصف اور تعلیم کی اس ہمہ ہمی کے باوجود آج خواندگی کی سیڑھی پر ہمارا نمبر ۱۳۴واں ہے۔ ہمارے ہاں بہت کھینچ تان کر خواندگی کی سطح ۳۶فیصد تک پہنچائی جا سکی ہے۔ خواندگی کمیشن، خواندگی کے فروغ کی ساری کاوشیں اور خواندگی مہم پر خرچ کیے جانے والے وسائل عموماً بے نتیجہ ہی ثابت ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدید تعلیم کا سارازور (Trust) مسلمان کو Diseducate کرنے، یعنی تعلیم سے محروم کرنے پر ہی رہا ہے۔ یہ بات محض کسی زور بیان کی خاطر نہیں کہی گئی، بل کہ حقائق اور تاریخ دونوں اس کے شاہد ہیں۔ ۱۸۳۵ء۔ ۱۸۳۶ء کے لگ بھگ مرتب کی جانے والی ایک برطانوی رپورٹ کے مطابق پنجاب جیسے دور افتادہ صوبے میں مسلمانوں میں خواندگی کا تناسب سو فیصد اور صوبے میں مجموعی طور پر ۸۴ فیصد تھا۔ اس کے برعکس جب انگریز یہاں سے اپنی تہذیبی ذمے داریاں ادا کر کے واپس گئے، یعنی ۱۹۴۷ء میں تو پنجاب کے مسلمانوں میں خواندگی کی شرح چار فیصد تھی۔

۹۔ ہماری اجتماعی قیادت کا رویہ تعلیم کے بارے میں کیا ہے، اس کا اندازہ کرنا ہو تو پنجاب کے پانچ ہزار بھوت اسکولوں، سندھ کے زمین داروں کے اطاقوں اور دیہاتوں کے ٹاٹ اسکولوں سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ ان سب چیزوں نے مل کر استاد کے معاشرتی رتبے کو ختم کر دیا ہے۔ آج

کے نوجوانوں کی آخری ترجیح استاد بننا ہوتی ہے۔ ہر سال سیکڑوں اساتذہ مدرسی چھوڑ کر سرکاری افسری اور تجارتی اداروں کی ملازمتوں کو اختیار کرتے ہیں، لیکن شاید آج تک کسی سرکاری افسر نے افسری چھوڑ کر مدرسی یا معلمی اختیار نہیں کی۔

۱۱۔ استاد اب طلبہ کا آئیڈیل نہیں رہا، اور کیوں ہو؟ اب وہ محض ایک ملازم پیشہ شخص ہے جو ملازمتوں کے کلچر میں جیتا ہے، ملازمانِ سرکار کی طرح مطالبات وترجیحات رکھتا ہے، ٹریڈ یونینوں کے بل پر اپنے ''حقوق'' کے حصول کی کاوش میں سرگرداں رہتا ہے۔

۱۲۔ یہی حال تعلیم کے بجٹ کا ہے۔ ہمارے ملک میں تعلیم پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے، اس کی کمی کا رونا ملک کے اہل درد اکثر روتے رہتے ہیں، لیکن کم لوگوں کی نظریں اس طرف جاتی ہیں کہ جو بجٹ تعلیم کے نام پر مختص کیا جاتا ہے، اس کا بھی کم وبیش نصف تعلیم سے متعلق حکومتی اداروں کے محض انتظامی اخراجات کی نذر ہو جاتا ہے۔ تعلیم کی مد میں مرکزی حکومت ہی کے اداروں کی فہرست مرتب کی جائے تو وہ درجنوں اداروں اور دفتروں پر مشتمل ہو گی۔ ہر ادارے اور دفتر کے سربراہان، عملے، دفاتر، آمد ورفت، الاؤنسوں وغیرہ کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، جس پر اس رقم کا بیش تر حصہ خرچ ہو جاتا ہے۔ یونی ورسٹیوں کے بجٹوں کا بڑا حصہ محض انتظامی ملازمین کی تنخواہوں اور ایسے ہی دوسرے غیر تعلیمی امور کی نذر ہو جاتا ہے۔

۱۳۔ اعلیٰ فنی اور سائنسی تعلیم اب صرف مغرب زدہ خواص کے طبقے تک محدود کی جارہی ہے۔ اب اعلیٰ فنی اور سائنسی تعلیم کے دروازے عام مسلمانوں اور غریب طبقے کے لوگوں کے لیے بند ہوتے جارہے ہیں۔ گویا جس نام پر انگریزی تعلیم کے دروازے چوپٹ کھولے گئے تھے، وہی چیز ختم کی جارہی ہے۔

۱۴۔ ایسا نظر آرہا ہے کہ کسی بین الاقوامی منصوبہ بندی کے نتیجے میں آئندہ چند عشروں کے دوران اعلیٰ تعلیم سے دینی عناصر کو ایک ایک کر کے چھانٹا جائے گا۔

۱۵۔ تعلیم کے نصاب ونظام، دونوں سے امت مسلمہ اور ملت واحدہ کو تقویت دینے والے عناصر ایک ایک کر کے نکالے جارہے ہیں۔

۱۶۔ تعلیم میں بیرونی معاونت اور معاونت کے بہانے عمل دخل، تعلیم کے نام پر استعماریت اور طبقاتیت کے تحفظ کی ایک موثر کوشش ہے۔آج تعلیم کے نام پر جو مدد باہر سے آ رہی ہے، اس میں مادی تعاون کا حصہ برائے نام اور فکری تغلغل (Intellectual Penetration) اصل چیز ہے۔

۱۷۔ حکومتوں کے کنٹرول، اساتذہ اور اہل علم کی تعلیم کے مستقبل سے عدم دل چسپی اور سب سے بڑھ کر غیر ملکی اداروں کے عمل دخل نے علم اور تعلیم کی آزادی کو قریب قریب ختم کر ڈالا ہے۔ علم کی آزادی اور تعلیم کی خود مختاری اسلامی تاریخ کا ایک نمایاں وصف رہا ہے۔آزادی اور سرکاری کنٹرول نہ ہونے کے باوجود صرف دہلی میں ایک ہزار مدارس تھے۔ ٹھٹہ شہر کے چار سو مدارس کا ذکر تو مغربی سیاحوں نے بھی کیا ہے، جن کی آمدورفت خاصی دیر سے شروع ہوئی تھی۔ مزید برآں اسلامی دور میں تعلیم مفت تھی۔ ۱۸۲۲ء میں ایک انگریز کی رپورٹ کے بہ موجب (جنوبی ہندوستان تک میں) ہر پانچ سو افراد کی آبادی کے لیے ایک مدرسہ موجود تھا۔

۱۸۔ گزشتہ چند عشروں کے دوران بہ جا طور پر مسلم ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول پر زور دیا گیا اور ان فنون کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا، لیکن اکثر وبیش تر یہ کام بغیر کسی منصوبہ بندی اور بغیر کسی مناسب غوروخوض کے کیا گیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی سے مشرقی اقوام کی مرعوبیت کو پس ماندہ اقوام کی ترقی اور خوش حالی کے لیے استعمال کرنے کے بہ جائے مغربی افکار واقدار کی بالادستی کے لیے زیادہ استعمال کیا گیا۔

۱۹۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس غیر منصوبہ بند غلبے نے علوم انسانی واجتماعی کی اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ آج کا ذہین نوجوان خالص فنی اور تجربی تخصصات کی طرف جا رہا ہے اور انسانی واجتماعی علوم، بالخصوص فلسفے اور ادب سے اس کی دل چسپیاں نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہیں۔ یہ صورت حال ملک وملت اور تہذیب وثقافت کے مستقبل کے لیے تباہ کن ہو سکتی ہے۔ تاریخ، فکر، کلام اور دوسرے انسانی اور اجتماعی

علوم کی قوموں کے مزاج کی تشکیل میں جو اہمیت اور جو کردار ہے، اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اجتماعی علوم اور انسانیات، لسانیات و ادبیات کو نظر انداز کرنے یا کم از کم ثانوی قرار دینے کی پالیسی پر نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے۔ ان علوم کو نظر انداز کرنے کے نہایت تباہ کن تہذیبی اور تمدنی نقصانات ہیں، جن کی طرف مختصراً اشارہ آگے چل کر کیا جائے گا۔ جن مغربی اقوام کی تقلید کے نام پر ان علوم وفنون سے نظریں چرائی جارہی ہیں، وہاں ان علوم کی تدریس و تحقیق پر اربوں روپے خرچ کیے جارہے ہیں۔

۲۰۔ سائنس پر غیر منظم، غیر منصوبہ بند اور بے نتیجہ زور دینے کا منفی اثر اخلاق و کردار پر پڑ رہا ہے۔ اس سے مادیت اور خالص افادیت (یعنی نفع اندوزی) کے عناصر جنم لے رہے ہیں۔

۲۱۔ نفع اندوزی کی اس مسابقت نے ماں باپ کی تربیت اور دادی نانی کی گود ختم کر ڈالی ہے۔ اب ترجیحات بدل گئی ہیں۔ قلیل معاوضے پر دوسروں کے بچوں کی بے دلانہ نگہ داشت ترقی پسندی اور فعالیت کی علامت ہے، لیکن اپنی اولاد کی محبت کے گہرے جذبات کے ساتھ پرورش قدامت پسندی ہے اور عورت کو قید کر دینے کے مترادف۔ یاللعجب!

۲۲۔ اب تک کی تعلیمی کاوشوں کے بے نتیجہ ہونے کا سبب ان کی تہ میں کارفرما تصورِ دوئی ہے کہ دنیا اور ہے اور دین اور۔ علی گڑھ نے دنیا کو اصل قرار دے کر دین کے زیور سے اس کو آراستہ کرنا چاہا، حال آں کہ معاملہ محض ظاہر یا لباس کے بدلنے کا نہیں، ظاہر اور باطن کے درمیان مکمل ہم آہنگی کا ہے۔ ایک جدید مفکر تعلیم نے علم دین اور علم دنیا کو دو آنکھوں سے تشبیہ دی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی برقرار رہے تو وحدتِ نظر برقرار رہتی ہے، ورنہ بصیرتِ ملی احول ہو جاتی ہے۔ آج ہماری بصیرتِ ملی دو نہیں، بے شمار سمتوں میں بہ یک وقت دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس ناکام کوشش نے وحدتِ نظارہ کو ختم کر دیا ہے اور ایک منقسم شخصیت جنم لے رہی ہے۔

قدیم و جدید کے درمیان (قدیم کی شرائط پر) ایسی ہم آہنگی، جس کے نتیجے میں ایک متوازن اور مکامل شخصیت جنم لے، مستقبل کے تعلیمی اہداف کے حصول کی شاید سب سے اہم شرط ہے، جس کے بغیر کسی بامعنیٰ نظامِ تعلیم اور تصورِ تعلیم کی تشکیل ممکن نہیں۔ قدیم سے بے خبری کی صورت میں علامہ اقبال نے یورپ کے جس معنوی استیلا کا خدشہ آج سے پون صدی قبل ظاہر کیا تھا، وہ آج ہمارے گھروں میں آپہنچا ہے۔

علم زندگی ہے اور زندگی کا حقیقی سرچشمہ ہی اس کا اصل سرچشمہ ہے۔ علمِ اشیا کا سرچشمہ وہی ایک ذات ہے۔ جو علم مقاصدِ حیات کو نظر انداز کر کے لوازمِ حیات سے بحث کرے، وہ علم بے اصل ہے۔ علم کا اصل وظیفہ مقاصدِ حیات کی تحقیق و توضیح ہے۔ لوازمِ حیات کی تحقیق ثانوی چیز ہے۔ اس وظیفے کی تکمیل اور بہ جا آوری اسی وقت ہو سکتی ہے، جب علم دین کے تابع ہو۔ اگر علم دین کی راہ نمائی سے آزاد ہو جائے تو وہ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں علم نہیں، محض شیطنت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے مغرب میں آج کل معروضیت کو لاقدریت اور لااخلاقیت کے ہم معنی قرار دیا جانے لگا ہے۔ جو تعلیم تہذیبی اقدار اور معیاراتِ خیر و شر کے باب میں غیر جانب دار ہو، وہ دراصل غیر جانب دار نہیں، بل کہ بد تہذیبی اور شر کے حق میں جانب دار ہے۔

۲۳۔ اس دردناک داستان، بل کہ تعلیمی شہر آشوب کا آخری باب ہماری جدید درس گاہوں سے اردو، عربی، فارسی اور اسلامیات کی دردناک بے دخلی ہے۔ آج کی بیش تر یونی ورسٹیوں میں یا تو ان موضوعات کو سرے سے ہی باریاب ہونے کی اجازت نہیں دی گئی یا ان کے کردار کو ہر ممکن حد تک محدود کر دیا گیا ہے۔ ایک ممتاز ماہرِ تعلیم کے الفاظ میں اسلامیات کے شعبوں کی حیثیت کم و بیش ایسی کالونیوں کی سی رہی ہے، جن کے اثر کا حلقہ یونی ورسٹیوں کے دوسرے شعبوں میں معمولی نفوذ رکھنے کا اہل بھی نہیں ہو سکا۔ یونی ورسٹیوں کے طلبہ میں اگر دینی رجحانات کہیں کہیں مل جاتے ہیں تو ان کا مصدر و منبع نہ خود یونی ورسٹی کی تعلیم ہے،

نہ وہاں کا نظامِ تربیت اور نہ اسلامیات کے جزیرے۔ ان اثرات کا منبع وہ خارجی دینی تحریکات ہیں، جن کے اثرات کسی نہ کسی ذریعے سے یونی ورسٹیوں میں آگئے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آج اس صورت حال کی اصلاح اور ان کی تمام خرابیوں کا ازالہ کرنا چاہیں، جن میں سے بعض کا ذکر ان گزارشات میں کیا گیا تو ہمیں کیا اقدامات کرنے چاہییں؟ جب تک اقدامات اور کرنے کے کام واضح طور پر سامنے نہ ہوں، اصلاح کے لیے قدم بڑھانا آسان کیا معنی، ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا پہلے ان پہلوؤں کے تعین کی ضرورت ہے، جن میں اصلاح اور تبدیلی درکار ہے۔ ایسے اہم پہلوؤں کو درج بالا عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ مقصد تعلیم
۲۔ منہاج تعلیم
۳۔ نظام تعلیم
۴۔ نصاب تعلیم
۵۔ ذریعۂ تعلیم
۶۔ نتائج تعلیم
۷۔ نگرانیٔ تعلیم

ان تمام شعبوں میں بامقصد اور دیرپا تبدیلی لانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کچھ اقدامات تو فوری نوعیت کے اور قلیل المیعاد ہوں، تاکہ تعلیم کی دنیا میں جس سیلاب کا سامنا ہے، اس کے فوری نتائج سے ممکنہ حد تک بچا جاسکے۔ فوری اور قلیل المیعاد اقدامات کے ساتھ ساتھ ایسے دور رس اور طویل المیعاد اقدامات کی بھی ضرورت ہے، جن سے کام لے کر تعلیم کے سارے عمل کی تحویلِ قبلہ کی جاسکے اور اس میں ایسی بنیادی اور دیرپا تبدیلیاں کی جاسکیں، جن کا مقصد پاکستان اور دنیائے اسلام کے لیے ایک ایسی نسل کی تیاری ہو، جو ملت اسلامیہ کی اکیسویں صدی کی ضرورت کو کماحقہ پورا کرسکے اور اسلامی اصولوں اور تصورات کی بنیاد پر علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کے عصرِ نو کا آغاز کرنے میں اپنا قائدانہ کردار ادا کر

سکے۔

فوری طور پر جن اقدامات کے کرنے کی ضرورت ہے، ان میں سے چند اہم اقدامات کی حیثیت ان ہنگامی نوعیت کے اقدامات کی ہے، جو کسی طوفان یا آتش زدگی کے موقع پر گھروں اور آبادیوں کو بچانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ طویل المیعاد اقدامات کے کیے جانے اور ان کے نتائج سامنے آنے میں جو طویل وقت صرف ہو گا اور جس کی وجہ سے مزید جن خرابیوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے، ان کے سدِ باب کے لیے ضروری ہے کہ چند فوری اقدامات عمل میں لائے جائیں۔

ا۔ اس ضمن میں سب سے پہلا کام اساتذہ کی تربیت اور توجیہ نو (Reorientation) کا ہے۔ پرائمری اور مڈل سطح کے اساتذہ سے لے کر کالج اور یونی ورسٹیوں کے اساتذہ تک کے لیے الگ الگ تربیتی پروگرام مرتب کیے جانے چاہییں۔ بلاشبہ یہ ایک بہت بڑا، وقت طلب اور وسائل طلب کام ہے، لیکن عزم وارادے اور اخلاص کے سامنے ہر بڑی مہم چھوٹی اور ہر بڑی مشکل اور رکاوٹ ہیچ ہو جاتی ہے۔ یونی ورسٹیوں کی سطح پر اس کام کو انجام دینے کے لیے ملک کی تمام جامعات میں عارضی طور پر ایسے کریش پروگرام شروع کیے جاسکتے ہیں، جن کے تحت تمام نوجوان اساتذہ (لیکچرار اور اسسٹنٹ پروفیسر صاحبان) کو ایک ایک ماہ کے تربیتی اور توجیہی پروگراموں میں شرکت کا موقع ملے۔ ان پروگراموں میں ڈگری کالجوں کے اساتذہ بھی شریک کیے جاسکتے ہیں۔ دیگر کالجوں کے اساتذہ کے لیے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے زیرِ اہتمام ایسے کورس مرتب کیے جائیں، جو فاصلاتی تعلیم کے اصول اور طریقۂ کار کو اپنا کر بڑی تعداد میں اساتذہ کو تربیت فراہم کر سکیں۔

البتہ سب سے اہم اور مشکل مرحلہ پرائمری اور ثانوی اساتذہ کی تربیت کا ہو گا۔ اس کام کے لیے فوری طور پر جو کچھ کیا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ تربیت اساتذہ کے تمام کالجوں اور اداروں کے نصابات میں بنیادی اور جوہری اصلاحات کی جائیں اور کوشش کی جائے کہ آئندہ نسلوں کی تعلیم وتربیت کا کام جس طبقے کے سپرد ہے،

اس کی اپنی توجیہ (Orientation) اور قبلہ درست ہو۔ اس بنیادی اقدام کے ساتھ ساتھ ایسے قلیل المیعاد کورسز بھی شروع کیے جانے چاہئیں، جہاں پرائمری اساتذہ شریک ہو سکیں۔ اگر ایک بار اساتذہ کی تربیت کا ایک موثر سلسلہ شروع ہو جائے تو اس کے اثرات جلد ہی سامنے آنا شروع ہو جائیں گے۔

اساتذہ کے تربیتی اور توجیہی پروگراموں کی طرح اہل قلم، ادیبوں، اصحابِ دانش اور اربابِ صحافت کے تربیتی پروگرام بھی انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ آج کا دور ابلاغ کا دور ہے۔ آج عالمی ذرائع ابلاغ جس ہول ناک انداز میں دنیائے اسلام پر چھا رہے ہیں اور مذہب واخلاق کی دیواروں کو ایک ایک کر کے ڈھا رہے ہیں، وہ کسی ذی عقل سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے مقابلے میں دنیائے اسلام میں ابلاغ سے وابستہ بیش تر لوگوں کو اس طوفان کی ہول ناکی کا شاید کوئی اندازہ نہیں۔ ان میں بہت تھوڑے حضرات ایسے ہیں، جن کو خطرے کا صحیح اندازہ ہے اور وہ اس کی روک تھام کے لیے اپنے دلوں میں کوئی تڑپ بھی رکھتے ہیں۔

ان حالات میں یہ امر انتہائی ضروری ہے کہ اصحابِ ابلاغ اور اصحابِ تبلیغ کو قریب قریب لایا جائے اور ابلاغ کو تبلیغ کا ذریعہ بنایا جائے۔ اگر ذرائع ابلاغ سے کفر والحاد، اقدار سے دوری، اخلاق سے بعد اور مذہب سے بے زاری مسلمان نسلوں کے دماغوں میں اتاری جا سکتی ہے تو آخر مسلمانوں کو اس امر سے کیا چیز مانع ہے کہ وہ بھی آج کے ذرائع ابلاغ کو مذہب واخلاق، اسلامی اخوت ومساوات اور شریعت وجہاد کی تبلیغ کے لیے استعمال کریں؟ یہ کام جس فوری توجہ کا متقاضی ہے، اس پر شاید دو رائے نہ ہوں۔ اس غرض کے لیے اہل دین، تعلیمی اداروں اور اصلاح وتجدید کے کارکنوں کو آگے بڑھ کر پیش قدمی کرنی چاہیے۔ تجدید واحیائے دین کا کام محض مطالبات کرتے رہنے سے نہیں، انسان سازی اور ذہن سازی کی مسلسل، غیر منقطع اور مشترکہ کوششوں سے ہی ہو سکتا ہے۔

۲۔ دوسرا سب سے اہم اور فوری کام یہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کے لیے بالخصوص اور دیگر عام لوگوں کے لیے بالعموم ایسا دینی ادب تیار کیا جائے، جو نئے

شبہات کا جواب دے، نئے، اجنبی اور نامانوس ماحول میں اسلام پر کاربند رہنے اور اسلام سے وابستگی پر فخر محسوس کرنے میں مدد دے اور وہ ترغیب و تحریک پیدا کرے، جو مغرب کی فکری اور تہذیبی غلامی سے امت کو نجات دلانے کے لیے ناگزیر ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم قدم درسی کتب پر نظر ثانی کا ہے۔ بالخصوص انگریزی زبان میں جو درسی کتب ہمارے ہاں رائج ہیں، ان میں بے شمار چیزیں اسلامی اقدار سے متعارض اور متصادم ہیں۔ اگر اس غرض کے لیے اساتذہ کی غیر سرکاری انجمنیں اور کمیٹیاں بن جائیں اور وہ اپنے ذمے یہ کام لے لیں کہ جہاں جہاں درسی کتابوں میں اسلام سے متصادم مواد موجود ہو، اس کی نشان دہی کر کے متعلقہ افراد یا اداروں کو توجہ دلائیں تو اس کام میں بہت آسانی ہو جائے گی۔ ہمارے ہاں بہت سے موضوعات پر درسی کتب پڑوسی ملک سے درآمد کی جاتی ہیں اور وہ دھڑا دھڑ یہاں ری پرنٹ ہو رہی ہیں اور لاکھوں طلبہ ان کو پڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے بیش تر کتابیں ایسے موضوعات پر ہیں، جن کے ماہرین و متخصصین کی ہمارے ہاں کمی نہیں ہے۔ معاشیات، تاریخ، سیاسیات، قانون اور انگریزی ادب وغیرہ سے ہمارا واسطہ اب کم و بیش دو سو برس پرانا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان موضوعات پر بھی ہمارے اساتذہ بے دھڑک ہندو مصنفین کی کتابیں استعمال کر رہے ہیں اور ان میں موجود زہریلی خوراک ہمارے نوجوان طلبہ کو پلا رہے ہیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ اس لاپروائی میں ہمارے وہ اساتذہ بھی شریک ہیں، جو خیر سے دینی تحریکات اور اسلامی تنظیموں میں بھی پیش پیش رہتے ہیں اور اسلامی نظامِ تعلیم رائج کرنے کے مطالبات پیش کرنے اور نعرے بلند کرنے میں مصروف رہتے ہیں، لیکن اس اہم ذمے داری کا احساس نہیں کرتے۔

۳۔ فوری توجہ کا تیسرا میدان بڑھتی ہوئی ناخواندگی ہے، جو دراصل مغربی استعمار کا وہ تحفہ ہے جس سے ہم ابھی تک اپنی گلو خلاصی نہیں کرا سکے۔ ناخواندگی کی فنی تعریف دنیا میں جو کچھ بھی کی جاتی ہو، اسلامی نقطۂ نظر سے ناگزیر علم کا نہ ہونا

ناخواندگی ہے، جس کا ختم کیا جانا مسلمانوں کا اجتماعی اور دینی فریضہ ہے۔ ناگزیر علم سے مراد علم ودانش کا وہ کم سے کم معیار ہے، جس سے ہر شہری اور بالخصوص مسلمان شہری کو متصف ہونا چاہیے۔ اسلامی تعلیمات کے بہ موجب تعلیم کا ایک درجہ فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جس کے ذریعے ایک مسلمان کا عقیدہ، عبادت اور زندگی کی دوسری ناگزیر سرگرمیاں منظم ہوتی ہیں۔ یہ وہ ضروری اور ناگزیر درجہ ہے، جس سے مفر ممکن نہیں۔ اس سے آگے فرض کفایہ کا درجہ ہے جس میں تعلیم کی وہ سطح شامل ہے، جو ملک وملت کی آزادی، ترقی اور تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ امام غزالیؒ نے اس سطح میں صنعت، طب، تجارت اور ایسے ہی دوسرے علوم کو شامل کیا ہے۔ ان دونوں درجات کے بعد تکمیلیات اور تحسینیات کے درجے آتے ہیں، جو معاشرے کے تہذیبی ارتقا اور تمدنی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ ان درجات میں اعلیٰ ادبی تحقیق، فنون کی تعلیم اور دیگر اجتماعی اور انسانی علوم کی اعلیٰ تعلیم شامل ہے۔

اس گفت گو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ناخواندگی دور کیے بغیر علم کا وہ درجہ حاصل نہیں کیا جا سکتا، جو فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناخواندگی دور کرنے کے لیے سب سے اولین شرط ان اسباب وعوامل کا دور کرنا ہے جو ناخواندگی کا سبب ہیں اور اس کے تحفظ کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

وطن عزیز میں پھیلتی ہوئی ناخواندگی کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو درج ذیل اسباب سامنے آتے ہیں:

۱۔ جاگیرداری کا وہ ظالمانہ نظام جو انگریزی استعمار نے برصغیر میں قائم کیا۔ اس نظام کا بنیادی مقصد ہی یہاں کے عوام، بالخصوص مسلمان عوام کو کنٹرول کرنا تھا۔ جاگیرداروں نے اپنے زیر اثر مظلوموں کو تعلیم، صحت اور زندگی کی دوسری بنیادی سہولتوں سے جس طرح سے محروم رکھا ہے، وہ پوری دنیا کے سامنے ہے۔ وطن عزیز میں جاگیردار طبقے کی خاصی بڑی تعداد وہ ہے، جس نے ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے لے کر ۱۹۴۷ء میں آزادی ملنے تک ہر طرح انگریزی استعمار کی خدمت

کی اور مسلمانوں کی ہر اس تحریک یا اقدام کو ناکام بنانے کی پوری کوشش کی، جس کا مقصد انگریز کے اثرات سے قوم کو محفوظ رکھنا تھا۔ اس طبقے کے افراد کے لیے انگریزوں نے ملک کے چند بڑے شہروں میں اعلیٰ معیار کے تعلیمی ادارے پہلے ہی قائم کر دیے تھے، جہاں ان کی اولاد کو اعلیٰ مغربی تعلیم کی تمام سہولتیں حاصل تھیں۔ اس طبقے کی اولادیں ان اداروں میں، جو مغرب کے تہذیبی مراکز کی حیثیت رکھتے ہیں، تعلیم حاصل کر کے اپنی اس غریب، جاہل اور بے زبان رعایا پر حکومت کرتی چلی آ رہی ہیں جس کے نام پر آج وہ جمہوریت کے بھی چیمپین بنے ہوئے ہیں۔ اب جہاں ان اداروں کو حقیقی مفہوم میں پاکستانی اور مسلمان بنانے کی ضرورت ہے، وہاں ان اداروں سے بالخصوص اور پورے ملک سے بالعموم جاگیرداری کے منفی اثرات کو بھی ختم کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ دوئی اور ثنویت کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور اقلیت کی فرماں روائی کی روایت قائم رہے گی۔

۲۔ ناخواندگی کے تسلسل کا دوسرا بڑا سبب وہ مہیب کرپشن اور بدعنوانی ہے، جس نے جسدِ ملی کو ایک سرطان کی طرح اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ آج ہمارے ملک میں کوئی شعبہ بھی کرپشن کے نتائجِ بد سے محفوظ نہیں۔ اس دیمک نے عمارت کے ہر حصے کو اندر سے کھا لیا ہے۔ پنجاب کے فرضی تعلیمی اداروں اور فرضی معلمین (گھوسٹ اسکولوں اور گھوسٹ ٹیچرز) کی افسوس ناک داستانوں سے کون واقف نہیں؟ صوبۂ سندھ میں بہت سے سرکاری اسکول وڈیروں کی اطاق بنے ہوئے ہیں۔ بلوچستان کی حالت اس سے بھی پتلی ہے۔ وہاں تعلیم کا بجٹ کیسے اور کہاں خرچ ہوتا ہے؟ ہر شخص جانتا ہے۔

۳۔ پھر ہمارے ہاں تعلیم کا ہماری ضروریاتِ زندگی سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ انگریزی دور میں انگریزی تعلیم کا مقصد کالے انگریز اور کلرک پیدا کرنا تھا، وہ اس نظام نے خوب خوب پیدا کیے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آزاد اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی اس جدید تعلیم کا وہی مقصد اور ہدف ہونا چاہیے، جو سرسید احمد خان اور ان کے رفقا نے انیسویں صدی کے اواخر میں غلام ہندوستان کی پس

ماندہ اور شکست خوردہ مسلم اقلیت کے لیے طے کیا تھا؟ آج واقعہ یہ ہے کہ ہماری بے مقصد اور بے جہت تعلیم کے نتیجے میں قوم کے ڈگری یافتہ نوجوانوں کی بے کاری اور بے مصرفی میں روز بہ روز جو اضافہ ہو رہا ہے، اس سے بے شمار معاشرتی، اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی قباحتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ لہٰذا جب تک تعلیم کے پورے نظام اور نصاب پر از سر نو غور کر کے اس کو وطن عزیز کی اجتماعی، ملی اور اقتصادی ضروریات سے ہم آہنگ نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک ہمارے فارغ التحصیل نوجوانوں کی بے کاری اور بے مصرفی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی لاتعداد اور لامتناہی خرابیوں کا سدباب نہ کیا جا سکے گا۔ اگر ہم اپنی قومی، ملی اور دیگر ضروریات کا واضح تعین کر لیں تو نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں اصلاحات اور نئی توجیہات (Reorientations) طے کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔

اس ضمن میں ہماری تعلیم کے قومی اور ملی اہداف حسب ذیل ہونے چاہییں:

۱۔ ایک شریف، بااخلاق، باکردار شہری کی تیاری۔

۲۔ زیر تعلیم نوجوان کو ایک باعمل اور باکردار مسلمان اور سچا پاکستانی بنانا۔

۳۔ وطن عزیز کی اقتصادی ضروریات کے لحاظ سے افراد کار کی تیاری۔

۴۔ ملک میں زراعت، چھوٹی صنعتوں اور ملک میں دست یاب خام مال کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تربیت یافتہ افرادی قوت کی فراہمی۔

۵۔ ایک مسلم پاکستانی ثقافت کے فروغ اور تحفظ کے لیے بہ قدر ضرورت ماہرین کی تیاری۔

۶۔ اجتماعی اور انسانی علوم کی تشکیل نو اور تدوین نو کے لیے مناسب تعداد میں ماہرین کی فراہمی۔

۷۔ ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کی اس طرح فراہمی کہ ہمارے ملک میں تیار شدہ ماہرین ہماری ضروریات کی تکمیل کر سکیں۔ ہمارے خرچ پر پڑھ کر دوسروں کی تعمیر اور اپنی تخریب کا ذریعہ نہ بنیں۔ اس وقت ہمارے ہاں سے مہارتیں رکھنے والے لاکھوں نوجوان ہر سال مختلف مغربی ممالک کا رخ کر رہے ہیں

اور ہمارے خرچ پر حاصل کی ہوئی مہارتوں سے ان کی تعمیر کر رہے ہیں۔

۸۔ ناخواندگی کا ایک اور اہم سبب یہ بھی ہے کہ مغربی ثقافت اور مغربی تعلیم بہت حد تک ہماری اپنی ثقافت سے الگ ایک اجنبی چیز رہی ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں برصغیر کی قدیم تعلیمی روایات کو تو ڑ پھوڑ کر انگریزی روایات کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی تو یہاں کے مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت نے ان نئی روایات کو اسلامی ثقافت اور اسلامی تہذیب کے لیے زہر قاتل قرار دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے جدید تعلیم حاصل کرنے والوں میں مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مغربی تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کے اس شدید تحفظ کے پیش نظر ہی سر سید احمد خان کو ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ مغربی تعلیم کو دینی تعلیم اور اسلامی ثقافت سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا جائے۔ ان کا یہ جملہ مشہور ہے کہ ہم ایک ایسی نسل تیار کرنا چاہتے ہیں، جس کے ایک ہاتھ میں (مغربی) فلسفہ، دوسرے ہاتھ میں سائنس اور سر پر لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ کا تاج ہو۔ سر سید اور ان کے رفقا اور جانشین کس حد تک اس ہدف کو حاصل کرنے میں کام یاب ہوئے؟ یہ ایک الگ سوال ہے، جس کے جواب میں اہل علم کی آرا متفاوت ہو سکتی ہیں، لیکن سر سید کی طرف سے اس ہم آہنگی کی اہمیت ضرورت کا احساس کیا جانا ایک اہم ملی مسئلے اور قومی ضرورت کی نشان دہی کر ہے۔

جدید تعلیم کو اسلامی ثقافت سے ہم آہنگ کرنے کی جتنی ضرورت سر سید کے زمانے میں تھی، آج اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس زمانے میں مغربی تہذیب ثقافت کی وہ بھرپور اور جارحانہ یلغار نہیں تھی، جو آج دیکھنے میں آ رہی ہے۔ اس وقت مغربی ثقافت و تہذیب کے اثرات صرف چند بڑے شہروں کے ایک چھوٹے طبقے تک محدود تھے۔ آج یہ اثرات ٹی وی، فلموں، اخبارات اور رسائل کے ذریعے گھر گھر پہنچ رہے ہیں اور نظام تعلیم کے ذریعے ہونے والی فکری اور ذہنی تبدیلیوں سہ آتشہ، بل کہ چہار آتشہ اور پنج آتشہ کر رہے ہیں۔ مغربی تعلیم کے ذریعے مغربی

اور سیکولرازم کے جو بیج ناپختہ اور کچے دماغوں میں بوئے جاتے ہیں، ان کو ذرائع ابلاغ چشم زدن میں اباحیت اور الحاد کے تن آور درختوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ جدید تعلیم کے ان مہیب نتائج کو دیکھ کر آج بھی وطن عزیز کے مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد اس نظام کی افادیت کے بارے میں شدید تحفظات رکھتی ہے۔ یہ تحفظات بھی اس نظام کے بارے میں بہت سے لوگوں کی عدم دل چسپی کا سبب بنتے ہیں۔ پھر عدم دل چسپی کے نتیجے میں بچے اسکولوں سے دور رہتے ہیں، جو ناخواندگی کا ایک اہم سبب ہے۔

۵۔ ناخواندگی کا ایک اور سبب تعلیم کی طبقاتیت ہے۔ طبقاتیت نے جہاں ہمارے معاشرے کے اور بہت سے پہلوؤں کو تباہی سے دوچار کیا ہے، وہاں اس کے اثراتِ بد تعلیم پر بھی پڑے ہیں، بل کہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ تعلیم اس طبقاتیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ نہ صرف قدیم اسلامی دور میں بل کہ آج بھی آزاد اور ترقی یافتہ معاشروں میں قوم کے ہر فرد اور ہر گروہ کے لیے ایک ہی تعلیم کا اصول رائج ہے۔ آج بھی دنیا کے کسی آزاد اور ترقی یافتہ ملک میں تعلیم کے نام پر ایسی طبقہ بندی نہیں ہے، جس کا ہم شکار ہیں اور جس کے منفی نتائج آج پوری قوم کے سامنے ہیں۔ ہمارے ملک میں تعلیمی اداروں کی اتنی ہی سطحیں بن چکی ہیں، جتنی سطحیں لوگوں کی آمدنیوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرے میں موجود معاشی درجہ بندیاں اس طبقاتی تعلیم کے ذریعے ذہنی اور فکری درجہ بندیوں کی شکل اختیار کرتی چلی جاتی ہیں اور یوں معاشرے میں تقسیم در تقسیم کا عمل جاری رہتا ہے۔ جب تک تعلیم کی اس طبقاتیت کو بیخ و بن سے نہ اکھاڑا جائے گا، اس وقت تک ملی وحدت اور یک جہتی کا حصول ایک خواب ہی رہے گا۔

اس تعلیمی طبقاتیت کے خاتمے کے لیے سب سے پہلا اور ناگزیر قدم یہ ہے کہ کم از کم ابتدائی تعلیم سے لے کر دسویں جماعت تک پورے ملک میں ایک نصاب، ایک ذریعۂ تعلیم اور یک ساں قسم کا نظام امتحان ہو۔ دسویں جماعت کے بعد ہر بچہ اپنی استعداد اور ذوق کے مطابق جو میدان اختیار کرنا چاہے، اس کو اختیار کرنے کی

اس کو نہ صرف مکمل آزادی ہو، بل کہ نظامِ تعلیم بھی ایسا ہو کہ ہر بچہ کسی معاشی پریشانی میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے پسندیدہ میدان کو اختیار کر سکے۔ ۱۹۷۹ء کی تعلیمی پالیسی میں بڑی حد تک اس بات کی ضمانت دی گئی تھی۔ اس سے قبل ۱۹۶۹ء میں ائیر مارشل نور خان کی تعلیمی رپورٹ میں بھی خاصی حد تک یہ تصور موجود تھا۔ اگر ان دونوں رپورٹوں پر اخلاص سے عمل کیا جاتا تو بڑی حد تک اس طبقاتیت پر قابو پایا جا سکتا تھا۔

۶۔ ناخواندگی کے بہت سے اسباب میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ پرائمری اور متوسط سطحوں پر ہمارے نصابِ تعلیم کا عامۃ الناس کے روزمرہ مسائل اور معاملات سے کوئی گہرا اور دیرپا ربط نظر نہیں آتا۔ بالخصوص ہمارے دیہاتوں کے ماحول میں ایک عام کسان یا مزدور کے بچے کو جن معاملات و مسائل سے دن رات واسطہ پڑتا ہے، ان کا تذکرہ اس کی نصابی کتابوں میں بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ اگر پرائمری اور مڈل کی سطح تک کم از کم دیہاتوں میں تعلیم کو ملک کے زرعی مسائل اور فنی تعلیم کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو ایسے بہت سے بچے اپنی تعلیم کو جاری رکھنے میں افادیت محسوس کریں گے، جو اب تیسری یا چوتھی جماعتوں کے بعد اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ برِصغیر کے مشہور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے تقسیمِ ہند سے بہت پہلے ایک ایسے تعلیمی نظام کا خاکہ تیار کیا تھا، جس میں فنی تربیت اور زراعت کی تعلیم کو بنیادی اہمیت دی گئی تھی۔ یہ تعلیمی رپورٹ مسلمانوں میں بعض دوسرے اہم اسباب کی وجہ سے نہایت غیر مقبول ہوئی۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر پرائمری اور مڈل کی سطح پر تعلیم کا عوام کی روزمرہ کی ضروریات سے زیادہ گہرا تعلق ہو تو اس بات کی بڑی حد تک امید کی جا سکتی ہے کہ دیہاتوں میں خواندگی کا معیار بلند ہو جائے۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اور حصولِ تعلیم میں اہمیت اور فرضیت کے لحاظ سے جو درجات اسلامی تعلیمات میں بتائے گئے ہیں، ان کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کیا جائے۔ اسلام میں تعلیم کا سب سے کم درجہ جو نہ صرف انتہائی ناگزیر، بل

کہ ہر شہری کے لیے فرض عین کا درجہ رکھتا ہے، وہ درج ذیل چار عناصر سے عبارت ہے:

الف: اسلامی عقائد کی بہ قدر ضرورت تعلیم۔ (ماتصح بہ العقیدۃ)

ب: بنیادی اسلامی احکام کا علم، جس سے کم از کم روزمرہ کی عبادات انجام دی جاسکیں۔ (ماتصح بہ العبادۃ)

ج: بنیادی اور ضروری معاشرتی احکام اور حقوق و فرائض سے واقفیت۔ (ماتصح بہ المعاشرۃ)

د: اپنے پیشے اور معاشی معاملات کا ضروری اور بنیادی علم۔ (ماتصح بہ المعیشۃ)

اگر پرائمری سطح پر نصاب تعلیم کی تدوین میں مذکورہ بالا چار عناصر کو بہ قدر ضرورت سمو دیا جائے تو نہ صرف تعلیم کی افادیت میں بہت اضافہ کیا جاسکے گا، بل کہ تعلیم کی بے مصرفی کا تاثر بھی زائل کیا جاسکے گا اور ابتدائی تعلیم کی اسلامی تشکیل کے ایک اہم مقصد کی بھی تکمیل ہو سکے گی۔

تعلیم کے اس ناگزیر درجے کے بعد، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، دوسرا درجہ فرض کفایہ کا ہے، جس میں فقہائے اسلام نے سائنس، فنی مہارتوں، طب اور انجینئرنگ جیسے علوم کو شامل کیا ہے، جن کا حصول پوری امت مسلمہ کی اجتماعی ذمے داری ہے۔ اگر امت مسلمہ میں ایک مؤثر تعداد ان علوم میں اتنی مہارت حاصل کر لے کہ امت ان علوم میں خود کفیل ہو جائے اور دوسروں کی دست نگر نہ رہے تو فرض کفایہ پر عمل درآمد کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں، لیکن اگر ان فرائض کی انجام دہی میں غفلت برتی جائے یا ان علوم و فنون کے ماہرین کی تعداد یا مہارتوں کی سطح ایسی نہ ہو، جو امت کو خود کفیل بنا سکے اور اغیار کی دست نگری سے محفوظ رکھ سکے تو پوری امت گناہ گار ہوتی ہے۔

ان دو درجات کے بعد بقیہ دو درجے تکمیلی اور تحسینی درجات کہلاتے ہیں۔ یہ وہ درجات ہیں جو معاشرے میں ثقافتی ترقی، تمدنی پیش رفت اور تہذیبی ارتقا میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ علم کا یہ وہ درجہ ہے جس کی نہ ہر شخص کو ضرورت ہے اور

نہ کوئی معاشرہ بڑی تعداد میں ان علوم وفنون کے اعلیٰ ترین ماہرین کی فراہمی کا بندوبست کر سکتا ہے اور نہ کماحقہ اس بڑی تعداد سے مستفید ہو سکتا ہے، اس لیے ان ماہرین کی ایک محدود، لیکن بہ قدر ضرورت تعداد ہی کافی ہوتی ہے۔ ضرورت سے زائد ماہرین اگر معاشرے میں آجائیں تو وہ بے مصرفی کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ شریعت کے ان احکام کی روشنی میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کا جو درجہ ناگزیر اور فرض عین ہے، اس کو پرائمری اور مڈل کی سطحوں تک مکمل کر لیا جائے۔ اس کے بعد جو درجہ فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کو گریجویشن سطح تک حاصل کر لیا جائے۔ تکمیلی اور تحسینی درجات کے ادارے محدود ہوں اور وہاں صرف اتنے ہی افراد کی گنجایش ہو، جتنے افراد معاشرے کو درکار ہیں۔

یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اس کے لیے نہ حکومت کے محدود وسائل کفایت کر سکتے ہیں اور نہ اس کو کلی طور پر پرائیویٹ شعبے پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس عمل میں سرکاری اور غیر سرکاری تمام دست یاب وسائل کو یک جا کر کے ہی کوئی قابل ذکر پیش رفت کی جا سکتی ہے۔ اس غرض کے لیے بعض فوری اقدامات کے ساتھ ساتھ چند دور رس اور رجحان ساز اقدامات کی بھی ضرورت ہے۔ فوری طور پر جو اقدامات کیے جا سکتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

فوری اقدامات

ا۔ بنیادی، ناگزیر اور لازمی تعلیم کا ایک ایسا نصاب مرتب کیا جائے، جو مذکورہ بالا عناصر اربعہ پر مشتمل ہو۔ یہ نصاب فی سال ایک کتاب، ایک قاعدے، ایک تختی اور ایک سلیٹ پر مشتمل ہو۔ اگر ملک میں موجود تمام مساجد کو، جن کی تعداد کا اندازہ اڑھائی اور تین لاکھ کے درمیان بتایا جاتا ہے، ایسے مکتبوں میں تبدیل کر دیا جائے جہاں یہ آسان اور سادہ نظام پڑھا جائے تو بہت کم اخراجات سے چند سال کے اندر اندر ناخواندگی کی مصیبت اور بدنامی سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت پرائمری تعلیم کے پانچ سالوں کے دوران عملاً صرف تین سال تعلیم ہوتی

ہے اور بقیہ ۲۳۰ دن مختلف قسم کی تعطیلات کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اگر ان تمام تعطیلات کو ختم کر کے ایک بھر پور پانچ سالہ نصاب تیار کیا جائے تو بہت جلد ایک ایسی نسل تیار کی جاسکتی ہے، جو ضروری دینی اور دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ ناگزیر فنی تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت کی بھی حامل ہو گی۔

۲۔ اگر پاکستان کے تمام رائے دہند گان کے لیے خواندگی کی شرط کولازمی قرار دے دیا جائے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ انتخابات میں کھڑے ہونے والے ممکنہ قائدین اپنے ووٹوں اور ووٹروں کی تعداد میں اضافے کے لیے خود اپنے وسائل سے تعلیم بالغاں کی ایسی مہمات میں حصہ لینے کے لیے خوشی سے آمادہ ہو جائیں گے، جن کا مقصد ان کے حامی رائے دہند گان کو ضروری تعلیم دے کر ان کے ووٹوں میں اضافہ کرنا ہو۔ اس غرض کے لیے ایک ایسا مختصر پیکج تیار کیا جاسکتا ہے، جس کے ذریعے ایک سے دو سال کے اندر اندر ایک بالغ ووٹر لکھنا اور پڑھنا سیکھ سکے اور بہ قدر ضرورت حساب کے قواعد جان سکے۔ امیدواروں کو انتخابی نشان الاٹ کیے جانے کا رواج اس طرح ہوا تھا کہ ہمارے ہاں کے ووٹر ناخواندہ ہونے کی وجہ سے امیدوار اور اس کی جماعت کا نام نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اگر انتخابی نشان الاٹ کرنے کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور رائے دہند گان کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ بیلٹ پیپر پر امیدوار اور اس کی جماعت کا نام پڑھ کر اس پر مہر لگائیں تو یہ بات امیدواروں کے اپنے مفاد میں ہو گی کہ وہ اپنے حامی ووٹروں کو اتنا لکھنا پڑھنا ضرور سکھا دیں کہ وہ ان کا اپنا نام بیلٹ پیپر پر پڑھ سکیں۔

۳۔ ایک قانون کے ذریعے ان تمام اداروں اور افراد کو جو کسی شخص یا اشخاص کو بہ طور مزدور یا ملازم رکھیں، اس بات کا پابند بنا دیا جائے کہ وہ اپنے مزدوروں اور ملازمین کو بنیادی اور ناگزیر تعلیم دلانے کا بندوبست کریں۔ مزدور اور ملازم کو ناخواندہ رکھنا جرم قرار دیا جائے۔ اس طرح گھریلو ملازمین کی بڑی تعداد اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور زمینوں پر کام کرنے والے کسانوں کو مختصر عرصے میں خواندہ بنایا جاسکے گا۔

۴۔ اساتذہ کی تربیت، بالخصوص پرائمری اور مڈل اسکولوں کے اساتذہ کی فوری تربیت جہاں دیگر اسباب کی وجہ سے ضروری ہے، وہاں ناخواندگی کے فوری خاتمے کے لیے بھی ضروری شرط ہے۔ ناخواندگی کے خاتمے کے لیے کیے جانے والے اقدامات اسی وقت مؤثر ہو سکتے ہیں، جب اساتذہ کو مناسب انداز اور مناسب تعداد میں اس کے لیے تیار کر لیا گیا ہو۔ لہٰذا اساتذہ کی تربیت اس کام کے لیے بھی ایک اہم اور ضروری قدم ہے، جو فوری طور پر اٹھایا جانا ضروری ہے۔ یہاں تربیت سے مراد محض وہ فنی تربیت نہیں، جو تربیت اساتذہ کے اداروں میں کسی نہ کسی حد تک پہلے ہی دی جا رہی ہے، بل کہ یہاں تربیت سے مراد نئی نسل کے مربی حضرات کی وہ توجیہِ نو ہے، جس کے نتیجے میں وہ قوم کو ایک نئے مستقبل کے لیے تیار کر سکیں۔ یہ تربیتی پروگرام اس انداز سے مرتب کیے جانے چاہییں کہ ان کے ذریعے شرکا میں ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا ہو سکے۔ پروگرام اتنی تعداد میں منعقد ہوں کہ وطن عزیز کے ہر حصے سے اساتذۂ کرام کی ایک بڑی تعداد ہر سال ان سے مستفید ہو سکے۔ اس غرض کے لیے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی کے علاوہ دوسرے اداروں کو متحرک کیا جانا چاہیے۔

دور رس اور طویل المیعاد اقدامات

ایک متوازن، ترقی پذیر اور اسلامی روایات سے ہم آہنگ نظام تعلیم وضع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے لیے فکری سطح پر ضروری اور مناسب تیاری کی جائے۔ گزشتہ دو سو سال کے دوران جن جن تعلیمی مفکرین نے تصور تعلیم اور نظام تعلیم پر اظہار خیال کیا ہے، ان سب کے خیالات اور نظریات کو سامنے رکھ کر ایک جامع تصور تعلیم کی ترتیب و تشکیل ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ علوم و فنون کی نئی درجہ بندی کی جائے۔ اس درجہ بندی میں جہاں ناگزیر، ضروری، فرض کفایہ، تکمیلی اور تحسینی سطحوں کو پیش نظر رکھا جائے، وہاں پاکستان کی مستقبل کی ضروریات کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ جو علوم و فنون

پاکستان کی بقا اور وطن عزیز کے اسلامی تشخص کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہیں، ان کو انتہائی ضروری اور ناگزیر علوم کے دائرے میں رکھا جائے۔ پھر جیسے جیسے علوم و فنون کی اخلاقی، نظریاتی، اقتصادی اور فنی ضرورتیں کم ہوتی چلی جائیں، ان کو درجہ بدرجہ فرض کفایہ، تکمیلی اور تحسینی سطحوں پر جگہ دی جائے۔ ایک قابل عمل اور دیرپا نظام تعلیم کی تدوین کے لیے یہ نئی درجہ بندی پہلے قدم کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی بنیاد پر نظام تعلیم میں مختلف علوم و فنون کی حیثیت طے ہونی چاہیے۔

وطن عزیز میں موجود تعلیمی اداروں میں نصاب تعلیم کی تجدید اور تشکیل نو کے بارے میں دو انتہا پسندانہ رویے پائے جاتے ہیں۔ ایک رویہ جو عموماً روایتی دینی درس گاہوں کے ارباب بست و کشاد کا طرۂ امتیاز ہے، وہ نصاب تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی کو دین اور روایات سے انحراف کے مترادف قرار دیتا ہے۔ ان حضرات کے خیال میں جو درسی کتابیں آج سے ایک ہزار سال قبل کے ماحول میں لکھی گئی تھیں، وہ آج جوں کی توں رہنی چاہییں، حتیٰ کہ خالص علوم آلیہ کی تعلیم کے باب میں جہاں جدید عرب دنیا میں بیش بہا تجربات ہوئے ہیں، وہاں بھی ہر نئی چیز سے صرف نظر کر کے پرانی کتابیں صرف اس لیے پڑھائی جائیں کہ وہ پرانی ہیں۔ صرف و نحو اور قواعد کی جو کتابیں آج سے کئی سو سال قبل فارسی میں اس لیے لکھی گئیں کہ اس وقت تعلیم و ثقافت کی زبان فارسی تھی، وہ آج بھی نصاب تعلیم کا جز ہیں اور صرف ان کتابوں کو پڑھنے کے لیے پہلے تمام طلبہ کو فارسی پڑھائی جاتی ہے۔

اس کے برعکس ایک دوسرا انتہا پسندانہ رویہ یہ ہے کہ بغیر کسی جواز کے ہر سال یا دوسرے تیسرے سال نصابی کتابیں تبدیل کر دی جائیں، حتیٰ کہ اردو، دینیات اور تاریخ پاکستان جیسے موضوعات پر بھی، جن میں کسی نئی دریافت کے امکانات ناپید ہیں، ہر سال نیا نصاب متعارف کرایا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ طلبہ کی فکر میں کوئی تسلسل پیدا ہوتا ہے اور نہ کسی کم از کم معیار کے تحفظ کی ضمانت باقی رہتی ہے۔ مزید برآں ہمارے ملک میں نصاب سازی ایک کاروبار بن کر رہ گئی ہے اور ایسے بہت سے پیشہ ور حضرات نے اس کو آمدنی کا ذریعہ بنالیا ہے، جو

سرکاری دفاتر میں اثر و رسوخ کی وجہ سے نصابی کتابیں لکھ کر حکومت کے ہاتھ فروخت کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس روزمرہ کی تبدیلی کا ایک منفی اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ حکومتوں کی وقتی مصلحتیں نصابِ تعلیم پر اثرانداز ہوتی ہیں اور ہر آنے والی حکومت ایک نیا نصاب اور ایک نئی تعلیمی پالیسی جاری کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ درسی مواد اور نصابی کتابوں کے کاروبار سے وابستہ افراد اور متعلقہ سرکاری اہلکار بھی آنے والی حکومتوں کو نئے نصاب اور نئی تعلیمی پالیسی مرتب کرنے پر آمادہ کرتے ہیں اور پھر خود ہی حسب سابق ایک نئی پالیسی بنا کر لے آتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک متوازن اور متوسط راستہ اختیار کیا جائے۔ نصاب میں جہاں تبدیلی اور اصلاح کی ضرورت اہل علم محسوس کریں، وہاں اصلاح کا عمل آسان ہو اور جہاں اس کی ضرورت نہ ہو، وہاں کسی وقتی سیاسی مصلحت یا انفرادی مفاد کی خاطر نصاب میں تبدیلی کا عمل بہت مشکل ہو۔

قدیم اسلامی ادوار میں علوم، فنون اور صنائع میں فرق ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ ابن خلدون اور اس سے پہلے کے تعلیمی مفکرین نے ان تینوں چیزوں کے درمیان فرق کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ علوم سے مراد وہ تعلیمی اور فکری کاوشیں تھیں، جن کے حصول اور فروغ میں بنیادی کردار انسانی ذہن اور دماغ کا ہو۔ چناں چہ تمام دینی علوم، عقلیات، فلسفہ، حکمت، بیش تر معاشرتی علوم اور انسانیت کے شعبے علوم میں شامل سمجھے گئے۔ فنون سے مراد وہ کاوشیں تھیں، جن میں انسانی ذہن کے ساتھ ساتھ اس کی جمالیاتی حس بھی کارفرما ہو۔ فنون میں ادبیات عالیہ، شعر و شاعری، خطاطی اور آرٹ وغیرہ شامل تھے۔ صنائع سے مراد عام طور پر وہ کاوشیں تھیں، جن میں انسان کی فکری کاوش اور جمالیاتی حس کے ساتھ ساتھ اس کی جسمانی محنت اور کوشش کا زیادہ حصہ ہو۔ چناں چہ وہ طلبہ جو ذہنی اور فکری طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہوتے تھے، وہ عموماً علوم کا میدان اختیار کرتے تھے۔ جو طلبہ جمالیاتی حس اور فنی شعور کے حامل سمجھے جاتے تھے، وہ عموماً فنون کا میدان اپناتے تھے اور باقی طلبہ کے لیے صنائع کا وسیع میدان کھلا ہوتا تھا۔

آج طلبہ کی بڑی تعداد ان میدانوں کو اختیار کر رہی ہے، جو مذکورہ بالا تقسیم کی رو سے صنائع سے تعلق رکھتے ہیں۔ نہ صرف معاشرے، بل کہ حکومت کے وسائل بھی طلبہ کی بڑی تعداد کو ان ہی علوم کی طرف راغب کرنے میں مصروف ہیں۔ بلاشبہ وطن عزیز کو آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ مہارتوں کی ضرورت ہے اور ملک کے بیش تر وسائل کا رجحان اسی طرف ہونا چاہیے، لیکن اس باب میں ہم سے بہ حیثیت قوم جو فرو گزاشت ہوئی ہے، وہ طلبہ کی صلاحیتوں اور ملک کی ضروریات کا عدم ادراک ہے۔ اس کا نتیجہ وسائل اور صلاحیتوں کے ضیاع کی صورت میں ہمارے سامنے آرہا ہے۔ آج ہمارے ہزاروں ایسے نوجوان جو اعلیٰ سائنسی اور فنی تعلیم رکھتے ہیں، سرکاری دفاتر میں انتظامی ذمے داریوں پر مامور ہیں۔ اس کے برعکس انتظامی ذمے داریوں کی انجام دہی کے لیے جن مہارتوں کی ضرورت ہے، ان کا بہت تھوڑا ادراک تدوین نصاب کے مرحلے میں کیا جاتا ہے۔ اس عدم ادراک کا ایک منفی نتیجہ یہ بھی ہے کہ خالص انسانی علوم، ادبیاتِ عالیہ اور اجتماعی علوم، مثلاً تاریخ، عمرانیات وغیرہ سے نوجوان نسل کی دل چسپی تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ اس عدم دل چسپی کے خطرناک تہذیبی اور تمدنی نتائج برآمد ہونے کا شدید خطرہ موجود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اجتماعی علوم اور انسانیات، لسانیات اور ادبیات کو نظرانداز کرنے یا کم از کم ثانوی حیثیت کا حامل قرار دینے کی پالیسی پر نظر ثانی کی جائے۔ ان علوم کو نظرانداز کرنے کے نتیجے میں ہماری آئندہ نسلیں نہ صرف ماضی سے کٹ کر رہ جائیں گی، بل کہ یہ چیز ہمارے تہذیبی اور تمدنی مستقبل کے لیے نہایت تباہ کن ثابت ہوگی۔ ہمارے ہاں یہ تاثر پھیل گیا ہے کہ مشرق و مغرب کی ترقی یافتہ اقوام نے صرف سائنس اور ٹیکنالوجی پر زور دینے کی وجہ سے ترقی کی ہے، لہٰذا ہمیں بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بقیہ تمام فکری اور تہذیبی کاوشوں سے صرف نظر کر لینا چاہیے۔ ہمارے ہاں بہت سے حضرات یہ بات بھول جاتے ہیں کہ جن مشرقی یا مغربی اقوام کی نقالی کے نام پر ان اہم علوم و فنون سے نظریں چرائی جا رہی ہیں، وہاں ان ہی علوم و فنون کی تدریس و تحقیق پر اربوں روپے خرچ کیے

جا رہے ہیں۔

ایک مسلم معاشرہ ہونے کی حیثیت سے ہم اس ذمے داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے کہ اپنے تمام معاملات اور فیصلوں میں ان کے اخلاقی پہلوؤں کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ اسلام نے علم نافع اور علم غیر نافع میں فرق کیا ہے۔ پھر علم غیر نافع کے بعض شعبے ایسے ہیں، جو علم ضار کی تعریف میں آتے ہیں۔ ہمارے نصاب تعلیم میں کوئی ایسی چیز شامل نہیں ہونی چاہیے جو روحانی، ملی، ملکی، مادی اور اقتصادی اعتبار سے ضرر رساں ہو۔ مادی ضرر رسانی کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ ہم لاکھوں، بل کہ کروڑوں روپے خرچ کر کے ایسے شعبوں کے ماہرین بھی تیار کر رہے ہیں، جن کی ملک میں کوئی کھپت نہیں اور وہ اغیار کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے رہے ہیں۔

یہ بات خوش آئند ہے کہ اب وطن عزیز میں سائنس کی تعلیم کا ایک واضح اور طے شدہ منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے۔ اس منصوبے کی تیاری میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ اعلیٰ سائنسی تعلیم کے بہت سے شعبے اب مسلمانوں کے لیے شجر ممنوعہ قرار دیے جا رہے ہیں۔ دنیا کی بہت سی یونی ورسٹیوں میں سائنس کے میدانوں میں مسلمان طلبہ کا داخلہ عملاً بند کر دیا گیا ہے۔ ان حالات میں سائنسی تعلیم کے کسی بھی منصوبے کی تیاری کے لیے دنیائے اسلام کے دوسرے بڑے ممالک سے تعاون، تفہیم اور تنسیق ضروری ہے۔ جب تک اس تعاون اور تنسیق کے نتیجے میں تقسیم کار نہیں ہو گی، اس وقت تک کوئی قابل عمل پیش رفت ممکن نہ ہو گی۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ دنیائے اسلام میں بعض مہارتیں ابھر رہی ہیں۔ پاکستان، ترکی، مصر، ملائیشیا اور قازقستان وہ ممالک ہیں، جو اپنی خاص خاص مہارتوں کی وجہ سے اغیار کی آنکھوں میں کھٹک رہے ہیں اور ان ممالک کو ان مہارتوں سے محروم کرنے کی کوششیں جاری ہیں اور ان کوششوں کو کام یاب اور موثر بنانے کے لیے ترغیب اور ترہیب کے حربے اختیار کیے جا رہے ہیں۔ اگر پہلے ہی مرحلے میں ان ممالک کے مابین تعاون اور تنسیق کی فضا پیدا ہو جائے اور یہ مل کر ایک دوسرے کی مہارتوں کا تحفظ بھی کریں اور ان کو ترقی دینے میں ایک دوسرے سے تعاون بھی کریں اور اس کے

ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی مہارتوں اور تجربوں سے فائدہ بھی اٹھائیں تو پوری دنیائے اسلام اس عمل سے مستفید ہو سکے گی۔

اگر مذکورہ بالا ممالک میں موجود اعلیٰ تربیتی اداروں کو مشترکہ تعاون سے سینٹرز آف ایکسی لنس کا درجہ دے دیا جائے اور وہاں ان سب مسلم ممالک کے طلبہ کے لیے مناسب تعداد میں نشستیں مختص کر دی جائیں تو اس عمل سے تعاون بڑھانے میں بڑی مدد ملے گی۔ مزید برآں اس تعاون کے نتیجے میں امید ہے کہ کم از کم مسلم ممالک میں دست یاب مہارتیں ایک دوسرے کو آسانی کے ساتھ حاصل ہو جائیں گی۔

اس ضمن میں اسلامی ممالک کی مشترکہ تنظیم اوآئی سی بھی اپنا کردار ادا کر سکتی ہے۔ اوآئی سی کا متعلقہ شعبہ خوش قسمتی سے پاکستان میں ہی قائم ہے اور ہمارے ملک کے انتہائی نام ور اور فعال سائنس دان محترم جناب ڈاکٹر عطاء الرحمن اس کے سربراہ ہیں، جو اس وقت سائنس اور ٹیکنالوجی کے وفاقی وزیر کے منصب پر فائز ہیں۔ اگر اوآئی سی کے زیر اہتمام دس بڑے مسلم ممالک میں تعلیمی، سائنسی اور فنی تعاون کا کوئی منصوبہ بن جائے جو مذکورہ خطوط پر کام کرے تو امید ہے کہ ایسی پیش رفت کو بہت جلد ایک قابل لحاظ سطح تک پہنچایا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ دنیائے اسلام کے ان دس ممالک کی قیادت کسی حد تک جرات، عزم، ارادے اور مردانگی کے ساتھ ساتھ غیرت ملی کا مظاہرہ کرے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، اس سارے عمل میں متعلقہ مسلم ممالک کی ضروریات اور کھپت کا حقیقی اندازہ کرنا ناگزیر ہے۔ آج ہمارے وسائل دوسروں کی تعمیر میں صرف ہو رہے ہیں۔ آج جب ہمارا اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان وطن عزیز کے وسائل سے کروڑوں روپیہ خرچ کر کے تیار ہو جاتا ہے اور پھر اپنی صلاحیتوں اور مہارتوں کو دوسروں کی تعمیر میں صرف کرتا ہے تو بے اختیار غنی کشمیری کا یہ شعر زبان پر آ جاتا ہے:

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن

کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

کیا ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے غریب ملک کے لاکھوں اور کروڑوں وسائل خرچ کرنے کے بعد کینیڈا اور امریکا، یورپ یا آسٹریلیا سدھار جانے والے نوجوان وطن عزیز کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں؟

سائنسی تعلیم کے باب میں ایک اور اہم پہلو جو سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے، وہ یہ ہے کہ اب تک ہمارے ملک میں سائنسی تعلیم کا سارا تصور اور تجربہ امریکا، برطانیہ اور ان چند اینگلو سیکسن ممالک سے آتا رہا ہے، جن سے انگریزی زبان کی قدر مشترک کی وجہ سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ مانوس ہے۔ ہمارے ہاں سائنسی تحقیق اور سائنسی تعلیم سے مراد وہ تحقیق اور تعلیم ہے جو امریکا، برطانیہ یا کینیڈا وغیرہ کی جامعات یا اعلیٰ تحقیقی اداروں میں ہو رہی ہے۔ ہمارے بیش تر سائنس دانوں کو شاذ ونادر ہی چین، روس، جاپان، جرمنی اور فرانس میں ہونے والی تازہ ترین تحقیقات سے واقفیت کا موقع ملتا ہے۔ اس صورت حال میں اس بات کا شدید خدشہ موجود ہے کہ ہم سائنسی علوم اور تحقیقات کے بڑے اہم سرچشموں سے محروم نہ ہو جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ سائنس کی اعلیٰ تعلیم کی سطح پر مذکورہ بالا ممالک کی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ بہتر تو یہ ہے کہ ایم ایس سی کی سطح پر اس کا بندوبست کیا جائے، تاہم اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کم از کم پی ایچ ڈی کی سطح پر کسی ایک بڑی غیر ملکی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی جائے اور سائنسی مضامین میں پی ایچ ڈی کرنے والے حضرات اپنے متعلقہ فن میں اعلیٰ مہارت کے ساتھ ساتھ کسی ایک غیر ملکی زبان میں بھی مہارت حاصل کریں۔

سائنسی مضامین کے وہ شعبے جہاں غیر معمولی اخراجات اور وسائل درکار ہیں، خصوصی توجہ کے متقاضی ہیں۔ خاص طور پر تخصص کے وہ میدان جن کی بیرون ملک وسیع مانگ ہے، ان میں ملکی وسائل خرچ کرنے کے معاملے میں بہت احتیاط اور غور و خوض کی ضرورت ہے۔ ایسی ہزاروں مثالیں ہیں کہ حکومت پاکستان کے وظیفے پر اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک جانے والے طلبہ نے پاکستان کے خرچ پر تعلیم مکمل

کی اور جوں ہی تعلیم مکمل ہوئی، وہ کسی نہ کسی بیرونی ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ اگرچہ اس صورت حال کا سوفیصد سدباب کرنا تو ممکن نہیں، تاہم بڑی حد تک اس کو روکا جاسکتا ہے اور بعض ایسے اقدامات کیے جاسکتے ہیں جن کے ذریعے طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے بعد وطن عزیز کی خدمت کے لیے آمادہ کیا جاسکے۔ مثال کے طور پر سائنسی اور فنی مضامین میں ایم اے کی سطح سے اوپر کسی طالب علم کو اس وقت تک کوئی وظیفہ نہ دیا جائے، جب تک وہ واضح طور پر اس بات کا عہد نہ کرے کہ وہ ایک مقررہ مدت تک ملک میں کام کرے گا۔ یہ مدت مختلف مہارتوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہے۔

سائنسی اور فنی تعلیم کی اس اہمیت کے باوجود، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، اجتماعی اور انسانی علوم کی اہمیت سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ مناسب یہ ہے کہ ملک کی عمومی جامعات (جنرل یونی ورسٹیز) میں فی الوقت موجود شعبہ جات اور کلیات کو بہتر سے بہتر بنایا جائے اور ان کو ایسے سینٹرز آف ایکسی لنس کی حیثیت دے دی جائے، جو متعلقہ تخصصات میں دست یاب مہارتوں کو بہتر سے بہتر بنائیں۔

ہماری جامعات میں آج اجتماعی اور انسانی علوم کی ناگفتہ بہ حالت افسوس ناک حد تک زوال پذیر ہو چکی ہے۔ آپ سے بڑھ کر کون اس حقیقت کو جانتا ہے کہ قوموں کی تہذیبی زندگی میں ان علوم کا کردار انتہائی بنیادی ہوتا ہے۔ تاریخ ہی کی مثال لیجیے۔ تاریخ قوموں کا حافظہ ہے۔ جو قوم تاریخ کو بھول جاتی ہے، وہ گویا اپنے حافظہ کو کھو بیٹھتی ہے۔ اگر کوئی فرد اپنا حافظہ کھو دے تو اس کا شمار فرزانوں میں نہیں، پاگلوں اور مجنونوں میں ہونے لگتا ہے۔ جو قومیں اپنا ماضی بھلا کر اپنا حافظہ کھو دیتی ہیں، ان کا شمار بھی زندہ اقوام میں نہیں رہتا۔ قرآن مجید نے تاریخ کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے افراد و ملل کے نشیب و فراز اور عروج و زوال کی داستانِ عبرت قرار دیا ہے۔ تاریخ کے اصول سنت اللہ قرار دیے گئے ہیں اور سنت اللہ میں نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے، نہ تغیر۔ ہم نے محض وقتی مادی فوائد کی خاطر تاریخ کی اس اہمیت کو بھلا دیا ہے۔ اول تو بہت سی جامعات میں تاریخ کے شعبے ہی سرے سے موجود نہیں اور جہاں

کسی نہ کسی وجہ سے یہ شعبے قائم ہو گئے ہیں، وہاں وہ انتہائی بے توجہی کا شکار ہیں اور یوں ان کی حالت بڑی پتلی ہے۔

علم تاریخ کی اہمیت ہم مسلمانوں کے لیے یوں بھی اوروں سے بڑھ کر ہے۔ ممکن ہے بعض معاصر اقوام تاریخ سے تغافل اور تجاہل کی متحمل ہو سکیں، ممکن ہے ہماری پڑوسی اقوام اپنی بعض تاریخی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے اپنی حقیقی تاریخ کو نظر انداز کر دینے اور خود بھلا دینے اور دوسروں کو بھلوا دینے پر مجبور ہوں، (اگرچہ وہ ماضی بعید کی فرضی اور اساطیری داستانوں کو تاریخ کے نام سے منوانے اور ماضی قریب کی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوششوں میں دن رات مصروف ہیں) لیکن ہمارے لیے تاریخ سے، تجاہل و تغافل ایک قومی خود کشی کے مترادف ہے۔ ہمارا دستور حیات قرآن مجید بار بار تاریخ پر زور دیتا ہے اور اس سے سبق آموزی کی بار بار تلقین کرتا ہے۔ عصر حاضر کے ایک بالغ نظر مفکر کی رائے میں قرآن مجید نے تاریخ اور اس سے سبق آموزی پر بار بار زور دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق خداوند تعالیٰ تاریخ سے، یعنی زمانے کے تسلسل اور اس کے اندر جو کچھ ہوتا ہے، اس سے اور خصوصاً انسانی تاریخ سے ہرگز غافل نہیں ہے، بل کہ اس پر ہر وقت نگران ہے۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تاریخ صحیح راستے سے بھٹکتی نظر آئے تو اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ اس کے اندر دخل اندازی کر کے کچھ عناصر کو نیچے اور کچھ عناصر کو اوپر کر دیتا ہے۔ قرآن مجید کا یہ ایک بنیادی سبق ہے۔

اس کے علاوہ قرن اولیٰ کے مسلمان خود بھی انسانی تجربات و مشاہدات میں گہری دل چسپی رکھتے تھے اور خیالی دنیا بسانے کی بہ جائے واقعات کو نظر میں رکھنے اور ان پر غور و خوض کرنے کے عادی تھے۔ اس لیے بہ نسبت یونانیوں کے مسلمانوں نے اور علوم کے ساتھ ساتھ علم تاریخ پر بھی پوری توجہ مبذول کی۔ ہندوؤں کا تو ذکر ہی کیا کہ ان کے ہاں تاریخ کا کوئی تصور ہی نہیں۔ دوسری قدیم اقوام میں سے کسی نے بھی تاریخ پر اتنی توجہ نہیں کی، جتنی مسلمانوں نے کی۔ تاریخ کو ایک مربوط اور

منظم علمی شکل میں، اسلامی تعلیم جس کی متقضی تھی، سب سے پہلے ایک مسلمان ابن خلدون ہی نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

یہی حال دوسرے اجتماعی اور انسانی علوم کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض علوم زوال اور انحطاط کی آخری منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ پاکستان کی بیش تر یونی ورسٹیوں میں فلسفے اور نفسیات کے شعبے یا تو سرے سے موجود ہی نہیں یا انتہائی پس ماندگی اور درماندگی کا شکار ہیں۔ اس صورت حال کا لازمی منطقی نتیجہ تہذیبی افلاس اور ثقافتی کمزوری کی شکل میں نکلتا ہے۔

کم و بیش یہی رویہ مشرقی زبانوں، بالخصوص عربی اور فارسی کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ برصغیر کا عام تعلیم یافتہ شخص اپنی مقامی اور مادری زبان (اردو، ہندی، پشتو، سندھی) وغیرہ کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، ترکی اور بہت سی صورتوں میں سنسکرت کا بھی ماہر ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ٹھوس دینی تربیت کے ساتھ ساتھ ان زبانوں سے واقفیت کی وجہ سے اسلام کے دینی ادب اور ثقافتی ورثے سے گہری آگاہی حاصل ہو جاتی تھی اور معاشرے میں وسعت بھی آپ سے آپ پیدا ہو جاتی تھی۔ آج کے سیاق و سباق میں مشرقی زبانوں کی تدریس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یقیناً جو طلبہ سائنسی اور فنی علوم میں تخصص حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو مشرقی زبانوں میں مہارت کی ضرورت نہیں اور ان کو لازمی مضامین کے طور پر یہ زبانیں پڑھانا غیر ضروری ہے، لیکن جو طلبہ آگے چل کر ادبیات، اجتماعی علوم یا انسانیت کے میدانوں میں تخصص کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے مشرقی زبانوں کا حصول ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

زبانوں کے بارے میں گفت گو کی جائے تو ملک میں موجود لسانی مشکلات بھی سامنے آجاتی ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان لسانی اختلافات کو گزشتہ دو سو سال کے اندر جتنی ہوا دی گئی اور جس طرح اس معاملے کو مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا ذریعہ بنایا گیا، وہ ایک افسوس ناک داستان ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے زوال سے لے کر سقوط مشرقی پاکستان تک اور اب متعدد مسلم ممالک میں جنم لینے والے اختلافات

تک لسانی عصبیتوں نے جو تباہی پیدا کی ہے، وہ کسی صاحب بصیرت پر مخفی نہیں، لیکن لسانی عصبیت کوئی مرض نہیں ہے، بل کہ مرض کی علامت اور نتیجہ ہے۔ اگر یہ خود کوئی مرض ہوتا تو اردو اور بنگلہ نزاع حل ہو جانے کے بعد اختلافات کو ختم ہو جانا چاہیے تھا، لیکن اختلافات ختم ہونے کی بہ جائے بڑھتے چلے گئے اور بالآخر شدید قتل و غارت اور تباہی پر منتج ہوئے۔ لسانی عصبیت دراصل علاقائی قومیت کا ایک شاخسانہ ہے۔ علاقائی قومیت اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب کسی علاقائی گروہ کو ناانصافی کا نشانہ بنایا جائے اور اس کو فیصلوں میں شریک نہ کیا جائے۔ ایسی صورت حال میں اسلامی اخوت کم زور پڑتی ہے اور امت واحدہ سے وابستگی کا احساس دھندلا جاتا ہے۔ اس صورت حال کا وہ سب لوگ استحصال کرتے ہیں، جو مسلمانوں میں اسلامی اخوت کی بقا کو اپنے لیے خطرناک سمجھتے ہیں۔ سقوط مشرقی پاکستان اور زوال سلطنت عثمانیہ کے اسباب پر غور کیا جائے تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ لسانی اختلافات خود کوئی مرض نہیں، لیکن دیگر امراض کی علامات میں سے ایک ہیں۔ آج نہ صرف پاکستان میں، بل کہ دیگر مسلم ممالک میں تعلیمی پالیسی کو تشکیل دیتے وقت لسانی اختلاف کے مسئلے کو گہرے غور و فکر کے ساتھ حل کرنا چاہیے۔ آج دنیا کے مختلف مسلم ممالک میں کہیں ازبک اور فارسی، کہیں پشتو اور تاجک، کہیں فارسی اور ازبک، کہیں تاجک اور ازبک، کہیں ترکی اور کرد، کہیں اردو اور سندھی، کہیں اردو اور گجراتی اختلاف سے مسائل پیدا ہونے کا شدید خدشہ موجود ہے۔ اس خدشے کو ایک متوازن اور مبنی بر انصاف حکیمانہ لسانی پالیسی سے دور کیا جاسکتا ہے۔

نظام تعلیم اور بالخصوص دینیات، تاریخ، انسانیات اور دوسرے معاشرتی علوم میں ایک اہم مسئلہ اس آزادیٔ رائے اور حریت فکر کا بھی ہے جس کا چرچا ایک عرصے سے ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ آزادیٔ رائے کہیں بھی لامحدود نہیں ہے۔ مسلمانوں میں فکر کی آزادی کو ہمیشہ احترام کا مستحق سمجھا گیا، لیکن آزادیٔ فکر کے نام پر پورے ملک کو بالعموم اور تعلیمی اداروں کو بالخصوص ہائیڈ پارک نہیں بنایا جاسکتا۔ اس طرح کی مادر پدر آزادی سے

جو فکری افراتفری جنم لیتی ہے، اس کے منفی اثرات پوری قوم کے حال اور مستقبل، دونوں پر پڑتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے مسلمانوں کی متفق علیہ ملی احساسات اور فکری کلیات کے بارے میں آزادیٔ فکر کا دعویٰ ایک لغو اور بے بنیاد دعویٰ ہے، البتہ فروعی معاملات میں اختلاف رائے کی نہ صرف شریعت میں پوری گنجایش ہے، بل کہ مناسب حدود کے اندر حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ فروع میں اختلاف رائے سے فکر میں تنوع اور نظریات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ کلیات میں اختلاف رائے کے بارے میں ہی علامہ اقبال نے کہا تھا:

گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

اکیسویں صدی کے تعلیمی تقاضوں پر گفت گو نامکمل رہے گی، اگر علوم جدیدہ، خاص طور پر جدید مغربی علومِ اجتماعیات اور انسانیات کی اسلامی تشکیل نو کے لیے ضروری اقدامات نہ کیے جائیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے نصاب تعلیم میں ہر اصلاح نامکمل، ناکافی اور بے نتیجہ رہے گی، اگر علوم جدیدہ کی اسلامی تشکیل کے لیے فوری اقدامات نہ کیے جائیں۔ علوم وفنون کو، بالخصوص جدید علوم وفنون کو اسلامی خطوط پر تنقیدی مطالعے کا موضوع بنانے اور ان کی تشکیل نو کرنے کی ضرورت کا سب سے پہلے علامہ اقبال کو احساس ہوا تھا۔ ان کی بہت سی نظموں اور اردو اور انگریزی کی نثری تحریروں کا ایک اہم موضوع مغربی فکر پر تنقید اور فکر ودانش کی اسلامی تشکیل نو ہے۔

گزشتہ چند عشروں کے دوران تعلیم کو اسلامی جہت دینے کی اہمیت اور ضرورت پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب اسلامائزیشن آف نالج خود ایک اہم موضوع بن چکا ہے۔ جن حضرات نے اس باب میں جدید مسلم فکر کو نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے، ان میں علامہ اقبال کے علاوہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر اسماعیل فاروقی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام مرحومین میں اور ڈاکٹر سید حسین نصر اور ڈاکٹر نقیب العطاس کے اسمائے گرامی زندہ

شخصیتوں میں قابل ذکر ہیں۔ یہاں اس پوری تحریک اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تحریروں کا جائزہ لینا تو دشوار ہے، تاہم یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ضرورت کے فکری پس منظر اور تعلیمی اہمیت کے بارے میں مختصر گفت گو کی جائے۔ اس موقع پر میں اپنی ایک سابقہ تحریر کے جو آج سے ۲۵ سال قبل لکھی گئی تھی، بعض اقتباسات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں:

چودھویں صدی ہجری کا نصف آخر جدید دنیائے اسلام کی تاریخ میں اس اعتبار سے ایک نہایت اہم، یادگار اور خوش گوار دور ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی بڑی تعداد نے مغربی استعمار سے سیاسی آزادی حاصل کی۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش اور ماریطانیہ تک بہت سے آزاد مسلم ممالک وجود میں آگئے، لیکن دو ڈھائی سو سال کی سیاسی غلامی اور فوجی و عسکری ماتحتی کے جو گہرے فکری، ذہنی، تمدنی اور تہذیبی نتائج پیدا ہوئے تھے، وہ محض حکم رانوں کی تبدیلی سے دور ہونے والے نہ تھے۔ مسلمان قوم کو مکمل فکری آزادی، ذہنی ہم آہنگی، تمدنی استقلال اور تہذیبی خود مختاری سے ہم دوش کرنے کے لیے ضروری تھا کہ جس طرح سیاسی و عسکری آزادی کے لیے دنیائے اسلام میں بے مثال تحریکیں چلی تھیں اور جن کو کام یاب بنانے کے لیے مسلمانوں کے ہر طبقے نے تن من دھن کی بے بہا قربانیاں دی تھیں، اسی طرح فکری آزادی، تمدنی استقلال، تہذیبی خود مختاری اور تعلیمی اِحیا کی تحریکیں بھی شروع ہوں اور اسی جذبے سے کام لے کر آزادی کی اس تحریک کی تکمیل کی جائے۔

لیکن یہ ایک افسوس ناک امر واقعہ ہے کہ مسلمان اس نئی تکمیلی تحریک کے لیے ذہنی اور فکری طور پر تیار نہ تھے۔ مسلم ممالک میں سے بیش تر کے پاس وہ وسائل موجود نہ تھے جو اس تکمیلی تحریک کو کام یابی یا کم از کم ایک کام یاب آغاز کے لیے ضروری تھے۔ مسلم ممالک کو وہ

رجال کار دست یاب نہ تھے، جن کے ہاتھوں اس کام کی کماحقہ داغ بیل ڈالی جا سکتی۔ مسلم ممالک میں بہت سے لوگوں کو یہ شعور نہ تھا کہ دور استعمار کی سیاسی تحریک آزادی اور دور آزادی کی فکری، تمدنی اور تعلیمی تحریکات کے تقاضے بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان دونوں نوعیت کے کاموں کی جدا جدا حیثیت میں فرق نہ کرنے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی ایسی مخلصانہ کوششیں، جو اس دور جدید کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے شروع کی گئیں، وہ مطلوبہ نتائج نہ دے سکیں اور غیر ضروری اختلافات اور ثانوی مسائل میں الجھ کر رہ گئیں۔ چناں چہ اول تو مسلم ممالک میں آزادی کے بعد احیائے اسلام کی کسی متفق علیہ اور متحدہ کوشش کا آغاز ہی نہ ہو سکا اور اگر کہیں ایسی کوشش ہوئی بھی تو وہ ان ہی مشکلات کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ فکری، تمدنی اور تعلیمی میدانوں میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا جو کام سیاسی آزادی کے فوراً بعد شروع ہو جانا چاہیے تھا، بل کہ جو سیاسی آزادی کا منطقی تقاضا اور اس کی بقا اور تحفظ کی تاریخی طور پر ضمانت تھا، شروع نہ ہو سکا اور ہم وہیں کے وہیں کھڑے رہ گئے، جہاں آزادی سے قبل کھڑے تھے۔

ثقافتی، تہذیبی اور تمدنی نشاۃِ ثانیہ سے بھی اہم تر کام فکری اور تعلیمی نشاۃِ ثانیہ کا تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمان تعلیم یافتہ اصحاب کے فکر و شعور، بل کہ لاشعور اور تحت الشعور میں بھی ایک ایسا فکری انقلاب پیدا کر دیا جاتا کہ ہر شخص ہر چیز کو اسلام ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا، ہر معاملے پر اسلام ہی کے نقطۂ نظر سے غور کرتا، تعلیم، فکر، فلسفہ، آرٹ، تہذیب، تمدن، غرض ہر چیز اسلام کے رنگ میں اسی طرح ڈھل جاتی جیسے صدر اسلام کے مسلم فاتحین نے ہر ملک کے نظام تعلیم، نظام حکومت، معیشت، معاشرت، فکر و فلسفہ، غرض ہر چیز کو اس

قدر گہرے اسلامی رنگ میں رنگ دیا تھا کہ یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ کسی خاص ملک میں کیا چیز عرب سے آئی تھی اور کیا چیز مقامی تھی جو عربی اسلامی رنگ میں رنگ گئی۔ اس ضمن میں جو کام سب سے پہلے کرنے کا ہے، وہ نظام تعلیم کی تشکیل جدید ہے۔ نظام تعلیم کی اسلامی خطوط پر تشکیل نو کر کے ہی ہم اس فکری اور ثقافتی انقلاب کی طرف قدم بڑھا سکیں گے، جو اس وقت پوری دنیائے اسلام کا مقصود ہے۔ اس کام کے لیے ہمیں ایک ایسی ہمہ گیر علمی تحقیق اور فکری تحریک کی ضرورت ہے، جو ہمارے دل و دماغ کو بدل کر رکھ دے۔

یہ علمی تحقیق اور فکری کاوش نہ کوئی وقتی چیز ہے اور نہ محض کچھ سر پھرے لوگوں کی ذہنی تفریح کا مشغلہ ہے۔ یہ تو کسی قوم کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ دنیا میں وہی قومیں آگے بڑھتی ہیں، جو علمی میدان میں دوسروں سے آگے ہوں، جن کو اوروں پر فکری برتری حاصل ہو، جو کائنات کے اس نظام قدرت کو دنیا والوں سے بہتر طور پر سمجھتی ہوں۔ دنیا کی زندہ اقوام میں ایسے لوگوں کی ایک قابل ذکر اور موثر تعداد ہمیشہ موجود رہتی ہے، جو علمی اور فکری اعتبار سے کائنات میں کام کرنے والی قوموں کو سمجھتے ہوں، جن کی انگلیاں ہر وقت تاریخ کی نبض پر رہتی ہوں۔ مشہور انگریز مفکر ہکسلے نے لکھاہے کہ کسی معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے از حد ضروری ہے کہ اس میں سوچنے اور فکر کرنے والوں کی ایک کم از کم تعداد ضرور موجود رہے۔

پھر علمی تحقیق کا یہ کام ان اقوام کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے، جو اپنا مخصوص نظام حیات اور اپنا جداگانہ نظریۂ فکر و عمل رکھتی ہیں۔ ان قوموں کے لیے ضروری ہے کہ تمام علوم کو اس طرح مرتب کریں کہ وہ ان کے مخصوص نظام حیات اور نظریۂ فکر و عمل کا نہ صرف ساتھ دے سکیں، بل کہ اس کی خدمت کریں اور اس کو ترقی دے سکیں،

اس کے قیام میں ممد و معاون ہوں اور اس کی بقا کی ضمانت دے سکیں۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام علوم، چاہے وہ علوم اجتماعی ہوں یا علوم انسانی، علوم طبیعی ہوں یا علوم مابعد الطبعی، وہ سب کے سب کچھ نظریات اور معلومات کے ایک مجموعے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان علوم کے ماہرین ان نظریات و معلومات کو اپنے اپنے خیالات، اپنے اپنے مزاج اور اپنے اپنے اجتماعی ماحول کے مطابق مرتب کر لیتے ہیں اور ان سے وہی نتائج اخذ کرتے ہیں، جو ان کے اندازِ فکر کے مطابق ہوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان ہی علوم عمرانی و طبیعی سے کام لے کر مختلف قوموں نے مختلف تہذیبیں قائم کیں اور مختلف نظام ہائے فکر و عمل مرتب کیے۔
اب جو قوم اس علمی اور فکری معرکے میں دوسروں پر بازی لے جائے گی، دنیا کی سروری کا جھنڈا اسی کے ہاتھ میں ہو گا۔ کائنات کے بارے میں اسی کا پیش کردہ نقطہ دنیا میں مانا جائے گا، لوگ اسی کے مرتب کردہ نظام فکر و عمل کو قبول کریں گے اور اس کے نتیجے میں جو تہذیب و تمدن قائم ہو گا، اسی کی دنیا میں پیروی کی جائے گی۔ دنیا میں جتنے علوم وفنون پیدا ہوں گے، وہ اسی رنگ میں رنگے ہوں گے، ان میں وہی روح رچی بسی ہو گی۔ مثال کے طور پر آج کل کے مغربی علوم وفنون کو لیجیے۔ اس وقت مغربی تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ جو علوم دنیا میں رائج ہیں، وہ تمام تر مغرب کے مخصوص فکری سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ مغرب کا استعماری رنگ ان میں مکمل طور پر رچا بسا ہوا ہے۔ علوم طبیعی اور علوم حسی تو خیر خدا بے زار اور وحی والہام کی راہ نمائی سے برگشتہ ہیں ہی، علوم عمرانی و اجتماعی بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں۔ مغرب کے علوم طبیعی جس مفروضے کی بنیاد پر مرتب ہو رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ علم دراصل وہی ہے جس کو ہم اپنے حواس سے معلوم کر سکیں، ہر وہ چیز جو غیر محسوس ہے، وہ غیر موجود بھی ہے، تاوقتے کہ اس کا موجود ہونا ہمارے

حواس خمسہ میں سے کسی ایک کی گرفت میں آجائے۔ اس مفروضے کو اگر ہم ایک لمحے کے لیے بھی صحیح تسلیم کرلیں تو بتائیے کہ وحی والہام سے لے کر توحید و معاد تک کون سا عقیدہ ہے، جس پر ضرب نہیں پڑتی؟

یہی حال آج کل کے علوم اجتماعی کا بھی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی ایک مخصوص روح اور مخصوص مزاج رکھتا ہے۔ اس روح اور اس مزاج کی تشکیل میں بہت سے عوامل نے حصہ لیا ہے۔ تاریخی روایات، مخصوص مذہبی پس منظر، تہذیبی اقدار، ثقافتی ماحول، یہ سب مل کر علوم وفنون کی تشکیل پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ مختلف زبانوں اور ان کی ادبیات کی کیفیت بھی دوسرے علوم سے مختلف نہیں ہوتی۔ جس طرح کسی قوم کے خیالات، اس کے مذہب، اس کی تہذیب اور اس کی ثقافت کا اس کے اجتماعی علوم میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح یہ سب چیزیں اس کی زبان و ادبیات میں بھی رچی بسی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی زبان کو لیجیے۔ اس زبان کے الفاظ، جملے، تراکیب، محاورے اور استعارات ہر چیز میں انگریز قوم کا اپنا مزاج جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ مادہ پرستی اور ڈپلومیسی جس طرح انگریز قوم کا خاصہ ہے، اسی طرح انگریزی زبان بھی ان خصائص سے معرا نہیں۔ مشرقی زبانوں میں ہندی اور سنسکرت کی مثال لے لیجیے۔ ان دونوں زبانوں میں ہندوؤں کے اساطیری خیالات اور ہندو علم الاصنام اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے، ان زبانوں کی پرورش ہی ہندو اساطیر کی غذا سے ہوئی ہے۔

لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کے پیدا کردہ علوم کو دیکھیے۔ ان سب میں اسلامی تہذیب و تمدن کا اپنا مزاج نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اجتماعی اور فکری علوم کی تو خیر بنیاد ہی قرآن وسنت کی تعلیمات پر رکھی گئی،

خالص دنیوی اور تجرباتی علوم میں بھی اسلام کی روح موقع بہ موقع جلوہ گر رہتی ہے۔ مسلمانوں کی مرتب کردہ کوئی بھی سائنس کی کتاب لے لیجیے۔ وہ خطبہ مسنونہ اور درود و سلام کے بعد اللہ کی ان صفات کے ذکر سے شروع ہو گی، جن میں اس کی قدرت، شانِ ربوبیت، رزاقیت اور اسی طرح کی متعلقہ صفات بیان کی گئی ہوں۔ پھر قرآن مجید کی وہ آیات ہوں گی، جہاں مختلف مظاہر قدرت پر غور کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر ہر مرحلے پر اسلامیت کی یہ روح قاری کی راہ نمائی کرتی نظر آئے گی۔

آج اگر مسلمان مغرب کی تہذیبی اور سیاسی برتری سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے جو کام بنیادی اہمیت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ بیسویں صدی کے ماحول میں اسلامی تہذیب و تمدن کا احیا کریں۔ اپنے تمام علوم و فنون، اپنے ادبیات، اپنے آرٹس اور سب چیزوں کی اسلامی بنیادوں پر تشکیل جدید کریں اور سب سے پہلے اس اصول کا انکار کریں کہ جو مغرب سے جتنا قریب ہے، اتنا ہی کامل ہے اور جتنا دور ہے، اتنا ہی ناقص ہے، یا علامہ اقبال کے الفاظ میں کافر افرنگ اور مومن خود ہوں۔ مغرب کے علمی، فکری اور تہذیبی استیلا سے اسلامی فکر و دانش کے جو چشمے خشک ہو گئے ہیں، ان کو از سر نو جاری کیا جائے، اسلامی علوم و فنون کو دوبارہ متحرک اور فعال بنایا جائے۔

اس کام کی اہمیت نہ فرضی ہے، نہ محض وہمی۔ اس وقت یہی عالم سلام کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ جدید علوم و فنون اور جدید تہذیب کے بارے میں کوئی واضح، متفق علیہ اور اسلامی تعلیمات کے مطابق نقطۂ نظر قائم کیا جانا اس وقت اولین اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کام ایک وسیع اور ہمہ گیر علمی اور فکری تحریک کا متقاضی ہے اور اسلامی تحقیق اسی علمی و فکری تحریک کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

اسلامی تحقیق کے کام کو تین بڑے بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ پہلی تحقیق وہ ہے جس کو ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم نے میکانکی اسلامی تحقیق کا نام دیا ہے، یعنی وہ کام جو مقصود بالذات نہ ہو، لیکن تحقیق و تفکیر میں مدد دے سکے۔ مثلاً قوامیس کی ترتیب، فہرستوں کی تیاری، قدیم مخطوطات کی نشرواشاعت وغیرہ۔

۲۔ تحقیق کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم تطہیر فکر کا نام دے سکتے ہیں۔ رائج الوقت علوم وفنون کا اسلامی نقطۂ نظر سے تنقیدی جائزہ لے کر کھرا اور کھوٹا الگ کر دینا اس میں شامل ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے مغرب کی فکری امامت کے وہم و طلسم کو پاش پاش کر دیں، انہوں نے جو نظام فکر و عمل مرتب کیا ہے، اس کا باطل اور بر سر غلط ہونا دلائل و براہین سے ثابت کر دیں۔ یہ کام عالم اسلام کی فکری آزادی اور ثقافتی بقا کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔ عالم اسلام کو سیاسی آزادی حاصل کیے چوتھائی صدی (اب نصف صدی سے زائد) کے قریب گزر چکا، لیکن فکری طور پر مسلمان آج پہلے سے زیادہ غلام ہیں۔ اس وقت مغرب اور معصومیت ہمارے نزدیک دو مترادف الفاظ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک آج کسی چیز یا نظریے کی مغرب سے نسبت اس کے مبنی بر حق اور مبنی بر انصاف ہونے کا کافی معیار ہے، کسی چیز کی صداقت اور حقانیت کو پرکھنے اور جانچنے کے لیے آج اس کا مغرب کے رائج الوقت تصورات کے مطابق ہونا کافی سمجھا جاتا ہے۔

اس انداز فکر کو تبدیل کرنا اور مغرب کی عصمت سے انکار کرنا ہی اس راہ میں پہلا قدم ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں ہمیں تمام مغربی علوم وفنون، بل کہ مغربی تہذیب و تمدن کے تمام عناصر کو خام مال Raw Material سمجھنا چاہیے اور اس معاملے میں ان کے ساتھ وہی

سلوک کرنا چاہیے جو ہر خام مال کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نہ تو ہم اس سارے مواد کو جوں کا توں اپنے کام میں لا سکتے ہیں اور نہ محض ناکارہ قرار دے کر پھینک سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی اقدار کی روشنی میں ان سب کو باریک بینی اور دقت نظر سے پرکھنا چاہیے۔ جو چیزیں حقائق ثابتہ کا درجہ رکھتی ہوں، ان کو ہم قبول کر لیں۔ جو چیزیں حقائق ثابتہ نہ ہوں اور ہماری اقدار سے متعارض ہوں، ان کو ہم رد کر دیں اور باقی ماندہ کی اصلاح کر کے ان سارے علوم کو اپنے مقاصد کے لیے تیار کریں۔

اس ضمن میں پہلے جن علوم و نظاماتِ فکری کی تطہیر کرنی ضروری ہے، ان میں فلسفہ اور اس کی ساری شاخیں، علم سیاسیات، قانون و دستور، نفسیات، معاشیات، عمرانیات، انسانیت وغیرہ شامل ہیں۔ اس معاملے میں ہم کو بلا جھجک سابقہ کمیونسٹ ممالک کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انہوں نے گزشتہ نصف صدی میں سارے علوم وفنون کی تدوین جدید کر کے ان کو مکمل طور پر کمیونسٹ فلسفے اور پرولتاری نظام فکر سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔ کمیونسٹ انقلاب سے قبل کے سارے علوم کو انہوں نے بوژروا قرار دے کر مسترد کر دیا اور اپنے مقاصد کے لیے ناکام ٹھہرایا۔ حتیٰ کہ انہوں نے سائنس جیسے خالص مادی علم کی دو قسمیں قرار دیں۔ ایک بوژروا سائنس قرار پائی، ایک کمیونسٹ سائنس۔ انہوں نے دنیا بھر کی تاریخ تک بدل ڈالی۔ کمیونسٹ علمائے تاریخ نے دنیا بھر کی تاریخ کی مادی تعبیر کر کے اس کو از سر نو مرتب کر کے رکھ دیا۔ اس طرح کمیونسٹ اصولوں پر معاشیات، سیاسیات، قانون، فلسفہ، غرض یہ کہ ہر علم وفن کی ترتیب نو کر دی۔ پھر آخر ہم مسلمانوں کو یہ کام کرنے سے کیا چیز مانع ہے؟ کمیونسٹوں کے مقابلے میں تو ہم کہیں کم مدت میں اور نہایت بہتر عقلی اور علمی انداز میں یہ کام کر سکتے ہیں۔ ہمارا کام کمیونسٹوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ دیرپا اور

قابل قبول ثابت ہو گا۔

مزید برآں علوم وفنون کی یہ تطہیر ایک مسلسل عمل ہے، جو کبھی بھی ختم نہ ہو گا۔ اس لیے کہ علم ایک مسلسل ترقی پذیر چیز ہے۔ جوں جوں کائنات اور اس کے مختلف شعبے اپنے آپ کو انسانی عقل و فکر کے سامنے کھولتے جائیں گے، علوم کی ترقی ہوتی رہے گی۔ اگر علوم وفنون کی اس پیہم ترقی اور ہر دم تغیر کے ہر مرحلے میں ان کا از سر نو جائزہ نہ لیا گیا اور ان کی مرحلہ وار جانچ پڑتال نہ کی گئی تو جلد ہی ہماری تہذیبی اقدار اور معاشرتی علوم میں خلا اور تباین پیدا ہو جائے گا اور ایک زبردست فکری اختلال معاشرے میں جنم لے گا۔ علوم وفنون کی اسی تطہیر و تنقیحِ مسلسل کی ضرورت کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانی فکر کے ارتقا پر نہایت محتاط انداز میں نظر رکھیں اور اس کے بارے میں ایک آزادانہ اور تنقیدی نقطۂ نظر کو بھی قائم رکھیں۔

۳۔ تطہیر فکر کے بعد اسلامی تحقیق کا تیسرا سب سے بڑا کام تعمیر فکر کا ہے، یعنی اسلامی نقطۂ نظر سے تمام علوم وفنون کی ترتیب نو اور تشکیل جدید۔ اس میں جدید علوم کی تشکیل جدید بھی شامل ہے اور قدیم اسلامی علوم کی تعمیر نو بھی۔ قرآن و سنت کے غیر متغیر اور ناقابل تبدل اصولوں کی روشنی میں علوم کو اس طرح مرتب کرنا کہ وہ عصر حاضر میں ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو سکیں اور ایک ایسے نظام فکر و عمل اور تہذیب و تمدن کی تعمیر میں مدد دے سکیں، جو عصر حاضر میں دنیا کے سامنے اللہ کے دین کی گواہی دے سکے:

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ (۱۲)

تا کہ اللہ کی حجت دنیا والوں پر تمام ہو سکے اور کوئی شخص اللہ کے خلاف

۱۲۔ النساء: ۱۶۵

کوئی حجت پیش نہ کر سکے۔

علوم کی تشکیل جدید کے اس کام کی ضرورت واہمیت کو برصغیر میں سب سے پہلے شاید علامہ اقبال نے محسوس کیا تھا۔ فلسفے اور مابعد الطبعیات کے میدان میں علامہ مرحوم کی تطہیری اور تعمیری مساعی اسلامی فکر کی تاریخ کا نمایاں باب ہیں۔ علامہ کے بعد یہ میدان تقریباً خالی ہی نظر آتا ہے۔ بعض افراد نے مختلف علوم میں بلاشبہ کچھ قابل ذکر کام کیا، لیکن یہ کام ایک دو اشخاص کے کرنے کا نہیں۔ اس کے لیے ایک ہمہ گیر اور بھرپور تحریک کی ضرورت ہے۔ ایک ہمہ گیر اور بھرپور مہم کے طور پر علوم کی تشکیل جدید کا یہ کام کام یابی کے ساتھ جب ہی ہو سکتا ہے، جب ہمارا تعلیمی نصب العین متعین ہو اور ہم پوری سنجیدگی کے ساتھ فی الواقع ایسے ارباب فکر و دانش کی ایک جماعت پیدا کرنا چاہتے ہوں، جو قرآن مجید کی روشنی میں سارے رائج الوقت علوم و معارف کا جائزہ لیں اور کھرا کھوٹا الگ کر دکھائیں۔ ابھی تک تو ہمارے ہاں کوئی ایسا مربوط نظام تعلیم بھی نہیں ابھر سکا، جو سارے اسلامی، عمرانی اور طبیعی علوم کا جامع ہو اور اس کے ہر ہر جز میں خدا پرستی اور اسلامیت کی قرآنی روح جاری وساری ہو۔ ابھی تک جو ایک دو کوششیں ہوئی ہیں، وہ غیر مربوط پیوند کاری کے مترادف ہیں۔

علوم کی تنقید و تنقیح کے اس عظیم الشان کام کے لیے اب تاریخ ہم کو شاید مزید مہلت نہ دے۔ اگر مستقبل قریب میں بھی ہم کچھ کر لینے میں کام یاب ہو گئے تو خیر، ورنہ اسلامی اقدار اور اسلامی تہذیب کا احیا ایک خواب وخیال ہو کر رہ جائے گا، بل کہ تغیر پیہم کی اس دنیا میں ہمارے لیے اپنا ملی وجود باقی رکھنا بھی ممکن نہ رہے گا۔ علامہ اقبال نے آج سے پچاس (اب پچھتر) سال قبل جو بات اسلامی اصول فقہ کے بارے میں کہی تھی، وہ آج سارے علوم وفنون پر صادق آرہی ہے۔ اس

وقت اس کی جتنی اہمیت تھی، آج اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ علامہ نے فرمایا تھا:

> میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص زمانۂ حال کے جورس پروڈنس (اصول قانون) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ قریباً تمام ممالک اسلامیہ میں مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور کر رہے ہیں۔ غرض یہ وقت عملی کام کا ہے، کیوں کہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔
>
> لیکن علوم و فنون کی تدوین نو کے اس عمل کے انتظار میں ہم دوسرے شعبوں میں اسلامی نقطۂ نظر سے اصلاحات کے کام کو نہ تو ملتوی کر سکتے ہیں اور نہ موخر کر سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ دونوں کام ایک ساتھ ہی ہونے چاہییں، بل کہ اگر یہ دونوں کام ایک ساتھ شروع کیے جائیں تو دونوں ایک دوسرے کے مدد و معاون اور تکمیل کنندہ ثابت ہوں گے اور ایک کی راہ میں حائل دشواریوں کو دور کرنے کی ہر کوشش دوسرے کی راہ میں حائل دشواریوں کو ختم کرنے میں بھی مدد دے گی۔ (۱۳)

پچیس سال قبل جب یہ تحریر لکھی گئی تھی، اس وقت اسلامائزیشن آف نالج کا یہ عمل اپنے ابتدائی مراحل میں تھا۔ گزشتہ ربع صدی کے دوران ڈاکٹر اسماعیل فاروقی شہید، ڈاکٹر سید حسین نصر اور ڈاکٹر نقیب العطاس کی انتہائی فاضلانہ تحریروں نے اس میدان میں غیر معمولی پیش رفت کی ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ڈاکٹر اسماعیل فاروقی کی علمی سرپرستی اور فکری راہ نمائی میں ایک باقاعدہ ادارہ اس کام کے لیے وجود میں

۱۳۔ ماہ نامہ فکر و نظر، اسلام آباد۔ مئی ۱۹۷۶ء

آیا۔ ڈاکٹر اسماعیل فاروقی اور ان کے ساتھیوں اور دیگر معاصرین نے مغربی علوم وفنون کی اسلامی تشکیل اور اسلامی علوم وفنون کی تدوین نو کے لیے تفصیلی نقشہ ہائے کار مرتب کیے۔ ان حضرات نے مختلف میدانوں میں انتہائی قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں اور اسلامائزیشن آف نالج، یعنی علوم وفنون کو اسلامی نہج پر ازسرنو مرتب کرنے کے عمل کو موثر انداز میں آگے بڑھایا ہے۔ ان سب حضرات نے جو کاوشیں کی ہیں اور ان موضوعات پر جو خامہ فرسائی کی ہے، اس کی روشنی میں اس عمل کے نمایاں مدارج ومراحل درج ذیل ہونے چاہییں :

۱۔ جدید علوم پر کامل دست رس وہ پہلا مرحلہ ہے جو اسلامائزیشن کے اس طویل عمل کو مکمل کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ جب تک ہمارے ماہرین اپنے اپنے میدان ہائے اختصاص میں ایسی مہارتیں حاصل نہیں کریں گے کہ اہل مغرب ان کی ان مہارتوں کو بلاچوں وچرا تسلیم کرلیں، اس وقت تک متعلقہ علوم وفنون پر ان کی تنقید کو علمی دنیا میں وہ پزیرائی حاصل نہ ہوسکے گی جو اس کام کے لیے ناگزیر ہے۔ امام غزالی، امام رازی اور علامہ ابن تیمیہ کی فکریونان کے بارے میں تنقیدی تحریروں کو وقعت اس لیے حاصل ہوئی کہ ان میدانوں میں ان کی مہارت مسلم تھی۔ آج اگر مسلم اہل علم مغربی معاشیات، سیاسیات اور قانون وغیرہ پر تنقید کرتے ہیں اور ان کی تنقید غیر موثر معلوم ہوتی ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان علوم وفنون میں ان کی مہارت ابھی تک اہل مغرب نے تسلیم نہیں کی۔ آج بھی جن مسلم ماہرین کی مہارت مغربی علوم وفنون میں مسلم ہے، ان کے تنقیدی خیالات نہ صرف سنے جاتے ہیں، بل کہ وہ اہل مغرب اور اہل مغرب سے متاثر اہل مشرق کے ذہن کو بھی متاثر کرتے ہیں۔

۲۔ مغربی علوم وفنون پر اس کامل دست رس کے بعد دوسرا مرحلہ ان علوم وفنون کے تجزیاتی مطالعے کا ہے۔ تجزیاتی مطالعے سے مراد یہ ہے کہ متعلقہ علم وفن کے اساسی مباحث اور موضوعات کا بہ غور جائزہ لے کر یہ طے کیا جائے کہ اس فن یا علم کے بنیادی تصورات اور اصول موضوعہ کیا ہیں اور کن مباحث کو اساسی حیثیت

حاصل ہے اور کون سے مباحث فروعی حیثیت رکھتے ہیں؟

۳۔ اس جائزاتی عمل کے بعد تیسرا بڑا مرحلہ اس پورے مواد کے تنقیدی محاسبے کا ہے۔ تنقیدی محاسبے سے مراد یہ ہے کہ ہم خالص فنی اور عقلی بنیادوں پر اس بات کا جائزہ لیں کہ اس فن کے بنیادی اصولوں اور قواعد وضوابط میں کون سی چیزیں عقلاً قابل قبول ہیں اور ہمارے فکری، نظریاتی اور اخلاقی معیار پر پوری اترتی ہیں اور وہ کون سے پہلو ہیں جو عقل کی میزان میں کم زور اور اسلامی نقطۂ نظر سے نا قابل قبول ہیں، یہ عمل کم وبیش اسی انداز کا ہوگا، جس انداز کا کام امام غزالی کی کتابوں مقاصد الفلاسفہ اور تہافت الفلاسفہ میں نظر آتا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جو کام امام غزالی نے فلسفۂ یونان کو سامنے رکھ کر کیا تھا، وہی کام آج کے علوم وفنون، بالخصوص عمرانی اور انسانی علوم کے باب میں کیا جانا ناگزیر ہے۔ آج بہت سی مقاصدیں (مقاصد الاقتصادیین، مقاصد السیاسیین، مقاصد القانونیین وغیرہ) اور شاید اس سے زیادہ تہافتیں (تہافت الاقتصاد، تہافت القانون، تہافت الفنون وغیرہ) لکھنے کی ضرورت ہے۔

۴۔ چوتھا بڑا قدم علوم وفنون کے اس عظیم الشان اور بے مثال ورثے پر ماہرانہ دست رس حاصل کرنا ہے جو مسلم مفکرین اور دانش وروں نے گزشتہ چودہ سو سال اور بالخصوص دوسری صدی ہجری سے لے کر گیارہویں صدی ہجری تک پیدا کیا۔ یہ علمی ورثہ جو عقلیات اور نقلیات اور علوم مقصودہ اور علوم آلیہ وغیرہ کے عنوان سے مختلف علوم وفنون میں تقسیم ہے، جن کی تعداد بعض مسلم محققین کے نزدیک ساڑھے چار سو سے زائد ہے، انسانی زندگی اور تہذیب وتمدن کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ علوم وفنون کا یہ سارا ذخیرہ خالص اسلامی بنیادوں اور قرآنی نظریہ علم پر مبنی ہے۔ اس ورثے پر کامل دست رس اور ماہرانہ عبور حاصل کیے بغیر اسلامی نظریۂ علم اور روایت تعلیم کی روح سے آگاہی دشوار ہے۔

۵۔ اسلامی ورثے پر کامل دست رس اور ماہرانہ عبور کے بعد اگلا مرحلہ اس کے ازسرنو تجزیاتی مطالعے کا ہے۔ اس ورثے میں جو چیزیں علوم آلیہ کے دائرے میں

آتی ہیں، ان میں سے بیش تر کو از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح عقلیات کے دائرے میں آنے والے علوم وفنون کا تنقیدی مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ اسلامی ورثے کی اساس، یعنی قرآن مجید اور سنت نبوی وہ دائمی اور حقیقی مصدر علم ہیں جن کی بنیاد پر علوم وفنون کی یہ ساری عمارت کھڑی ہے۔ علم فقہ، عقائد، تصوف اور عربی زبان وادب کو اس عمارت کے ستونوں کی حیثیت حاصل ہے۔ ان سب ستونوں کو اپنی جگہ قائم رکھتے ہوئے عمارت کے بقیہ حصوں میں رد وبدل، اصلاح وترمیم اور ترتیب وتنظیم نو کے عمل کی خاصی ضرورت ہے اور یہ کام ایک گہرے تجزیاتی مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔

۶۔ چھٹا مرحلہ مسلمانوں کی فکری تاریخ اور علمی کیریئر میں ایسے پہلوؤں کی نشان دہی کرنا ہے، جو مختلف اسباب کی بنا پر آج کے تقاضوں کا سامنا کرنے سے قاصر ہے۔ اس غرض کے لیے ان پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے قدیم مفکرین نے فلاسفۂ یونان کے زیر اثر منطق کے جس اسلوب کو زیادہ فروغ دیا، وہ منطق کا استخراجی اسلوب تھا۔ منطق کی بیش تر کتابیں جو فارابی اور ابن سینا جیسے عباقرہ کے زیر اثر لکھی گئیں، وہ سب کی سب منطق استخراجی کے اصول پر مرتب ہوئیں۔ متکلمین اسلام اور علمائے اصول، مثلاً امام غزالی، امام رازی کی خالص دینی تحریروں (مثلاً المستصفی اور المحصول) میں منطق استخراجی کے اصول وقواعد سے ہی کام لیا گیا ہے۔ آج منطق استقرائی کی اہمیت زیادہ ہو گئی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی ورثے کی ان تمام چیزوں کا از سر نو جائزہ لیا جائے جہاں بنیاد استدلال منطق استخراجی کے قواعد تھے اور کوشش کی جائے کہ ان دینی حقائق کو جو اس وقت ائمہ اسلام نے منطق استخراجی کی بنیاد پر ثابت کیے تھے، آج انہیں منطق استقرائی کی بنا پر ثابت کیا جائے۔

۷۔ ان دونوں امور کے بعد، یعنی علوم جدید کی تنقید وتحقیق اور اسلامی ورثے کے تجزیے وتنقید کے بعد اگلا مرحلہ اسلامی ورثے کے مختلف پہلوؤں اور جدید علوم وفنون کی مختلف شاخوں کے مابین تعلق کی تعیین وتجدید ہے۔ یہ کام اس لیے ضروری

ہے کہ قدیم و جدید علوم کے مابین ہم آہنگی اور امتزاج پیدا کرنے کی حدود و شرائط کا پہلے سے تعین کر لیا جائے اور دونوں کے درمیان ایسا امتزاج پیدا کیا جائے جو توازن، جامعیت اور اعتدال کے اوصاف سے متصف ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ قدیم علمائے اسلام نے علوم و فنون کی جو تقسیم کی تھی، اس کا بھی از سر نو جائزہ لیا جائے۔

فارابی کے ''احصاء العلوم'' سے لے کر متاخرین کی تحریروں (مثلاً قاضی عبد النبی ابن عبدالرسول احمد نگری کی ''دستور العلماء'' اور علامہ محمد اعلیٰ تھانوی کی ''کشاف اصطلاحات الفنون'') تک علوم و فنون کی تقسیم کا ایک خاص انداز چلا آ رہا ہے۔ اب اس پر نئے علمی حقائق اور رجحانات کے سیاق و سباق میں دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس کو باقی رکھنا ہے تو جدید مغربی علوم کے قابل قبول اجزا کو اس قدیم تقسیم میں سمونا پڑے گا، تاکہ اسلامی علوم و فنون کی روایتی ساخت اور قدیم تشکیل کو برقرار رکھتے ہوئے نئے علوم و فنون اور علمی و فکری تجربات کو اس کا حصہ بنایا جاسکے، لیکن اگر اس قدیم تقسیم پر نظر ثانی کرنا ہو اور نئے علوم و فنون کی رعایت سے کسی نئی تقسیم کی ضرورت محسوس ہو تو پھر مختلف میدانوں میں نئے تخصصات کے حوالے سے قدیم و جدید کی اس ہم آہنگی کے عمل کی ضرورت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔

۸۔ ہم آہنگی، تشکیل نو اور ترتیب نو کے بعد آٹھواں مرحلہ مستقبل کی سمت میں نئے سفر کے آغاز کا ہے۔ اس مرحلے میں امت کو درپیش اہم مسائل کا جائزہ اور ان کا ایک ایسا قابل عمل حل پیش کرنے کی ضرورت ہے، جو دورِ جدید کی تمام مشکلات اور مسائل کو حل کر سکے۔ اس وقت امت کو جو بڑے بڑے فکری چیلنج درپیش ہیں، وہ ایک غیر معمولی بصیرت، طویل غور و خوض اور اجتماعی مشاورت کے متقاضی ہیں۔ جب تک ایسے مسائل، بل کہ چیلنجوں کا احاطہ نہ کر لیا جائے، اس وقت تک اسلامی علوم و فنون کی واقعی اور حقیقی تدوین نو کا عمل تشنۂ تکمیل رہے گا۔

۹۔ اگر اسلام پوری انسانیت کا دین ہے، اگر اسلامی تہذیب واقعتاً ایک عالمی

تہذیب ہے، اگر اسلام کے پاس انسان کے ہر دکھ کا علاج موجود ہے تو پھر مسلمانوں کا یہ دینی اور ملی فریضہ ہے کہ جہاں وہ امت کو درپیش بڑے بڑے مسائل کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں، وہاں امت کے دائرے سے باہر بسنے والے انسانوں کے مسائل کو نظرانداز نہ کریں۔ انسانیت کے مسائل کا جائزہ ایک ہمدرد اور انسان دوست روحانی معالج اور معاشرتی طبیب کی حیثیت سے لینا اور ان کا حل تجویز کرنا انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت کا ایک اہم پہلو ہے۔ دنیا کو اسلام کے نقطۂ نظر سے باخبر اور بالآخر اس کا ہم خیال اور گرویدہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انسانیت کے مسائل مفکرین اسلام کی اولین ترجیحات میں شامل ہوں۔

۱۰۔ دسواں مرحلہ اب تک کیے جانے والے فکری اور تحقیقی کام کو اس طرح مرتب کرنا ہے کہ مشرق و مغرب میں ہونے والی فکری تخلیقات ایک دوسرے سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو جائیں اور ایک ایسا امتزاج وجود میں آجائے جو اسی طرح توحید کی اساس پر قائم ہو، جس طرح صدر اسلام میں ائمہ اسلام کی تحقیقات و تخلیقات ہوا کرتی تھیں۔

۱۱۔ ان سب مراحل کے بعد آخری اور تکمیلی مرحلہ اسلامی علوم و فنون کی اس نئی تحسین و تکمیل کا ہوگا، جو دراصل اسلام کے تہذیبی احیا کا مقدمۃ الجیش بھی ہوگی اور اس کی غماز بھی۔ اسلامی خطوط پر علوم و فنون کی حتمی تشکیل نو کا یہ عمل ایک دیرپا عمل ہوگا، جو شاید صدیوں میں مکمل ہو، لیکن جس کے اثرات کئی ہزاریوں تک پھیل سکتے ہیں۔

اسلامی علوم و فنون کی تدوین نو کا یہ کام ایک ہمہ پہلو تعلیمی اور فکری جدوجہد کا تقاضا کرتا ہے۔ اس جدوجہد میں بعض نئے مسائل پر اجتہادی نقطۂ نظر سے غور و خوض بھی شامل ہے اور بعض اجتہادی آرا پر از سر نو ناقدانہ نظر ثانی بھی ناگزیر ہے۔ دور جدید نے بعض ایسے مسائل و معاملات ہمارے سامنے پیش کر دیے ہیں جو سلف کے سامنے نہیں تھے، اس لیے ماضی میں مجتہدین امت اور مفکرین اسلام کو ان پر کوئی رائے قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مثال کے طور پر ایک کثیر

العناصر (Pluralistic) معاشرے میں اسلام کا کردار کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو بیسویں صدی کے اواخر میں سامنے آیا، بالخصوص مجاہدین افغانستان کے ہاتھوں سوویت یونین کی تباہی اور بالآخر کمیونزم کے زوال کے نتیجے میں جو یک قطبی دنیا سامنے آئی تو اس مسئلے کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ اب ایک طرف تو مغرب کے بالادست فاتحین کی کوشش یہ ہے کہ تاریخ کے خاتمے کے اعلانات اور تہذیبوں کے تصادم کے پردوں میں ایک یک عنصری نظام دنیا پر مسلط کردیں اور دوسری طرف کثیر العناصر نظاموں کی تلاش کے نام پر دوسروں کے معاملات میں مداخلت کا جواز پیدا کریں۔ ان حالات میں مسلمانوں کی یہ ذمے داری ہے کہ قرآن وسنت کی نصوص اور فقہائے اسلام کی تصریحات کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کا تعین کریں کہ ایک مسلم معاشرے میں دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں کی بقا کیوں کر اور کن حدود کے اندر رہ کر ہو سکتی ہے اور ایک غیر مسلم معاشرے میں اسلامی ثقافت اور اسلامی تمدن کا تحفظ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

آج دنیا کا کوئی بڑا شہر ایسا نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ نہ ہو رہا ہو، جہاں آئے دن مسلم تنظیمیں قائم نہ ہو رہی ہوں، جہاں مسجدیں اور اسلامی مراکز پھل پھول نہ رہے ہوں، جہاں قدیم اور جدید مسلمانوں کے مابین تفاعل نہ ہو رہا ہو، ان شہروں میں تیزی سے پھیلنے والی مسلم آبادیاں جہاں اپنے آپ کو سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی طور پر منظم نہ کر رہی ہوں۔ مشرق و مغرب کے غیر مسلم ممالک میں بسنے والے یہ لاکھوں بل کہ کروڑوں مسلم نوجوان اپنے تشخص کا تحفظ اور اپنی شخصیت کا اظہار چاہتے ہیں۔ ان حالات میں ان کو آئے دن نت نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ شریعت اسلامی کی رو سے ان مسائل کا حل کیا ہے، ان سب سوالات کا شافی جواب آج اہل علم کے ذمے ایک قرض اور فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماضی میں یہ صورت حال اتنی شدید اور وسیع نہیں تھی، جتنی آج ہو چکی ہے۔ اس کی شدت اور وسعت میں روز بہ روز تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، ہر آنے والا دن ایک نیا مسئلہ لے کر طلوع ہوتا ہے۔

ہماری قدیم فقہی کتابیں اسلام کے دور عروج میں مرتب ہوئیں۔ مجتہدین اسلام نے اسلامی ریاست، اسلامی تہذیب، اسلامی ثقافت، اسلامی معاشرے اور اسلامی زندگی کے ایسے مسائل تو نہایت باریک بینی اور دقت نظر سے مرتب کر دیے، جو مسلمانوں کو اپنے دور عروج میں پیش آئے یا جن سے مسلمانوں کو مسلم ماحول میں واسطہ پڑتا ہے۔ رہے وہ مسائل جو ایک مسلم اقلیت کو پیش آتے تھے یا غلامی کی زندگی گزارنے والے مسلمانوں کو پیش آسکتے تھے، ان سے فقہائے اسلام کو زیادہ اعتنا کرنے کا موقع نہ ملا اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی وجہ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب مسلمانوں کو سیاسی زوال کا سامنا کرنا پڑا تو یہ وہ زمانہ تھا، جب فقہ اسلامی بھی ایک طرح کے تعطل کا شکار تھی اور دور انحطاط سے گزر رہی تھی۔ اجتہاد کا سلسلہ تقریباً بند ہو چکا تھا اور علمائے اسلام بالعموم دور انحطاط میں لکھی ہوئی فقہی کتابیں اور متون کی شرحوں اور حاشیوں کے پڑھنے پڑھانے میں مصروف تھے۔ ان حالات میں مغربی ممالک میں جا کر بسنے والے مسلمانوں کی راہ نمائی کا خاص سامان فراہم نہ ہوا اور یہ لوگ مختلف مغربی معاشروں میں جا جا کر گم ہوتے رہے۔ آج نئی تحقیقات اور تاریخی اکتشافات سے ان لاتعداد مسلم آبادیوں کا پتا چل رہا ہے جو امریکا، آسٹریلیا، برازیل اور ارجنٹینا جیسے بڑے ممالک کے سمندروں میں گم ہو گئیں۔ اگر اٹھارویں صدی کے اوائل ہی سے کسی فقہ الاقلیات پر غور و خوض کی داغ بیل ڈال دی جاتی اور ایسے غیر موافقانہ ماحول میں مسلم وجود کے احکام پہلے سے مرتب شدہ موجود ہوتے تو شاید یہ مسلمان آبادیاں یوں آسانی اور تیزی سے گم نہ ہوتیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ آج فقہائے اسلام اور علمائے امت کی یہ اولین ذمے داری ہے کہ ان بدلتے ہوئے حالات میں پیش آنے والے سوالات اور نت نئی مشکلات کا ایسا قابل عمل حل پیش کریں، جو غیر مسلم ماحول میں مسلم وجود کے تحفظ اور بقا کا ضامن ہو۔

اس معاملے کا ایک اور اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آج کے حالات کی مناسبت سے مسلم معاشرے اور مسلم ریاست کی تجدید نو کی جائے اور جدید معروضی حقائق اور

فکری مباحث کے پس منظر میں واضح کیا جائے کہ اسلامی معاشرے کی تعریف کیا ہے اور اسلامی ریاست آج کے سیاق وسباق میں کس ریاست کو کہا جائے گا۔اس بات کی ضرورت اس لیے پیش آرہی ہے کہ فقہائے اسلام نے آج سے کم وبیش ایک ہزار دو سو سال قبل دار الاسلام، دار الحرب اور دار الصلح وغیرہ کی جو حد بندیاں تجویز کی تھیں، وہ آج کے زمینی حقائق کی روشنی میں اجنبی معلوم ہوتی ہیں۔ خود فقہائے اسلام کو ابتدائی دو تین صدیوں میں ہی ان تقسیمات پر کئی بار از سرِ نو غور وخوض کرنا پڑا۔ دوسری صدی ہجری کے نصف اول کے زمینی حقائق کی روشنی میں امام ابو حنیفہؒ (متوفی ۱۵۰ھ) کے فہم اسلام کی رو سے روئے زمین کو صرف دو حصوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے تھا، یعنی دار الحرب اور دار الاسلام، لیکن جلد ہی امام شافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ)، بل کہ خود امام ابو حنیفہؒ کے تلامذہ کو اس تقسیم پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے دار الاسلام اور دار الحرب کی دوگانہ تقسیم کے مابین دار العہد اور دار الصلح کی درمیانی تقسیمیں تجویز کرنا ضروری سمجھا۔ کچھ اور بعد کے فقہا نے دار العدل، دار البغی اور ایسی ہی دوسری تقسیموں کی ضرورت محسوس کی۔ آج کے بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں جدید زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ان تمام تقسیموں پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کوئی ایک ملک نہ دنیا سے بالکل لاتعلق ہو کر رہ سکتا ہے اور نہ کسی ملک سے تعلق کی وہ نوعیت ہو سکتی ہے، جو فقہائے اسلام نے دار الحرب کے حوالے سے سوچی تھی، یہاں تک کہ جن ممالک سے مسلمان عملاً برسرِ جنگ ہیں (مثلاً ہندوستان، اسرائیل، روس اور فلپائن) ان کو بھی کلی طور پر دار الحرب قرار دینا اس لیے مشکل ہے کہ فقہائے اسلام نے اس وقت دار الحرب کی جو شرائط بیان کی تھیں، ان میں سے کئی شرائط ان ممالک میں نہیں پائی جاتیں۔ اسی طرح کئی ایسے ممالک جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، جہاں مسلمانوں کی خود مختار حکومتیں بھی ہیں، جہاں انہیں مذہبی مراسم اور مذہبی تعلیم کی آزادی بھی حاصل ہے، لیکن وہ خود کو آئینی طور پر سیکولر، یعنی لامذہبی ریاست قرار دیتے ہیں۔ ان کو نہ شاید دار الاسلام

کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے اور نہ غالباً ان کو دار الحرب قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ اور اس طرح کے بہت سے مسائل ایسے ہیں، جن کے پیش نظر ایک نئی تقسیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور نصوص اور فقہائے اسلام کے متفق علیہ اجتہادات کو سامنے رکھتے ہوئے ان حدود کا آسانی سے تعین کیا جاسکتا ہے، جن کے ذریعے جدید بین الاقوامی تعلقات اور میل جول کے معاملات کو نئے انداز سے منظم کیا جاسکے۔

اسی طرح کا ایک اور مسئلہ گزشتہ چند سالوں کے درمیان ہونے والی بحثوں کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ یہ بحثیں جو مشہور امریکی فضلا سموئیل ہن ٹنگٹن اور فوکویاما کی تحریروں سے شروع ہوئی تھیں، اس وقت دنیا میں بحث و نظر کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ ہن ٹنگٹن نے تہذیبوں کے تصادم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس نے مستقبل کی ممکنہ تہذیبی جنگ یا کم از کم کش مکش کے بارے میں مسلمانوں کے لیے اہمیت رکھنے والے متعدد سوالات اٹھائے ہیں۔ تہذیبوں کے اس تصادم میں اسلام کا رویہ کیا ہو گا؟ جس چیز کو اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے، اس کے تحفظ اور بقا کے لیے مسلمانوں کو کس حد تک جانا چاہیے؟ کیا اسلامی تہذیب کے مادی اور فنی مظاہر (مثلاً تاج محل اور الحمرا) اسی طرح دفاع کے مستحق ہیں، جس طرح اسلامی تہذیب کے فکری اور تعلیمی امتیازات (مثلاً اسلامی علوم، کلام اور اصول فقہ وغیرہ)؟ تہذیبوں کے اس ممکنہ تصادم یا کش مکش میں مذاہب کی روایتی تقسیم (مذاہب اہل کتاب، شبہ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب) کی حیثیت کیا ہو گی؟ تہذیبوں کے اس تصادم کے دوران مسلمانوں کی ذمے داری کیا ہو گی؟ اس باب میں کیا مسلم حکومتوں، مسلم عوام اور مسلم اقلیتوں کی ذمے داریوں کے مابین فرق کیا جائے گا؟ اگر تہذیبوں کا یہ تصادم شروع ہوا تو دنیائے اسلام میں اس وقت قائم قومی ریاستوں کا مستقبل کیا ہو گا؟ قومی ریاستوں اور تصورِ امت کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کی کیا صورت ہو گی؟ دنیائے اسلام کے وہ علاقے جہاں بہت سے لوگ خود کو مغربی تہذیب کا تسلسل قرار دیتے ہیں، ان کا طرز عمل اس تصادم کے دوران کیا ہونا چاہیے؟ یہ اور ایسے بے شمار

سوالات ہیں، جو ایک اجتہادی بصیرت کے متقاضی ہیں۔ ان سوالات کا جواب نہ محض فقہی اسلوب استدلال سے کام لے کر دیا جا سکتا ہے اور نہ محض متکلمین اسلام کی تحریروں سے۔ اس کام کے لیے نہ صرف قرآن مجید پر گہری نظر اور پیغام قرآن میں عمیق بصیرت کی ضرورت ہے، بل کہ فکر اسلامی میں مہارت، تصوف اور کلام سے واقفیت اور تاریخ اسلام پر گہری نظر کے ساتھ ساتھ جدید مغربی افکار، بالخصوص فلسفۂ تاریخ اور معرکۂ مذہب و سائنس کی تاریخ اور نشیب و فراز سے ناقدانہ واقفیت بھی ضروری ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم میں اس کی گنجایش ہے کہ ایسے اصحاب بصیرت پیدا ہو سکیں، جو اس طرح کے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے میں امت مسلمہ کی راہ نمائی کر سکیں؟ اکیسویں صدی میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کا کم از کم ایک بنیادی ہدف ایسے افراد کار کی تیاری بھی ہونا چاہیے۔

اسلامی علوم و فنون کی تدوین نو کے حوالے سے ایک اہم مسئلہ جو جدید دینی تحریکات اور تحریکی فکر کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے، وہ جہاد اور دعوت کے رشتے شکستہ کی بازیابی ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں جب پہلی جنگ عظیم میں کام یابی کے بعد سلطنت برطانیہ کا آفتاب نصف النہار پر معلوم ہوتا تھا، جب لینن اور اسٹالن کی سربراہی میں کمیونزم کی جبروتی طاقت سامنے آئی، جب ہٹلر اور مسولینی کی قائم کردہ کلیت پسندانہ اور مستبدانہ سلطنتیں وجود میں آئیں تو دنیائے اسلام میں بہت سے حساس اور مخلص خادمین اسلام نے یہ محسوس کیا کہ دنیائے اسلام کی کمزوری اور ادبار کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ امت مسلمہ کی پشت پناہی کے لیے کوئی ایسی بڑی سلطنت موجود نہیں، جو مذکورہ بالا ریاستوں کے مقابلے میں کھڑی ہو سکے اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسلام کے موقف کو بیان کر سکے۔ اس احساس نے، جس کی بنیادیں اخلاص اور دردمندی کے خمیر سے اٹھی تھیں، متعدد طاقت ور اسلامی تحریکات کو جنم دیا۔ ان تحریکوں کی صفوں سے ایسے بہت سے اہل قلم اور ارباب صحافت سامنے آئے، جنھوں نے ملت اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کی لازمی شرط

اور خشت اول کے طور پر اسلامی ریاست کے وجود کو لازمی قرار دیا اور یوں بیسویں صدی کے وسط سے لے کر آئندہ کم و بیش پچاس سال کے دوران یہ بحث معاصر اسلامی فکر کی شاید سب سے اہم بحث بن گئی، جس نے دنیائے اسلام میں مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو متاثر کیا اور اس طرح احیائے اسلام اور اقامت دین کی اصطلاحیں تاسیس ریاست کے مترادف بن گئیں۔ ان مباحث میں جہاد اور دعوت کی اصطلاحات کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا، لیکن اکثر و بیش تر یہ دونوں اصطلاحات ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال ہوئیں، حال آں کہ یہ دونوں اصطلاحات مسلمانوں کی دینی ذمے داریوں کے دو مختلف مراحل کی نمائندگی کرتی ہیں۔

اسلامی تعلیم کی بنیادی روح ایمان کامل، تعلق مع اللہ اور اخروی کام یابی کا حصول ہے۔ اسلام کا مزاج داعیانہ ہے، فاتحانہ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاصر حکم رانوں کو جتنے بھی تبلیغی والا نامے تحریر فرمائے، ان میں سے بہت سے والا ناموں، یہ بات قدر مشترک کی حیثیت رکھتی تھی کہ اگر تم اس پیغام کو قبول کر لو تو تمہاری حکومت برقرار رہے گی اور تمہارا اقتدار قائم رہے گا۔ اسلامی دعوت کی تاریخ میں یہ بات انتہائی اہمیت رکھتی ہے کہ آغاز وحی سے لے کر ریاست مدینہ کے قیام اور سن دو ہجری میں میثاق مدینہ کی تحریر و تدوین تک کا یہ سارا پندرہ سالہ عمل ایک انتہائی پر امن تبدیلی کے عمل سے عبارت تھا۔ بغیر ایک قطرۂ خوں بہائے اور تلوار ہاتھ میں لیے ایک مسلم معاشرہ اور مسلم ریاست وجود میں آ گئی۔ جہاد بالسیف کی اجازت اس وقت دی گئی، جب اس ریاست پر بیرونی حملوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دعوت اور جہاد کے مابین اس نہایت اہم تاریخی ترتیب کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں اصل دعوت ہے اور جہاد بالسیف اس کا ایک ناگزیر مرحلہ۔ یوں بھی قرآن مجید کی متعلقہ نصوص کی رو سے جہاد کی بہت سی قسموں (جہاد بالمال، جہاد بالقرآن، جہاد بالنفس) کے ساتھ جہاد بالسیف ایک مرحلہ ہے، اگرچہ وہ اپنی اہمیت اور فضیلت کے اعتبار سے بقیہ تمام مراحل سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

بیسویں صدی کی اسلامی تحریکات میں جو مزاج تیار ہوا اور جو ادب سامنے آیا، اس میں دعوت اور جہاد کے ان مراحل اور ترتیب کا لحاظ رکھنے کی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شعوری کوشش نہ کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دعوت کا خالص نبوی اسلوب پس منظر میں چلا گیا اور مغربی انداز کے سیاسی عمل اور سیاسی تنظیم نے اس کی جگہ لے لی۔ سیاسی سرگرمیوں کا یہ انداز خالص دعوتی انداز سے چوں کہ خاصا مختلف تھا، اس لیے جب ان سرگرمیوں کو دینی مکالمے اور دینی محاورے میں بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس میں جہاد کی اصطلاح زیادہ موزوں اور قریب الفہم محسوس ہوئی، اس لیے اس کو بلا تکلف استعمال کیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاد کے وہ تمام مستلزمات جو جہاد بالسیف کے ساتھ خاص ہیں، روزمرہ کے سیاسی عمل کا لازمی حصہ سمجھے جانے لگے اور یوں دینی تحریکات کے پرجوش کارکنوں کے ذہنوں میں معمول کے مغربی انداز کا سیاسی عمل ایک جہادی سرگرمی بن گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اس میں شدت پیدا ہوتی گئی تو اس کا اظہار شدت پسندانہ اور بعض اوقات دہشت پسندانہ انداز میں ہونے لگا۔ گزشتہ چوتھائی صدی کے دوران مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک پھیلی ہوئی بہت سی اسلامی تحریکات کے کارکنوں کی شدت پسندی کے اسباب فکری پس منظر میں تلاش کیے جانے چاہییں۔

ان حالات میں مسلمان اہل علم اور مفکرین کی یہ ذمے داری ہے کہ جہاد اور دعوت کے گرد گھومنے والے اس نئے علم کلام کا ازسرنو جائزہ لیں اور یہ واضح کریں کہ دعوت اور جہاد کا رشتہ کیا ہے اور یہ کہ دورِ جدید کے مغربی انداز کے عام سیاسی عمل کی اسلام میں کیا حیثیت ہے، اور یہ کہ اس عمل کو کب اور کس طرح دعوتی رنگ دیا جانا چاہیے اور کب اور کن حالات میں اس عمل کو جہاد بالسیف میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

جہاد کے سیاق و سباق میں جہاں دعوت و جہاد کے رشتۂ شکستہ کی بحالی ضروری ہے اور جہاں اسلام کے داعیانہ (بہ مقابلہ فاتحانہ) کردار کی اہمیت پر زور دینے کی ضرورت ہے، وہاں جہادِ اصغر (جہاد بالسیف) اور جہادِ اکبر (جہاد بالنفس) کا تعلق یاد

دلانا بھی ضروری ہے۔ عدل، ایفائے عہد، احساس ذمے داری، نظم، سمع وطاعت اور اس طرح کے بہت سے احکام جہاد کے لازمی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان عناصر کے بغیر اگر تلوار اٹھائی جائے گی تو وہ فتنہ اور افراتفری پیدا کرے گی اور اس سے جہاد کے تقاضے پورے نہ ہوں گے۔ تلوار آخری چارۂ کار ہے، اس لیے پہلے دعوت اور اس کے مراحل، تالیف قلب اور اس کے مراحل اور دشمن پر پرامن دباؤ کے مراحل کا گزرنا ضروری ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ جدید اسلامی فکر کے نمائندہ بعض انتہائی محترم اسلامی مفکرین کی تحریروں سے جو یک طرفہ رجحان جنم لے رہا ہے، اس میں توازن پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس عدم توازن کی بڑی وجہ سلف کی احتیاط، توازن اور جامعیت کا نظروں سے اوجھل ہو جانا ہے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے نئے معاملات ہیں، جو سنجیدہ اور گہرے غوروخوض کے متقاضی ہیں۔ اسلامی علوم وفنون کی تدوین نو کا یہ عمل ان بنیادی تصورات اور مفاہیم کی تصحیح وتوضیح کے بغیر ممکن نہ ہو گا۔

اسلامی علوم وفنون کی تدوین نو پر گفت گو نامکمل رہے گی اگر ہم روایتی مذہبی تعلیم اور اس کے رائج الوقت اسالیب پر گفت گو نہ کریں۔ ان اسالیب میں سب سے نمایاں پہلو قدیم انداز کا وہ نظام تعلیم ہے، جو انڈونیشیا، ملائشیا، بنگلہ دیش، بھارت، پاکستان اور افغانستان وغیرہ میں دینی مدارس کے نام سے معروف ہے۔ یہ دینی مدارس جو اپنی پشت پر ایک نہایت تابناک فکری اور ملی تاریخ رکھتے ہیں، بعض پہلوؤں سے مسلمانوں کی نہایت روشن تعلیمی روایت کا تسلسل ہیں، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، یہ مدارس جامعیت اور توازن کی اس روایت کا ایک مظہر ہیں جو مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ اور علمی روایات کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ برصغیر میں جس تعلیمی روایت کی پیداوار شیخ احمد سرہندی جیسے عظیم مذہبی عبقری، نواب سعد اللہ خان جیسے بالغ نظر مدبر اور منتظم اور استاد احمد خان معمار جیسے بے مثال معمار اور مہندس تھے، وہ روایت اگرچہ انگریزی استعمار کے ساتھ ہی دم توڑ چکی تھی، تاہم اس کی جھلکیاں وقتاً فوقتاً دیکھنے میں آتی رہی ہیں۔ آزادی کے بعد ضرورت اس بات کی تھی کہ جدید آزاد

دنیائے اسلام کے تقاضوں اور ضروریات کے پیش نظر دینی تعلیم کے مقاصد اور اہداف واضح طور پر متعین کیے جائیں اور ان اہداف و مقاصد کے پیش نظر جامع اور مناسب نصابات کی تدوین کی جائے، لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوا۔ کم از کم برصغیر کی حد تک صورت حال یہی ہے کہ صدیوں پرانا درس نظامی رائج ہے، جو بعض محدود مقاصد کے لیے تو کار آمد ہو سکتا ہے لیکن اس سے ایک جدید آزاد اسلامی ریاست کے دینی و تعلیمی تقاضے کما حقہ پورے نہیں کیے جاسکتے۔ آج جو طلبہ درس نظامی کی تعلیم پا کر نکلتے ہیں، ان کی غالب اکثریت مساجد میں امامت اور خطابت کے فرائض انجام دیتی ہے۔ مساجد کی امامت اور خطابت کے تقاضے بھی درس نظامی کی تعلیم سے کما حقہ پورے نہیں ہوتے۔ آج کے ایک دینی خطیب کو جن سوالات سے آئے دن واسطہ پڑتا ہے، ان میں بیش تر کا جواب درس نظامی کی کتابوں میں موجود نہیں۔ درس نظامی میں پڑھائے جانے والی منطق اور فلسفے کی قدیم کتابوں کے قدیم مباحث کی مساجد کی امامت میں کہیں ضرورت نہیں پڑتی، اس لیے کم از کم ائمہ مساجد کی حد تک مکمل درس نظامی کی تعلیم پر اصرار وقت اور وسائل دونوں کا ضیاع ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں دینی تعلیم کے بارے میں چند گزارشات پیش کرنے سے قبل رائج الوقت دینی نصاب تعلیم، یعنی درس نظامی اور دینی مدارس کے نظام کے بارے میں مختصر گفت گو کی جائے۔ یہ مختصر گفت گو درس نظامی کے تاریخی پس منظر اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے جائزے پر مشتمل ہو گی۔

واضح ہونا چاہیے کہ درس نظامی پر گفت گو محض ایک نصاب تعلیم پر گفت گو نہیں ہے، بل کہ یہ ایک ایسی تعلیمی روایت، تہذیبی ورثے اور ماضی پر گفت گو ہے جس کے ہماری ملی اور اجتماعی زندگی پر بڑے گہرے اثرات ہیں۔ گزشتہ دو سو سال کے دوران برصغیر میں جو دینی قیادت سامنے آئی، ان میں غالب تعداد، جیسا کہ اشارہ کیا گیا، ان حضرات کی تھی جو درس نظامی کے پس منظر سے تعلیم پا کر آئے تھے۔ اس دوران جو دینی فکر ہمارے سامنے آئی، اس پر درس نظامی کے بنیادی فلسفے اور

روح کے نہایت واضح اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس درس نظامی کے مثبت وفعال کردار یا منفی پہلو (اگر کوئی ہے) پر ناقدانہ گفت گو اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان سارے مسائل کو سمجھنا اور ان کی روشنی میں مستقبل کا ایک نقشۂ کار اور ممکنہ اصلاح کے لیے خاکہ تیار کرنے کے لیے یہ جائزہ لینا اور ایسی ناقدانہ گفت گو کرنا ناگزیر ہے۔ برصغیر اور دنیائے اسلام کو کن کن مسائل کا سامنا ہے؟ ان مسائل کا حل کن خطوط پر کام کرنے سے ہو گا؟ علمائے کرام کی کیا ذمے داریاں ہیں؟ دینی قیادت کے کیا تقاضے ہیں؟ ان سب سوالات کا جواب دینے اور اس سارے نقشے پر غور کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ دینی تعلیم کے باب میں ماضی کا سارا تجربہ اور حال کی صورت حال کا ہمیں صحیح صحیح اندازہ ہو، ورنہ ہم مستقبل کی منظر کشی اور نقشہ سازی نہیں کر سکیں گے۔

برصغیر میں اسلامی فکر اور اسلامی تعلیم کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہاں کئی ادوار سامنے آتے ہیں۔ برصغیر میں اسلامی تعلیم کا آغاز ایک انتظامی ضرورت کے تحت ہوا۔ محمود غزنوی فقہ شافعی کا پیرو تھا، اس لیے اس کے ہاتھوں اور بعد میں بھی یہاں جو اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں، ان سب کا نظام فقہ شافعی کی بنیاد پر استوار ہوا۔ ان حکومتوں کے کارندوں کی اکثریت فقہ شافعی کی پیرو کار تھی۔ لیکن بعد میں مختلف اسباب کی بنا پر فقہ حنفی مروج ہو گئی اور سلطنت کا سارا نظام شریعت کے مطابق، جیسا کہ فقہ حنفی میں اس کی تعبیر ہے، جاری ہو گیا۔ اس کام کے لیے ایسے افراد کار اور ماہرین کی ضرورت تھی، جو نہ صرف دفتری اور عدالتی فرائض انجام دے سکیں، بل کہ نئی سلطنت کی دینی قیادت کے فرائض بھی انجام دے سکیں۔ اس مقصد کے لیے ایک نظام تعلیم وضع کیا گیا، جس میں سب سے بنیادی مضمون کی حیثیت علم فقہ اور اس کے متعلقات کو حاصل تھی، اس لیے کہ نظام ریاست وقضا کو چلانے کے لیے فقہی علوم میں مہارت ناگزیر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طویل عرصے تک ہمارے نصاب تعلیم میں فقہ کو بنیادی اہمیت حاصل رہی۔ باقی علوم کی تدریس فقہ اور اصول فقہ کی اعلیٰ فنی کتابوں کے سمجھنے کے لیے طلبہ کو تیار کرنے کی خاطر تھی۔

اول اول برصغیر کے نصاب میں حدیث اور تفسیر کی کتابیں یا تو سرے سے شامل ہی نہ تھیں یا محض برائے نام شامل تھیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ جب حج کے لیے تشریف لے گئے تو پہلی بار مشکوٰۃ کا نسخہ ساتھ لائے۔ اس کے بعد ہی برصغیر میں اسلامی تعلیم کی تاریخ میں غالباً پہلی بار باقاعدہ طور پر علم حدیث کی درسی کتاب کے طور پر مشکوٰۃ شریف مروج ہو گئی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ حج سے واپسی پر موطاامام مالکؒ ساتھ لے آئے تو مشکوٰۃ شریف اور موطا دونوں رائج ہو گئیں۔ بہت بعد میں دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو پوری صحاح ستہ درس نظامی کے ایک تتمے کے طور پر آخری سال میں شامل کر لی گئیں۔

اس مختصر تمہید سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ نصاب عمومی انداز میں ایسا نصاب نہیں تھا، جو اصلاً دینی علوم میں تخصص پیدا کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ یہ کام لوگ انفرادی طور پر ماہر علما کی خدمت میں رہ کر کیا کرتے تھے۔ بنیادی نصاب فقہ ہی کا تھا، کیوں کہ اس وقت فقہ میں مہارت حاصل کیے بغیر قضا، احتساب اور دیگر سرکاری مناصب نہیں ملتے تھے، اس لیے انتظامی ضرورت کے تحت فقہ اور پھر فقہ کو سیکھنے کے لیے اصول فقہ لازمی ٹھہرا۔ اصول فقہ کے لیے منطق اور فلسفہ اور دیگر معاون کتب لازمی تھیں۔ ان خطوط اور ضروریات کی بنیاد پر ترتیب پانے والا یہ نصاب ہندوستان میں ایک ہزار برس جاری رہا۔ اس طویل عرصے میں مختلف کتابیں مقبول ہوئیں اور مختلف شارحین اور مصنفین مقبول ہوئے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف ادوار میں کتابوں اور شارحین کے انتخاب میں اس دور کے تقاضے کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

جب مغلیہ سلطنت کمزور پڑ گئی اور انگریزوں نے طاقت پکڑنا شروع کی تو بندرگاہوں پر اپنا تسلط مکمل کرنے کے لیے انہوں نے بمبئی، مدراس اور کلکتہ پر قبضہ کر لیا اور بالآخر بہار اور یوپی کے کچھ حصے پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد مرکزی حکومت نے انگریزوں کو ایک موثر قوت کے طور پر تسلیم کر لیا اور مغلیہ سلطنت اور انگریزوں کے درمیان معاہدۂ انتقالِ دیوانی طے پایا۔ اس معاہدے

کا درس نظامی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ معاہدے میں طے پایا تھا کہ انگریز ان دونوں صوبوں کے عدالتی نظام کو نہیں چھیڑیں گے، بل کہ مسلمان عدالتیں اور مسلمان قاضی ہی شریعت محمدی کے مطابق فیصلے کریں گے۔ انگریزوں نے غالباً وقتی سیاسی مصالح کی خاطر یہ بندوبست تسلیم کر لیا، چناں چہ ان دونوں صوبوں میں نظام عدالت قائم کرنے اور دیگر انتظامی امور کی تفصیلات مرتب کرنے کے بعد ان کو یہ جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ شریعت کے لیے فقہ حنفی کے ماہرین کہاں سے لائے جائیں۔ چوں کہ نہ صرف ہندوستان میں، بل کہ پوری دنیائے اسلام میں نظام تعلیم آزاد تھا اور یہ اسلامی روایت ہر جگہ رہی ہے کہ نظام تعلیم حکومتوں کے کنٹرول سے باہر اور آزاد ہو، اس لیے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کئی آزاد نصاباتِ تعلیم جاری تھے۔ ان میں خیر آبادی، فرنگی محلی اور دہلوی علما کے اختیار کردہ نصابات زیادہ مشہور ہوئے۔ یہ صورت حال شاید انگریزی مزاج کے لیے زیادہ قابل قبول نہ تھی، کیوں کہ ان کی روایت یہ تھی کہ نظام تعلیم حکومت کے کنٹرول میں ہی ہو۔ اس لیے وہ جاننا چاہتے تھے کہ اسے حکومتی کنٹرول میں کیسے لائیں، نیز وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ ماہرین شریعت کا انتخاب کس بنیاد پر کریں؟ انہیں بعض علما نے مشورہ دیا کہ درس نظامی سے استفادہ اس معاملے میں نہ صرف آسان رہے گا، بل کہ عملی مشکلات کے لحاظ سے دوسرے نصابات کے مقابلے میں نسبتاً بہت مفید ہو گا۔ یہ وہ نصاب تھا، جس کی اٹھان فرنگی محل کی روایت سے ہوئی، جس میں خیر آبادی روایت کے عناصر بھی سمو دیے گئے۔ چناں چہ ملا نظام الدین نے، جو اس وقت زندہ تھے، اس ضرورت کی خاطر یہ نصاب مرتب کیا۔ ان ہی کے نام کی مناسبت سے یہ نصاب درس نظامی کہلاتا ہے۔ بعض لوگ غلط فہمی سے اس کا تعلق بغداد کے نظامیہ سے جوڑتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ اس میں اسی فیصد وہ کتب ہیں، جو نظامیہ بغداد کے بہت بعد کی ہیں۔ ملا نظام الدین نے برصغیر کی روایات کے مطابق سارے تعلیمی ورثے کو سامنے رکھ کر ایک نصاب تیار کیا، جس کی کئی ایک خصوصیات نمایاں تھیں:

بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا بڑا حصہ تین بنیادی علوم فقہ، اصول فقہ اور

منطق پر مشتمل تھا۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ جتنے علوم اس زمانے میں مسلم ہندوستان میں مروج تھے، وہ اس میں شامل تھے۔ کوشش یہ تھی کہ اس نصاب کا فارغ کسی رائج الوقت علم سے بالکل ناواقف نہ ہو، چاہے وہ سائنس ہو، طب ہو، انجینئرنگ ہو، جو بھی اس زمانے کی سائنس اور انجینئرنگ تھی، وہ اس میں شامل تھی۔ اقلیدس، الجبرا، جیومیٹری اور ریاضی کے مضامین اس زمانے میں بھی نصاب میں شامل تھے۔ آزاد معاش کا طریقہ اختیار کرنے میں مدد دینے کے لیے طب شاملِ نصاب تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس درس کے پڑھے ہوئے بے شمار لوگ طبیب، مہندس، منتظم اور معمار ہوئے۔ (درس نظامی سے پہلے جو شکل نظام تعلیم کی تھی، اسے ہم درس نظامی کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں) چناں چہ وہ ماہر مہندس جس نے تاج محل تعمیر کیا، یعنی استاد احمد معمار، وہ اسی درس کا پڑھا ہوا تھا۔ معماری کا یہ فن اس نے مدرسے ہی میں بیٹھ کر سیکھا تھا۔ یہ درس اس زمانے میں ایک اپ ٹو ڈیٹ معاشرے کو چلانے کے لیے ہر لحاظ سے مکمل تھا، معاشرے کی ضرورت کے مطابق تمام علوم وفنون اس میں شامل تھے۔

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ یہ نصاب نہایت ٹھوس اور مشکل تھا اور فارغ ہونے والے کے لیے ہر فن کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتاب سے گزرنا ضروری تھا۔ یہ اس لیے کیا جاتا تھا کہ کوئی کتاب آگے چل کر اس کے لیے مشکل نہ رہے۔ بعض لوگ اس پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور مشکل کتابوں کو ختم کر کے آسان کتابیں شامل کرانا چاہتے ہیں، لیکن میں ذاتی طور پر اس کو درست نہیں سمجھتا۔ اس مشکل پسندی میں آج بھی بڑی معنویت ہے۔ اگر طالب علم کو مشکل کتابوں کا یہ پہاڑ عبور کرالیا جائے تو اس کا مطالعہ اتنا ٹھوس ہو جاتا ہے اور ذہن میں ایسی تیزی آجاتی ہے کہ اسے پھر آج کل کی بڑی بڑی یونی ورسٹیوں اور درس گاہوں کا نصاب اور علوم بڑے آسان معلوم ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اتنی اعلیٰ سطح پر جو مباحث پڑھائے جاتے ہیں، ان میں علمی اعتبار سے اس کے لیے کوئی مشکل اور ناقابل فہم چیز نہیں ہے، بہ شرطے کہ

طالب علم اس وسیع ذخیرے سے اچھی طرح واقف ہو، اس لیے ضروری ہے کہ ان کتابوں کو باقی رکھا جائے۔

درس نظامی کی کتابوں کی بالخصوص اور علوم اسلامیہ کی بیش تر کتابوں کی بالعموم ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا آپس میں نہایت گہرا اور مضبوط ربط ہے۔ اسلامی علوم وفنون دوسری اقوام کے علوم وفنون کی طرح ماضی سے لاتعلق بہ الفاظ دیگر یتیم نہیں ہیں، ان کا اپنے ماضی سے بہت گہرا تعلق ہے اور ماضی سے تعلق کا یہ سلسلہ کہیں بھی منقطع نہیں ہوتا۔ ان سب علوم اور کتابوں میں ایک غیر منقطع فکری وحدت اور فکری تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی علوم میں یہ خوبی نہیں ہے۔ مثلاً انگریزی قانون کے کسی موضوع پر کوئی کتاب لکھی جائے اور وہ مقبول ہو جائے تو اچھی کتاب ہے، اس سے بحث نہیں کہ اس سے پہلے کس نے کیا کہا۔ مسلمانوں میں یہ بات نہیں ہے۔ مثلاً ظاہر الروایت کی چھ کتابوں کو لیجیے، جو فقہ حنفی کی بنیادیں ہیں۔ آج جو کتابیں فقہ حنفی کی ہمارے پاس ہیں، ان سب کا ماخذ وہی ظاہر الروایت ہے۔ ظاہر الروایت کی کتابوں کی تلخیص ''الکافی فی فروع الحنفیہ'' ہے۔ الکافی کی شرح امام سرخسی کی المبسوط ہے۔ دوسری طرف ظاہر الروایت کی ایک اور کتاب الجامع الصغیر کی بنیاد پر ہدایۃ المبتدی لکھی گئی، جس کی شرح ہدایہ ہے۔ پھر ہدایہ کی تلخیص وقایہ اور وقایہ کی شرح ''شرح وقایہ'' ہے۔ اب اگر آپ کہیں کہ ہدایہ کو نصاب سے نکال دو، تو اس لیے کہ مشکل ہے تو اس سے ایک خلا پیدا ہو جائے گا اور کسی بھی نئی مجوزہ فقہی کتاب کو ہدایہ کی جگہ رکھ دینے سے دوسرے علمی نقصان کے علاوہ ایک بڑا نقصان یہ ہو گا کہ نئی مجوزہ کتاب کا اس پورے فقہی شجرۂ نسب اور علمی ورثے سے رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ اس لیے فقہ اور فلسفے کی کتابیں مشکل تو ہیں، لیکن ضروری ہیں، کیوں کہ ایک دوسرے پر ان کا دارومدار ہے۔ ذاتی طور پر میں ہر گز اس کا قائل نہیں ہوں کہ درس نظامی کی مشکل کتب کی جگہ آسان کتابیں رکھی جائیں۔

البتہ اپنے گزشتہ تیس سالہ درس وتدریس کے تجربے کی روشنی میں اس بات

سے اتفاق کرتا ہوں کہ عربی زبان اور صرف و نحو سے تعلق رکھنے والی کتابوں میں آسانی اور جدت کی ضرورت ہے۔ فارسی بہ طور زبان پڑھائی جائے، لیکن ذریعے تعلیم کے طور پر اسے اختیار کرنے کی آج ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا صرف و نحو اور دیگر علوم لغت کی وہ مشکل کتابیں جو یا تو فارسی میں ہیں یا غیر ضروری مباحث میں طلبہ کو الجھا دیتی ہیں، ان کی ضرورت نہیں، مثلاً کافیہ وغیرہ۔ مشکل پسندی کی مشق اور اس کے اسلوب سے متعارف کرانے کے لیے وہ کتابیں کافی ہیں، جو بہ راہِ راست اسلامی علوم سے متعلق ہیں۔ صرف و نحو (عربی قواعد) دنیا کا ترقی یافتہ ترین ذخیرہ ہے، اسے ہمارے اسلاف نے نہایت منظم منطقی اور سائنسی طریقے سے مرتب کیا ہے۔ اس کو سمجھانے کے لیے آسان اور عصری انداز کی کتابیں ہی زیادہ موزوں ہیں، بالخصوص مبتدئین کے لیے تو ان کی افادیت مسلم ہے۔

۱۸۵۷ء میں کمپنی کی حکومت کے خاتمے اور بہ راہ راست انگریزی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی انتقال دیوانی کا معاہدہ بھی ختم ہو گیا۔ اب انہوں نے شریعت کا دائرہ ایک ایک کر کے محدود کرنا شروع کر دیا۔ پہلے حدود، پھر دیوانی قوانین، پھر شخصی قوانین سے ہوتے ہوئے آخر میں نکاح، طلاق کے قانون کا تھوڑا سا حصہ رہ گیا۔ مکمل انگریزی تسلط کے ساتھ ہی مسلم عدالتیں ختم ہو گئیں اور اسلامی اوقاف ضبط ہو گئے۔ اب مسلمانوں کے لیے مسئلہ اپنے ورثے کے تحفظ کا رہ گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے سوچا کہ امت مسلمہ کی دینی راہ نمائی کے لیے جو کچھ بھی کیا جا سکتا ہو، وہ کیا جائے۔ اب واحد راستہ تعلیمی اور فکری کام ہی کا رہ گیا تھا، بقیہ تمام راستے مسدود ہو چکے تھے، چناں چہ دار العلوم دیوبند کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس میں درس نظامی کو کچھ ترامیم کے ساتھ اختیار کر لیا گیا۔

مولانا نظام الدین سہالوی کے درس نظامی میں ۲۰۰ کے قریب کتابیں تھیں، جن میں تقریباً ۵۵، ۵۶ علوم شامل تھے۔ دینی علوم کے ہر فاضل کو یہ دو سو درسی کتابیں اور یہ سارے علوم پڑھنے پڑتے تھے۔ دار العلوم دیوبند نے منطق و فلسفے میں قابل ذکر تبدیلی کی، طب کو نکال دیا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی اس بات کے قائل

تھے کہ منطق و فلسفے کو مکمل طور پر خارج کر دیا جائے۔ بعد میں مولانا کو بہ مشکل آمادہ کر کے منطق و فلسفے کی کچھ کتابیں رکھی گئیں۔ اس طرح دو سو میں سے تقریباً ۸۰ کے قریب کتابیں منتخب ہوئیں۔

تفسیر کا شروع سے ہی کسی قدر اہتمام کیا گیا۔ اس سے پہلے درس نظامی میں تفسیر نہیں تھی۔ (جلالین یا بیضاوی کی ایک سورت تھی، جو برائے نام اور برائے برکت زیادہ تھی اور برائے تخصص مشکل ہی سے کفایت کرتی تھی) قریب قریب یہی معاملہ علم حدیث کا تھا۔ اس سے قبل مشارق الانوار یا مشکوٰۃ اور بعد میں موطا پڑھائی جاتی تھی، لیکن صحاح ستہ کو ٹھوس انداز سے پڑھانے کا اہتمام نہیں تھا۔ بل کہ سچی بات یہ ہے کہ درس نظامی میں اب بھی حدیث کو بہ طور علم حدیث اور قرآن کو بہ طور علم قرآن نہیں پڑھایا جاتا۔ ایک سال میں پوری صحاح ستہ پڑھا دی جاتی ہیں، حال آں کہ حق ادا کیا جائے تو ایک صحیح بخاری بھی ایک سال میں ختم نہیں ہو سکتی۔ پہلے چھ ماہ کتاب الایمان میں لگا دیے جاتے ہیں۔ بحث یہ ہوتی ہے کہ ایمان میں کمی بیشی کا امکان ہے یا نہیں؟ یہاں لوگوں کے سرے سے ایمان ہی ضائع ہو رہے ہیں اور لوگوں نے اسلام چھوڑ دیا ہے۔ آج کے دور کے انسان کا نہ یہ مسئلہ ہے کہ ایمان میں کمی بیشی کا امکان ہے یا نہیں اور نہ ہی اس بحث سے ہمارے اور آپ کے ایمان میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ چھ ماہ اس طرح کی نظری بحثوں میں گزر جاتے ہیں۔ اسی طرح حدیث میں رفع یدین، آمین بالجہر اور تراویح کی تعداد وغیرہ جیسے مسائل کی افضلیت ثابت کرنے میں ساری توانائیاں خرچ ہو جاتی ہیں۔ حنفیوں کے ہاں بقیہ تین ماہ امام بخاری کی تنقید (قال بعض الناس) کا جواب دینے میں اور اہل حدیث کے ہاں امام بخاری کی تائید میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا؟ اس سے نہ بیش تر طلبہ کو خاص بحث ہوتی ہے اور نہ اساتذہ کو۔ اسی طرح کا معاملہ قرآن مجید کے درس اور تفسیر کا بھی ہے۔ بیضاوی کے ذریعے قرآن نہیں، علم کلام پڑھایا جاتا ہے، کیوں کہ یہ علامہ جار اللہ زمخشری معتزلی کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس پر ملا عبدالحکیم کے حاشیے کا اسلوب بھی کلامی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ معتزلہ کی

تردید نہ کریں۔ ضرور کریں، لیکن اس کے لیے قرآن مجید کو تختۂ مشق نہ بنائیں۔ یہ کام علمِ کلام کے ضمن میں کریں، قرآن مجید پڑھاتے ہوئے معتزلہ اور ماتریدیہ کا کیا سوال؟

یہ درس نظامی کے متعلق میرا ذاتی تاثر ہے، جس سے آپ اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ ایک اور تاثر میرا یہ ہے کہ درس نظامی کا ایک خاص مقصد تھا، لیکن ہم نے اسے اور مقصد کے لیے اختیار کرنا شروع کر دیا۔ اس کا اسلوب اب یہ بن گیا ہے کہ پہلے طلبہ کا ایک مخصوص ذہن بنایا جاتا ہے، مثلاً حنفی ذہن، پھر دیوبندی یا بریلوی، پھر ہلکے یا گاڑھے دیوبندی یا بریلوی، اخیر تک خوب پکا کر اب اسے مخصوص عینک لگا دیتے ہیں کہ اس عینک سے قرآن پڑھو اور اس عینک سے حدیثِ رسول کو دیکھو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، جو ہر چیز سے بالاتر اور ہر چیز پر حاوی ہیں، جن کے بعد ہر چیز ختم ہے اور جن سے متعارض ہر چیز اور ہر رائے منسوخ ہو جاتی ہے، مخصوص نظریا رائے کے تابع کر دیے جاتے ہیں اور ہماری حنفیت، دیوبندیت اور بریلویت کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ ان ہی کی روشنی میں متعارض احادیث کی تاویل کی جاتی ہے، جس سے کبھی طالب علم کا ضمیر مطمئن نہیں بھی ہوتا ہے، لیکن زبردستی تاویل کر کے نعوذ باللہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو حنفی، دیوبندی یا بریلوی ثابت کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کسی کو یہ الفاظ سخت معلوم ہوں، لیکن افسوس کہ امر واقعہ یہی ہے۔

ان سب کے باوجود میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ درس نظامی کی بیش تر کتابوں کو جوں کا توں رہنا چاہیے، لیکن آغاز قرآن وحدیث اور عربی زبان وادب سے کرنا چاہیے، البتہ عربی قواعد آسان انداز میں ہوں۔ پھر اس کے پختہ ہونے کے بعد بہ تدریج فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دی جائے۔ درمیان میں کہیں منطق، فلسفہ اور علم کلام بھی ہو، لیکن اختتام فقہ، اصول فقہ اور قرآن وحدیث کے خصوصی مطالعے پر ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حنفیت کو چھوڑ دیں یا شافعیت کو نظر انداز کر دیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہر چیز قرآن وحدیث کے تابع ہو۔ اللہ کی کتاب تو ہر

چیز کو منسوخ کرنے کے لیے ہے، لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۱۴) اس کے فیصلے کے بعد تو ہر کسی کی رائے اور اجتہاد کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس خاص رجحان نے جو خطرناک ذہنیت اور سوچ پیدا کی ہے، اسے بہ ہر حال بدلنے کی ضرورت ہے۔

ایک اور اہم پہلو درس نظامی میں بعض نئے علوم وفنون اور مضامین شامل کرنے کا ہے۔ آج ان علوم وفنون کی دین کی نشرواشاعت کے لیے ایسے ہی ضرورت ہے، جیسے کبھی یونانی علوم وفنون کی ضرورت تھی۔ یونانی علوم ہمارے ہاں دوسری صدی ہجری میں آنے شروع ہوئے، پھر زور وشور سے پوری دنیائے اسلام میں پھیل گئے۔ یہ علوم وفنون اکثر وبیش تر بت پرستوں اور یونانی کفار ومشرکین کے ہاں سے آئے ہیں جو بیش تر لامذہب، دہریے، بد کردار اور بداخلاق لوگ تھے، لیکن علمی اعتبار سے بہ ہر حال بلند پایہ رکھتے تھے۔ ارسطو اور افلاطون کی بد کرداریوں کی داستانیں غیر معروف نہیں ہیں۔

جب یہ علوم مسلمانوں میں آئے تو ان علوم کے حوالے سے مسلمانوں میں تین قسم کے رویے سامنے آئے: ایک رویہ محدثین ومفسرین کا تھا، جنھوں نے ان علوم کو ناپاک اور گندہ قرار دے کر ان سے مکمل احتراز کرنے کی تلقین کی۔ دوسرا رویہ ایک دوسرے گروہ، یعنی حکما کا تھا کہ جنھوں نے قرآن وسنت، بل کہ ہر چیز کی تاویل یونانی علوم کے مطابق کر دی، حتیٰ کہ یونانی حکما اور فلاسفہ کو مسلمانوں کے لیے رول ماڈل قرار دے ڈالا، یہاں تک کہ افلاطون جیسے بت پرست کو افلاطون الٰہی کا لقب دے دیا۔ یہ دوسری انتہا تھی۔ تیسرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جو چیز غلط ہے، اس کی تردید کی جائے اور جو صحیح ہے، اسے لے لیا جائے اور اس سے استفادہ کرنے میں کسی بے جا تعصب کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ شروع میں دو سو سال تک تینوں نقطہ ہائے نظر ساتھ ساتھ چلتے رہے، لیکن بعد میں تیسرے نقطۂ نظر کو عروج ہوا۔ بالآخر آپ نے دیکھا کہ یونانی منطق کو گویا اسلامیا لیا گیا، یعنی اسلامائز کر لیا گیا اور بالآخر وہ خالص دینی علوم، تفسیر اور اصول فقہ میں بھی ایک اہم عنصر کے طور پر داخل ہو گئی۔

۱۴۔ الفتح: ۲۸

اب ہر چیز منطق کے مطابق آنے لگی، حتیٰ کہ متاخرین کی اصول تفسیر بھی اسی اسلوب پر آگئے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ جو علمائے دیوبند کے سب سے بڑے نمائندے تھے، ان کے مواعظ اور ملفوظات تک میں منطق موجود ہے۔ تربیت السالک جو مریدوں کی روحانی تربیت کے لیے تھی، اس میں بھی منطقی انداز بڑا نمایاں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ کفار، بت پرستوں اور یونانیوں کے علوم وفنون کو مسلمانوں نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا کہ وہ علوم جو اسلام پر حملے کے دوران اسلحے کے طور پر استعمال ہو رہے تھے، ان کو اسلام کے دفاع کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ پھر ایک ہزار سال تک منطق کے اسلوب واستدلال سے کام لے کر اسلامی عقائد وتعلیمات کو پیش کیا گیا۔ منطق کے بارے میں مسلمانوں میں محدثین ومفسرین کے نقطۂ نظر کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی، جن کا منطق کے خلاف اتنا شدید رد عمل تھا کہ بعض نے کہا کہ منطق کی تعلیم ہی سرے سے حرام ہے، حتیٰ کہ منطق کی کتابوں سے نجاست دور کرنا بھی جائز ہے۔ بعد میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ امام غزالی اور امام رازی کی المستصفیٰ اور المحصول جیسی مذہبی کتابیں منطقی اسلوب پر لکھی گئیں۔

یہی چیز آج ہمیں درپیش ہے اور وہی تین نقطہ ہائے نظر اور رویے آج ہمارے سامنے ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں جب مغربی علوم ہمارے ہاں آئے تو ایک رویہ قدیم طرز کے علما کا قدیم محدثین ومفسرین کی طرح یہ سامنے آیا کہ یہ سب کچھ ناجائز اور ناپاک ہے۔ اس کو چھیڑنے اور چھونے کی ضرورت نہیں۔ دوسرا رویہ ان لوگوں کا تھا، جو کلی طور پر ان علوم کے رنگ میں رنگ گئے۔ ایک درمیانہ نظریہ جو اعتدال اور توازن پر مبنی تھا، یہ تھا کہ مسلمان ان علوم کو سیکھیں، ان کا مطالعہ کریں اور ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں۔ جو چیز غلط ہے، دلائل سے اس کی تردید کر کے یہ ثابت کریں کہ یہ غلط ہے، جیسا کہ امام رازی، امام غزالی اور علامہ ابن تیمیہ نے اپنے دور میں تردید کر کے یہ ثابت کیا کہ منطق وفلسفے کی فلاں فلاں چیزیں، اصول اور عقائد غلط ہیں اور یہ بات انہوں نے منطق ہی کے دلائل سے غلط ثابت کی۔ جو چیزیں درست تھیں، انہیں اسلامی علوم کی خدمت کے لیے برتا اور

استعمال کیا۔ یہی کام آج مغربی علوم وفنون کے بارے میں کرنا چاہیے۔ ان علوم میں جو عناصر ہمارے نقطہ ہائے نظر سے غلط ہیں، ان کی تردید ان ہی کے دلائل سے کریں۔ اہل علم اور علمائے کرام کے لیے ضروری ہے کہ وہ مغربی علوم وفنون کا تنقیدی انداز میں مطالعہ کریں۔ ان کے پانچ علوم ایسے ہیں، جو اس وقت سب سے زیادہ غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں اور جتنا کفر والحاد اس دور میں پھیلا ہے، وہ اکثر بیش تر ان ہی پانچ علوم کی وجہ سے پیدا ہوا ہے:

۱۔ علم نفسیات
۲۔ علم بشریات
۳۔ علم عمرانیات
۴۔ علم سیاسیات
۵۔ علم معاشیات

علمائے کرام کو ان پانچ علوم وفنون کا مطالعہ کر کے ان میں موجود غلط اساسات وتصورات کی تردید عقلی انداز میں دلائل وشواہد کے ساتھ کرنی چاہیے۔ جو چیزیں درست ہیں، ان سے ہم کو پورا پورا استفادہ کرتے ہوئے مہارت حاصل کرنی چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ان علوم وفنون کے رائج الوقت اسلوب اور طرز استدلال سے کام لے کر ہم اپنے عقائد وتصورات کو آج کی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کریں، تاکہ وہ جدید دنیا کے لیے زیادہ قابل فہم ہوں۔ کیوں کہ ایک عقلی سانچہ پہلے سے ان کے ذہن میں موجود ہے، جس کی بنیاد پر وہ معاملات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اس طرح ان میں عدل وانصاف رکھنے والے لوگ ان سے متاثر ہوں گے اور پھر فکری اخذ وعطا کا عمل شروع ہو جائے گا، جو منطقی علوم اور یونانی ذخیرے کے ساتھ مسلمانوں نے اختیار کیا۔ شروع میں بہت سے مسلمان ان سے متاثر ہوئے، جس طرح آج ہو رہے ہیں۔ آج ان کی کتابیں موجود ہیں۔ آپ اخوان الصفا کی کتابیں دیکھیے، ان میں بڑی مرعوبیت ملتی ہے۔ ابن رشد بڑے فقیہ تھے، لیکن ان کی کتابوں میں بھی یونانی علوم سے مرعوبیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس طرح

کندی جو فیلسوف العرب اور حکیم العرب کہلاتے ہیں، ان کے ہاں مرعوبیت کے خاصے جراثیم ملتے ہیں، جس طرح مرعوبیت کے جراثیم ہمارے ہاں مغربی علوم وفنون کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ عارضی اور وقتی چیز تھی۔ بالآخر معتدل نقطہ ہائے نظر رکھنے والے علمائے کرام کی کاوشیں رنگ لائیں اور دیگر دونوں طبقوں (مخالفین اور مویدین) کا زور گھٹتا چلا گیا۔

مثلاً شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' جو ساری کی ساری منطق وفلسفے سے لب ریز دلائل کی بنیاد پر ہے، اس میں انہوں نے تمام اسلامی تصورات نئے انداز سے مرتب کیے۔ اسی طرح ''الموافقات'' (اصول فقہ کی کتاب) دیکھیے۔ اس کتاب میں امام شاطبی نے شریعت کے اصول منطق سے ثابت کیے ہیں۔ اس میں ایک چیز بھی ایسی نہیں، جو عقلی بنیاد پر ثابت نہ ہوتی ہو۔ کوئی آدمی جو اس زمانے کی روایات کے مطابق عقلیات کا علم بردار ہو، وہ اس کی کسی ایک چیز سے بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح علامہ کاسانی کی کتاب ''بدائع الصنائع'' خالص فقہ کی کتاب ہے، لیکن عقلی انداز میں مرتب کی گئی ہے، اور پڑھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ فقہ حنفی ہو، تفسیر ہو، حدیث ہو، کوئی چیز ایسی نہیں جو انسانی عقل اور فہم سے بالاتر ہو، بل کہ ہر چیز خالصتاً عقل کی بنیاد پر ہے۔ اس سے ایمان میں جو اطمینان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ ہم جیسے کم زور ایمان والوں کے لیے ناگزیر ہے۔ صحابۂ کرام جیسا ایمان ہو تو یہی بات کافی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرما دیا، لیکن ہر شخص تو ایمان ویقین کے اس درجے پر فائز نہیں ہے۔ عام آدمی کا حال تو یہ ہے کہ جب تک آپ اس کو اس کے اپنے اصول موضوعہ کے مطابق عقلی دلائل سے قائل نہیں کریں گے، وہ قائل نہیں ہو گا۔

ان گزارشات کی روشنی میں ہمیں پاکستان میں دینی تعلیم کے مستقبل اور آئندہ کی ضروریات کا جائزہ لے کر وطن عزیز میں دینی تعلیم کے مقاصد واہداف کا تعین پہلے سے واضح طور پر کرلینا چاہیے۔ ہماری رائے میں پاکستان میں دینی تعلیم کے مقاصد واہداف درج ذیل ہونے چاہییں :

۱۔ ایک عام تعلیم یافتہ مسلمان کے لیے ایسی دینی تعلیم کا بندوبست، جو اس کو ایک پابندِ اسلام شہری بنا سکے۔

۲۔ مساجد کے لیے ائمہ اور خطبا کی تیاری۔

۳۔ قرآن پاک کی تعلیم و تدریس کے لیے حفاظ، قرا اور مجودین کی تیاری۔

۴۔ پرائمری اور ثانوی مدارس میں اسلامیات پڑھانے کے لیے مناسب اساتذہ کی تیاری۔

۵۔ غیر ممالک میں تبلیغ اسلام کے لیے مبلغین کی تیاری۔

۶۔ ملکی جامعات میں اسلامیات اور عربی زبان کے شعبوں میں اعلیٰ سطح کی تعلیم و تدریس کے لیے اساتذہ کی تیاری۔

۷۔ دینی تعلیم کے مخصص اداروں میں دینی علوم کے ماہر اساتذہ کی تیاری۔

۸۔ ایسے محقق اہل علم کی تیاری جو دورِ جدید کے تقاضوں سے بہ قدر ضرورت ناقدانہ واقفیت کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم و فنون میں گہری اور ماہرانہ بصیرت رکھتے ہوں اور ملک و ملت کی راہ نمائی اور فکری قیادت کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہوں۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر مقصد کے حصول کے لیے افراد کار اور طلبہ کے انتخاب سے لے کر نصاب تعلیم تک الگ الگ غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی ایک نصاب تعلیم، خواہ وہ کتنا ہی جامع ہو، ان سب مقاصد کو بہ یک وقت پورا نہیں کر سکتا۔ ایک عام مسلمان کے لیے دینی تعلیم کا ایک ایسا مختصر نصاب کافی ہے جو عام دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہفتے میں تین چار گھنٹے کے حساب سے پہلی جماعت سے میٹرک یا ایف اے تک پڑھا دیا جائے یا بالغوں کے لیے روزانہ دو تین گھنٹے کے حساب سے ایک سال یا حد سے حد دو سال میں مکمل ہو جائے۔ ائمہ مساجد کی تیاری کے لیے میٹرک کے بعد دو یا تین سال کا ایسا نصاب، جن میں حفظ و تجوید، ابتدائی عربی، اردو میں تفسیر کی ایک دو کتابیں، حدیث کی ایک دو کتابیں، بہ قدر ضرورت فقہی احکام و مسائل کے ساتھ ساتھ دورِ جدید میں اسلام اور مذہب کے حوالے سے بعض مضامین شامل ہوں۔ اسی طرح دینی تعلیم کے متخصصین و محققین کے

لیے ایک طویل المیعاد اور جامع نصاب کی ضرورت ہو گی، جس میں درس نظامی کی تمام یا کم از کم بیش تر کتب کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے مضامین اور موضوعات شامل کرنے پڑیں گے۔ اس غرض کے لیے آٹھ سالہ درسِ نظامی قطعاً ناکافی ہو گا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ دینی تعلیم کے باب میں جس غور و خوض کی ضرورت پاکستان بننے کے بعد فوراً محسوس کی جانی چاہیے تھی، وہ ابھی تک محسوس نہیں کی گئی۔ تعلیمی مشین کا فولاد نصاب تعلیم ہے اور استاد کی حیثیت اس مشین کو چلانے والے مہندس کی ہے۔ ہمارے ہاں نہ اس دینی تعلیمی مشین کو فولاد میسر ہے اور نہ مہندس۔ ہم ابھی تک اپنی ساری ضروریات کے لیے اس نظام اور نصاب کی بقایاجات پر بھروسا کررہے ہیں، جو درس نظامی نہیں، بل کہ درس نظامی کا محض ایک چربہ ہے۔ اب یہ اس نظام سے نکلنے والے فارغ التحصیل طلبہ کی ذاتی صلاحیت پر ہے کہ وہ مسجد کی امامت پر اکتفا کرتے ہیں یا فکری قیادت سنبھالنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ اول الذکر صورت میں ان کو دست یاب اور حاصل شدہ علمی ذخیرے کا بیش تر حصہ غیر کار آمد محسوس ہوتا ہے، جب کہ ثانی الذکر صورت میں حاصل شدہ ذخیرۂ علم انتہائی ناکافی ثابت ہوتا ہے۔

ایک مثالی نصاب تعلیم وضع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تعلیم کے مقاصد کا حتمی طور پر تعین کر لیا جائے اور پھر کوشش کی جائے کہ وہ مقاصد اور اہداف اس نصاب میں مکمل طور پر منعکس ہوتے ہوں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اکیسویں صدی میں دینی قیادت کے لیے آمادہ حضرات کی غالب اکثریت اکیسویں صدی کے فکری رجحانات سے واقفیت حاصل کرنے کے بہ جائے آٹھویں نویں صدی کے فلسفیانہ مسائل اور عقلی مباحث کے پڑھنے پڑھانے میں اپنا وقت صرف کرتی ہے۔ ایک مثالی نصاب تعلیم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نصاب کے تحت تعلیم پانے والے طلبہ کو مقاصد تعلیم سے سرشار کر دیا جائے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو آج دینی مدارس کے فضلا کی بڑی تعداد جن مقاصد سے سرشار محسوس ہوتی ہے، وہ عمومی ملی اور اسلامی مقاصد نہیں ہیں۔ ان میں بیش تر لوگ گروہی اور فرقہ وارانہ

مقاصد سے سرشار نظر آتے ہیں۔ ان کی سرگرمیوں کا بیش تر ہدف اسلام اور اسلامی فکر کا فروغ نہیں، بل کہ اپنی کسی محترم دینی شخصیت کے انداز فکر کو فروغ دینا اور دوسرے اسالیب فکر پر اس کی برتری جتانا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت دینی مدارس کے نصاب میں بہت سی ایسی کتابیں شامل ہیں، جن سے مضمون کا ذوق طالب علم میں پیدا ہونے کی بہ جائے اس کو لفظی پیچیدگیوں اور عبارت کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا جاتا ہے۔ اس وقت ہزاروں، یا شاید لاکھوں کی تعداد میں ایسے طلبہ موجود ہوں، جو صرف ونحو کی باریکیوں اور شذوذ پر متاخر شارحین اور حاشیہ نویسوں کی موشگافیوں سے تو خوب واقف ہوں گے، لیکن عام صرفی ونحوی اغلاط سے پاک چند فقرے لکھ لینے کی اہلیت سے عاری ہوں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تحریر سنبٹ اور سوال کا بلی اور سوال باسولی کی عبارتیں رٹ لینے سے کون سا دینی یا دنیاوی مقصد حاصل ہو سکتا ہے، اگر طالب علم ایک صفحے کی صحیح عربی عبارت لکھ لینے کی (اور اب تو پڑھ لینے کی بھی) اہلیت نہ رکھتا ہو؟

ایک اچھا نصاب تعلیم طالب علم کو نہ صرف تحقیق اور جستجو کا خوگر بنا دیتا ہے، بل کہ اس میں نئے آفاق علم کے انکشاف کی امنگ بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو آج ہمارا دینی نظام تعلیم بانجھ محسوس ہوتا ہے۔ تحقیق و جستجو کا ذوق نہ عصری جامعات کے فضلا میں نظر آتا ہے اور نہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات میں

یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

اس کی وجہ یہی ہے کہ تعلیم کے مقاصد واہداف نہ جامعات میں واضح ہیں اور نہ دینی مدارس میں۔ یہاں مقصد ملازمت کا حصول ہے اور وہاں امامت وخطابت کا۔ بل کہ مدارس کے طلبہ کو ایک گونہ گویا برتری حاصل ہے کہ اگر کسی موجودہ مسجد میں امامت وخطابت میسر نہ ہو تو امامت و خطابت کی خاطر جہاں بس چلے، نئی مسجد کھڑی کی جا سکتی ہے۔ پھر اس نئی مسجد کے وجود کو جواز پیدا کرنے کی خاطر فقہی اور مسلکی حوالوں کو بہ سہولت مدد کے لیے پکارا جا سکتا ہے اور یوں ہر مسجد اپنے روز آغاز

ہی سے اسلام کا حوالہ بننے کی بہ جائے مسلک کا حوالہ بن جاتی ہے اور امت میں وحدت اور اخوت واخلاق پیدا کرنے کی بہ جائے افتراق اور تشتت کو فروغ دینے پر مجبور ہوتی ہے۔

آزاد اور باا ثر قوموں کا نصاب تعلیم طلبہ میں اپنی تہذیب و تمدن سے گہری وابستگی پیدا کرتا ہے۔ تہذیب و تمدن سے وابستگی کے لیے ضروری ہے کہ نصاب کی تدوین تہذیبی ضروریات کو سامنے رکھ کر کی جائے۔ ایک زندہ تہذیب کے تقاضے زندہ انسانوں کے تقاضوں کی طرح ہوتے ہیں۔ مردہ تہذیب کا مطالعہ ماضی کی تاریخ کی حوالے سے تو کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کو روزمرہ زندگی کے وقائع و حوادث سے ہم آہنگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت ہمارے مذہبی نصاب تعلیم کا بیش تر حصہ ہمارے جدید تہذیبی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن مجید، علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ اور علم کلام کی تعلیم زندہ علوم کے طور پر دی جائے۔ ان کو کسی سابقہ دور کے از کار رفتہ مضمون کے طور پر نہ پڑھایا جائے۔ اس کے یہ معنی ہر گز نہیں ہیں کہ سلف کی تحقیقات اور امت کے متفقہ عقائد کے بارے میں کوئی مصالحانہ رویہ اپنایا جائے۔ بل کہ اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ تمام اسلامی علوم وفنون کو ایک زندہ، مسلسل، رواں، ہر دم دواں اور ہر آن وسعت پزیر علم کے طور پر پڑھا اور پڑھایا جائے۔ اسلامی علوم وفنون کی حیثیت ایک دریائے رواں، بل کہ ایک محیط بے کراں کی ہے، جس کا ہر حصہ اور ہر دور زندگی سے بھرپور اور عصری تقاضوں سے مسلسل ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فکر میں کبھی بھی ماضی اور حال کے درمیان خلا پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا حال ہر وقت ماضی سے اسی طرح وابستہ رہتا ہے، جیسے درخت کی شاخیں اپنے تنے سے اور تنا اپنی جڑ سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس کا حال اس طرح مستقبل کو جنم دیتا رہتا ہے، جیسے ایک ثمر آور اور بارآور درخت کی شاخیں پھل اور پھول پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اسلامی علوم وفنون کے ایسے نصاب کی تیاری ناگزیر ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل کے ایسے ہی رشتوں کی ضمانت دی گئی ہو۔

اکیسویں صدی میں شاید سب سے نمایاں تبدیلی جو تعلیم اور نظام تعلیم کے حوالے سے پیش آنے والی ہے، بل کہ پیش آ رہی ہے، وہ تعلیمی اداروں کے کردار میں بڑھتی ہوئی کمی کا وہ رجحان ہے جو روز بہ روز نمایاں ہوتا چلا جارہا ہے۔ آنے والا دور رسمی تعلیم سے کہیں زیادہ غیر رسمی تعلیم کا دور ہے۔ یہ غیر رسمی تعلیم جو ذرائع ابلاغ سے دن رات برس رہی ہے، ہماری نسلوں کو بری طرح متاثر کر رہی ہے۔ یہ غیر رسمی تعلیم ہر قسم کی جغرافیائی، تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی حدود سے آزاد ہے۔ اس کا کردار روز بہ روز بڑھتا چلا جارہا ہے۔ مستقبل میں تعلیم کے کردار کا تعین اور اس کے اہداف کی نقشہ کشی کرتے ہوئے ابلاغ کے اس ہمہ گیر اور کثیر الجہات کردار سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ اس کے لیے فوری غور وخوض اور گہری منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ معلومات کے اس سیلاب اور افکار و نظریات کے اس طغیان میں اسلامی عقائد و نظریات کا تحفظ کیوں کر کیا جائے اور لا اخلاقیت کے اس سمندر میں گھر جانے والے اخلاقی جزیروں کو پہنائیاں کیسے عطا کی جائیں؟ یہ مستقبل کا سب سے بڑا تعلیمی چیلنج ہے۔

اب پہلی تعلیم گاہ کی حیثیت ماں کی گود کی بہ جائے وی سی آر کو حاصل ہو رہی ہے۔ اب دادی اور نانی کی لوریوں کی جگہ ٹیلی ویژن کے نغمے لے رہے ہیں۔ ان حالات میں اولین ضرورت اس بات کی ہے کہ رسمی اور غیر رسمی تعلیم میں ہم آہنگی کی فضا پیدا کی جائے۔ آج ثقافت، تعلیم اور اطلاعات و معلومات نے مل کر فکر و نظر کی تشکیل میں سب سے بڑے عامل کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ انگریزی استعمار کے دو سو سال اور آزادی کے ابتدائی عشروں تک تعلیم کا بیش تر عمل حکومت کی نگرانی میں بڑی حد تک سرکاری تعلیمی پالیسیوں کے مطابق ہوتا تھا۔ نئے حالات میں یہ عمل اتنا پھیل چکا ہے کہ اب حکومتوں کے لیے اس پر اثر انداز ہونا دن بہ دن مشکل ہوتا چلا جارہا ہے۔ مزید بر آں ہمارا گزشتہ نصف صدی کا تجربہ بھی انتہائی حوصلہ شکن رہا ہے۔ حکومتوں کی روز مرہ سیاست اور افراد کے وقتی مفادات نے مل کر تعلیم اور مقاصد تعلیم کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم اور

ثقافت دونوں کو روزمرہ سیاست اور وقتی مصالح سے الگ کر کے ایک آزاد اور خود مختار شعبے کی حیثیت دے دی جائے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی نے اگر ریاست کے تین شعبے (انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ) قرار دیے تھے تو اکیسویں صدی میں ایک چوتھا شعبہ ثقافت و تعلیم کا بھی قرار دینا چاہیے۔ یہ شعبہ عدلیہ کی طرح آزاد اور اسلام کے ادارۂ وقف کی طرز پر اسی طرح خود مختاری کے ساتھ چلایا جائے، جس طرح ماضی میں چلایا گیا۔ بنوولنٹ فنڈ کی طرح ایک بڑا وقف بنایا جائے جہاں سے تعلیم کے تمام اخراجات پورے کیے جائیں، تعلیم کی مد میں دیے جانے والے ہر قسم کے عطیات اور میزانیے اس بڑے وقف میں اس طرح جمع ہوتے رہیں کہ ہر دینے والے کی شرائط اور خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اس کے دیے ہوئے عطیات کو ان ہی مصارف میں اور ان ہی مقاصد کی خاطر صرف کیا جائے، جن کے لیے وہ عطیات دیے گئے ہوں۔ گزشتہ پندرہ سالوں کے دوران اقراسر چارج کے نام سے جو کھربوں روپیہ وصول ہوا ہے، وہ بھی اس فنڈ کو منتقل کیا جائے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر بڑا تعلیمی ادارہ اور بالخصوص ہر یونی ورسٹی مکمل طور پر خود مختار ہو، جابہ جا ایسے تعلیمی محتسب مقرر ہوں جو عدالتی اختیارات، عالمانہ مقام، تعلیمی مہارت، معاشرتی وقار اور اخلاقی بلندی کے ہتھیاروں سے مسلح ہوں۔ یہ تعلیمی محتسب نہ صرف اس بات کو یقینی بنائیں کہ تعلیم کے ادارے ان مقاصد کی تکمیل کر رہے ہیں جن کی خاطر وہ قائم کیے گئے ہیں، بل کہ یہ بھی دیکھیں کہ تعلیم کی آزادی اور خود مختاری کیوں کر باقی رکھی جاسکتی ہے اور تعلیم و تربیت جیسے پاکیزہ اور خالص پیغمبرانہ مشن کو روزمرہ کے سیاسی مفادات اور وقتی مصلحتوں سے کیسے دور رکھا جائے؟

اسلام کی پوری تاریخ میں تعلیم ہمیشہ مکمل طور پر آزادانہ اور خود مختار رہی ہے۔ اسلام کی علمی اور فکری تاریخ کا سب سے بڑا نشانِ امتیاز نہ صرف علم و فکر اور تعلیم و تعلم ہے، بل کہ قانون و شریعت کا ہر قسم کے سرکاری اور حکومتی اثر ورسوخ سے آزادی اور استقلال بھی ہے۔ خود اسلامی قانون (فقہ) جو مہذب دنیا کی

معلوم ومدون تاریخ کا سب سے جامع، سب سے متوازن اور سب سے کام یاب نظام قانون ہے، بارہ سو سال تک کسی بھی نوعیت کے سرکاری اثرات سے آزاد رہتے ہوئے دنیا کی مہذب ترین سلطنتوں کے قانونی، دستوری، انتظامی اور معاشرتی تقاضے پورے کرتا رہا ہے۔ یہی حال تعلیمی اداروں اور مدارس وجامعات کا رہا۔ ان کا انتظام وانصرام علما کے ہاتھ میں، ان کی تمویل وقف کے ذریعے، ان کی علمی نگرانی اساتذہ کے ہاتھ میں اور عام فلاح وبہبود معاشرے کے مخیر حضرات کے ذمے ہوتی تھی۔ پاکستان کے دینی مدارس بڑی کام یابی کے ساتھ ان ہی روایات کا علم تھامے ہوئے ہیں۔ انہوں نے حکومتی اثرات سے آزاد رہ کر سرکاری خزانے پر بوجھ بنے بغیر ملک کو دینی قیادتیں فراہم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ ان گزارشات کے ضمن میں بعض تنقیدی تبصروں کا مقصد دینی مدارس کے شان دار ماضی اور روشن روایات پر پردہ ڈالنا نہیں، بل کہ ان کو بہتر انداز میں مستقبل کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں تعلیم کا مقصد جمہوریت اور نیشن اسٹیٹ Nation State کے تصورات کو جاگزیں کرنا تھا۔ اس دور میں تمام اجتماعی اور انسانی علوم کی اٹھان ریاست، جمہوریت اور نیشن اسٹیٹ کے تصورات پر تھی، اس لیے اس دور میں سارا مغربی فلسفہ اور تصور تعلیم، بالخصوص وہ تصور تعلیم جس سے مشرق کی غلام اقوام کو مانوس کیا گیا، ان ہی تصورات کی آب یاری کے لیے وقف تھا۔ اس کے برعکس اکیسویں صدی میں مغرب میں تعلیم کے مقاصد (ان کے تصورات کے مطابق) امن، انسانی حقوق اور جمہوریت ہوں گے۔ وہاں آج کل زور وشور سے ان موضوعات پر بین الاقوامی کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔ اکتوبر ۱۹۹۴ء میں جنیوا میں ایک مشہور ادارے انٹرنیشنل کانفرنس آن ایجوکیشن کا اہم اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں یہ طے پایا کہ آئندہ تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعے امن، انسانی حقوق اور جمہوریت کے مقاصد کے لیے کن خطوط پر کام کیا جائے گا۔ اس کانفرنس میں غیر گریزی (زینوفوبیا) تشدد پسندی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے مظاہر وظواہر پر غور کیا گیا۔ آج

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ان بدلتے ہوئے اہداف و تصورات میں ہمیں کون کون سے نئے چیلنج پیش آسکتے ہیں اور ہمیں ان سے نمٹنے کے لیے کیا کرنا پڑے گا؟

خلاصۂ کلام

ان گزارشات کے اختتام سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسے اہم امور اور مقتضیات کی اختصار سے نشان دہی اور اعادہ کر دیا جائے، جو اکیسویں صدی میں ایک مثالی، مثبت اور تعمیری نظام تعلیم کی تربیت، تشکیل کے لیے ضروری ہیں۔ اگر اکیسویں صدی کا پہلا عشرہ ان بنیادی امور کی تکمیل اور فراہمی کے لیے مختص کر دیا جائے تو امید کی جاسکتی ہے کہ ہم اکیسویں صدی کے ربع اول میں اپنے تعلیمی اہداف کو مکمل طور پر حاصل کر لینے میں کام یاب ہو جائیں گے۔

۱۔ مغربی تہذیب اور مغربی علوم و فنون کی تنقید و تنقیح اور مکمل جائزہ (Stock Taking)۔

۲۔ اسلامی بنیادوں پر تمام علوم و فنون کی از سر نو ترتیب و تشکیل اور تعمیر نو۔

۳۔ قدیم علوم و معارف کی تدوین نو، بالخصوص تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اسلامی سیاسیات و دستوریات، اسلامی معاشیات، تصوف اور علم النفس کی تشکیل جدید۔

۴۔ ایک ہمہ گیر اسلامی ثقافتی انقلاب کا آغاز ۲۰۰۱ء سے۔

۵۔ قرآن کی بنیاد پر ایک نئی تہذیب و تمدن کی تعمیر۔

۶۔ علاقائیت اور لسانیت کے حقیقی اور وہمی مسائل کا ادراک اور ایک یک جہت اور ملی نقطۂ نظر کی تشکیل۔ حقیقی مسائل اور مشکلات کو نظر انداز کر کے محض اخوت دینی کے مواعظ سے ملی نقطۂ نظر پیدا نہیں ہو سکتا۔

۷۔ یہود و ہنود کے فتنوں سے باخبری۔

۸۔ فرقہ واریت کے عفریت کا خاتمہ، جو صرف تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

۹۔ اسلامی تنظیمات و تحریکات میں باہم ربط و مفاہمت۔

۱۰۔ ایک بھرپور ترغیبی تحریک یعنی Motivational Campaign، جو عامۃ الناس کو نئے کردار کے لیے تیار کرے۔ آج دوبارہ تحریک پاکستان کی فضا پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ آج ایک بار پھر تحریک خلافت کے لیے جذبے کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ان دس اقدامات کے لیے درج ذیل دس رہ نما اصولوں کی پاس داری ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ ان دس اصولوں کو اکیسویں صدی میں دنیائے اسلام کی تعلیم اور اس کی آئندہ ضروریات کے دس اہم ابواب کا عنوان قرار دیا جاسکتا ہے:

ا۔ تنسیق:

ان گزارشات میں جو کچھ عرض کیا گیا، وہ بہ ظاہر ایک بہت بڑا اور ناقابل حصول ہدف معلوم ہوتا ہے۔ اس ہدف تک پہنچنے کے لیے جن وسائل اور افراد کار کی ضرورت ہے، ان کی فراہمی کے بارے میں اندازے متفاوت ہو سکتے ہیں، لیکن اگر اس میدان میں کام کرنے والے سب نہیں تو اکثر اداروں اور افراد کے درمیان آپس میں رابطہ، تنسیق اور تقسیم کار ہو جائے تو بہت کم وسائل سے یہ سارے کام کیے جاسکتے ہیں۔ جہاں یہ طرز عمل غیر حقیقت پسندانہ ہے کہ یہ سب کام صرف حکومت کو کرنے چاہییں اور حکومت ہی کی بنیادی ذمے داری میں شامل ہیں، وہاں یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اس پورے عمل میں حکومت کی ذمے داری محض جزوی یا جانبی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک معیاری اور مثالی نظام تعلیم کی تدوین من حیث القوم ہم سب کی ذمے داری ہے اور حکومتوں، تعلیمی اداروں، دانش وروں، ماہرین تعلیم، اہل علم، سماجی تنظیموں اور علمائے دین، سب کو باہمی مشاورت اور تقسیم کار کے ذریعے ان اہداف کو حاصل کرنا چاہیے۔

۲۔ تدریج:

مذکورہ بالا گزارشات میں علوم و فنون کی تدوین نو اور مغربی افکار و نظریات کی تنقید و تطہیر کے بارے میں بالخصوص جو کچھ عرض کیا گیا، وہ ایک تدریجی عمل کا متقاضی ہے۔ جب تک اس عمل کا ابتدائی مرحلہ مکمل نہ ہو، درمیانی مراحل پر عمل

کرنا دشوار ہے۔ اسی طرح جب تک درمیانی مراحل تکمیل کے قریب نہ پہنچ جائیں، اس وقت تک انتہائی مراحل کی طرف قدم اٹھانا بہت مشکل ہوگا، اس لیے اس میدان میں کام کرنے کے لیے اہل علم اور ماہرین تعلیم کو تدریج کا فطری اور اسلامی اصول پیش نظر رکھنا چاہیے۔ یوں بھی اصلاحات کا عمل قوم کی سکت اور قبولیت کی سطح کو پیش نظر رکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ بہ یک وقت ہر میدان میں تبدیلی کی خواہش تو فی نفسہ اچھی بات ہے، لیکن اس کے نتیجے میں ایک ایسی بد نظمی اور افراتفری جنم لے سکتی ہے جس سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو جائے گا، لہٰذا اس پورے کام کو مختلف مدارج اور مراحل میں تقسیم کرنا ناگزیر ہے۔

۳۔ توازن:

نظام تعلیم کی تشکیل نو ایک انتہائی پیچیدہ، مشکل، اہم اور ضروری امر ہے۔ تعلیم کے تقاضے اتنے ہی متنوع ہیں، جتنی خود انسانی زندگی کے نمونے اور انسانی شخصیتوں، مزاجوں اور معاشروں کا تنوع۔ انسان کا مزاج اور خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنے ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اور ہر چیز کا فیصلہ اپنی ذات پر قیاس کر کے کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی کے مختلف تقاضوں کے مابین توازن مختل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی خاص علم و فن کے ماہرین کی رائے میں ان کے میدانِ اختصاص کو جو اہمیت حاصل ہونی چاہیے، وہ دوسرے کسی اختصاص کو حاصل نہیں۔ اس رویے کا، جو ایک حد تک فطری ہے، یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بہت سے معاملات عدم توازن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تعلیم کے باب میں اس عدمِ توازن سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اجتماعی اور لسانی علوم، فنی تعلیم، دینی تعلیم و تربیت اور فنی اور سائنسی تعلیم کے مابین توازن کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ ان میں سے اگر کسی ایک اختصاص کی قیمت پر دوسرے تخصصات کو پروان چڑھایا جائے گا تو عدمِ توازن کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

۴۔ واقعیت پسندی:

تعلیمی اصلاحات کا حصول اور ایک معیاری مثالی نظام تعلیم کی تشکیل ایک ایسا

عظیم الشان نصب العین اور بلند آئیڈیل ہے، جس کے حصول کے لیے طویل اجتماعی کاوشیں درکار ہیں۔ بعض اوقات اس نصب العین کی بلندی کی وجہ سے کچھ لوگ ہمت ہار سکتے ہیں اور کچھ اور لوگ اس نصب العین کو سرے سے ناقابل حصول بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اس صورت حال کا منفی نتیجہ ہدف کی طرف ایک موثر اور مثبت پیش رفت کے رک جانے کی شکل میں بھی نکل سکتا ہے۔ ان حالات میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ جہاں ہدف کی بلندی اور نصب العین کی رفعت کے بارے میں کوئی مصالحت نہ کی جائے، وہاں واقعیت پسندی، عملی تقاضوں اور زمینی حقائق سے بھی صرف نظر نہ کیا جائے۔ زمینی حقائق سے صرف نظر کر کے محض نظری پیش رفت کسی مثبت نتیجے تک مشکل ہی سے پہنچا سکتی ہے۔ زمینی حقائق دنیائے اسلام کے مختلف ممالک میں مختلف ہو سکتے ہیں اور ان کے لحاظ سے تفصیلات کے تعین اور مدارج و مراحل کی ترتیب میں بھی جزوی طور پر فرق ہو سکتا ہے۔

۵۔ جامعیت:

کسی بھی مثالی اور متوازن نظام تعلیم کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ ان تمام پہلوؤں کا جامع ہو جو ایک متوازن انسانی شخصیت کی تشکیل کے لیے ضروری ہیں۔ خاص طور پر ایک مسلم معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کے لیے یہ بات ناگزیر ہو گی کہ اس کے لیے تعلیم کا جو نظام بھی اختیار کیا جائے، وہ جہاں دین و دنیا کی جامعیت رکھتا ہو، وہاں اس میں سائنسی، فنی، اجتماعی اور انسانی علوم وفنون کی تمام ضروریات کو جامعیت اور توازن کے ساتھ سمویا گیا ہو۔ اگر جامعیت کے ان تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ایک نامکمل شخصیت جنم لیتی ہے اور نامکمل شخصیتوں سے جو معاشرہ وجود میں آتا ہے، وہ بھی اس عدمِ تکمیل کی وجہ سے بہت سے نقائص کا شکار رہتا ہے۔

۶۔ تعمق:

دورِ جدید بڑی حد تک مظاہر پر زور دینے اور ظاہری آب و تاب کو اہمیت دینے کا دور ہے۔ اس ظاہر پرستی کا ایک نتیجہ مشرقی ممالک میں یہ نکلا ہے کہ معاملات کو

سنجیدگی اور گہرائی سے ساتھ لے کر ان پر غور کرنے یا فیصلہ کرنے کا رجحان کم زور پڑتا جارہا ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام میں عموماً تعمق اور گہرائی پیدا کرنے کا ذوق اور جذبہ دن بہ دن کم زور پڑتا جارہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ آئے دن نصابی کتابوں میں غیر ضروری تبدیلی اور سہولت پسندی بھی ہے۔ یقیناً تسہیل اور آسانی پیدا کرنا اچھی چیز ہے، بالخصوص نو آموزوں کے لیے تسہیل ناگزیر ہے، لیکن تسہیل کے نام پر سطحیت کو فروغ دینے سے تعلیم کا معیار تیزی سے گرتا جارہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تسہیل اور تعمق کے تقاضوں میں توازن پیدا کیا جائے، تسہیل کو صرف ابتدائی اور ثانوی تعلیم تک محدود رکھا جائے، اور اعلیٰ تعلیم بالخصوص تحقیقی سطح پر کسی قسم کی سطحیت کو در آنے کی اجازت نہ دی جائے۔

گزشتہ چند عشروں کے دوران ہماری جامعات میں جو تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں، ان کی بڑی تعداد تعمق سے عاری اور سطحیت کا شکار ہے۔ آج دنیا کی بیش تر یونی ورسٹیوں میں دنیائے اسلام کی بہت سی ڈگریوں کو بالعموم اور پاکستانی جامعات کی ڈگریوں کو بالخصوص تسلیم کرنے میں تامل سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ ہمارے ہاں تحقیق کے نام پر سطحیت کا فروغ ہے۔

۷۔ تخصص:

اعلیٰ تعلیم کی سطح پر تعمق کے ساتھ ساتھ جس چیز کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے، وہ تخصص ہے۔ آج کل علوم و فنون کا دائرہ اتنا پھیل گیا ہے کہ کسی ایک شخص کے لیے بہت سے علوم تو در کنار، کسی ایک میدان میں بھی حقیقی اختصاص پیدا کرنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔ ہماری بیش تر جامعات اور اعلیٰ دینی علوم کے اداروں کا نصاب اس انداز کا چلا آرہا ہے کہ اس سے عمومی انداز کے اہل علم (Generalist) تو پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن متخصصین کا پیدا ہونا بڑا دشوار ہے۔ اجتماعی علوم کے میدان میں ہماری بہت سی یونی ورسٹیوں کے نصابات چالیس چالیس اور پچاس پچاس سال پرانے ہیں۔ آج ان میدانوں میں بے شمار نئے نئے اختصاصات سامنے آگئے ہیں، جن پر ابھی تک پوری توجہ نہیں دی جا سکی۔

دینی تعلیم میں عمومیت کا یہ رنگ اور بھی گہرا ہے۔ درس نظامی کسی بھی میدان میں متخصصین پیدا کرنے کے لیے مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، اس کا مقصد نچلی سطح کے منصفین، عدالتی کارکن اور نیم عدالتی انتظامی افسران پیدا کرنا تھا۔ تاہم اس نصاب میں اتنی جان تھی کہ اس کو پڑھ کر اگر کوئی از خود اپنی محنت سے کسی خاص فن میں تخصص حاصل کرنا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا تھا۔ گزشتہ چند عشروں کے دوران بعض دینی اداروں میں تخصص اور تکمیل کے شعبے قائم کیے گئے ہیں، لیکن وہ ابھی تک مطلوبہ نتائج نہیں دے سکے۔ ان حالات میں متخصصینِ عالم کے روبہ رو کسی معاملے میں اسلام اور مسلمانوں کا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آئندہ آنے والے عشروں میں تخصص کے تقاضوں پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔

۸۔ توسع:

اسلام کا مزاج بین الاقوامی اور بین الانسانی ہے۔ امت مسلمہ ایک ایسی عالم گیر مسلم برادری ہے جو رنگ، نسل اور علاقائی امتیازات سے پاک ہونی چاہیے۔ مزید برآں مستقبل میں درپیش مسائل اور چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ امت مسلمہ ایک ایسے رویے کو اختیار کرے، جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچنا اور زیادہ سے زیادہ اقوام و ملل تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہو۔ مستقبل میں جن کثیر العناصر نظام کی بات کی جا رہی ہے، اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بھی توسع کا رویہ ناگزیر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عالم گیریت کے لیے توسع ناگزیر ہے۔ فرقہ وارانہ، فقہی، علاقائی اور لسانی تنگ نائیوں سے بلند ہو کر توسع اختیار کرنا ایک اعتبار سے مسلمانوں کی دینی ذمے داری ہے۔

۹۔ توسیع:

جدید دنیائے اسلام کے بالعموم اور پاکستان کے بالخصوص تعلیمی مسائل پر نظر رکھنے والوں پر یہ امر مخفی نہیں ہے کہ تعلیم میں اس وقت ان کا درجہ کیا ہے اور فنی مہارت اور تحقیق کی دنیا میں وہ کہاں کھڑے ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، جدید

سائنسی تحقیق کے بیسیوں، بل کہ شاید سیکڑوں میدان ایسے ہیں، جہاں دنیائے اسلام کو مہارتوں کے حصول سے روکا جارہا ہے۔ اگر یہ صورت حال جاری رہی تو بہت جلد وہ مرحلہ آسکتا ہے کہ ہم تحقیق و مہارت کی وہ سطح بھی برقرار نہ رکھ سکیں، جو آج ہمیں حاصل ہے۔ ان حالات میں اس امر کی فوری ضرورت ہے کہ دست یاب تحقیقی وسائل اور مہارتوں کی موجودہ سطح کو وسیع کیا جائے اور دنیائے اسلام کے جس ملک میں جو تحقیقی سہولت میسر ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ توسیع کی جائے۔ اس کام کے لیے نہ صرف دست یاب وسائل کو مجتمع کرنے کی ضرورت ہے، بل کہ موجودہ وسائل کے بہتر سے بہتر اور زیادہ استعمال کو یقینی بنانا بھی ضروری ہے۔ یہ مقصد وسائل کے اجتماع اور سہولتوں میں توسیع کرکے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

۱۰۔ تکمیل:

دنیائے اسلام کے جن علاقوں اور ممالک میں تعلیم و تحقیق کی سہولتیں کم، نایاب یا ناپید ہیں، ان کو یہ سہولتیں فراہم کرنا اور ناقص سہولتوں کو مکمل کرنا ناگزیر ہے۔ جب تک ہماری کاوشیں ایک دوسرے کی تکمیل نہیں کریں گی، اس وقت تک ان بڑے مقاصد کا حصول ناممکن رہے گا۔

ایک نئے اور مثالی اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل و ترتیب اور تدوین و تنفیذ آسان کام نہیں۔ یہ عمل ایک طویل اور اجتماعی غور و خوض کا متقاضی ہے۔ اس عمل کے لیے ملک و ملت کے تمام ارباب بصیرت کی اجتماعی کاوشیں درکار ہیں۔ یہ ذمے داری اہل پاکستان کے لیے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ نہ صرف پوری امت مسلمہ، بل کہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے جواب دہ ہیں۔ اگر اہل پاکستان نے اس معاملے میں کوتاہی کی تو آئندہ نسلوں کی گم راہی بل کہ ارتداد کا بار ان کی گردنوں پر رہے گا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کام کو کرنے کے لیے چوں کہ نسلیں درکار ہیں، اس لیے حوصلہ ہار دینا چاہیے۔ نہ اس کے لیے نسلیں درکار ہیں اور نہ حوصلہ ہارنے کی ضرورت ہے۔ اصل چیز طلب اور امید ہے، جس کے نتیجے میں تائید الٰہی کا نزول ہوتا ہے:

وادیٔ عشق بسے دور ودراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے
در طلب کوش ومدہ دامن امید زدست
دولتے ہست کہ یابی سر راہے گاہے

ممکن ہے ان گزارشات میں سوزو غم، آہ وفغاں اور درد واندوہ کی آمیزش ضرورت سے زیادہ محسوس ہو۔ اگر فی الواقع ایسا ہے تو اس کی وجہ شدتِ احساس ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ اگر فوری طور پر اقدام نہ کیا گیا تو یہ قافلہ جس دوراہے پر کھڑا ہے اور جہاں سے وہ کعبے کے بہ جائے ترکستان، بل کہ فرنگستان کی منزل پر پہنچنا چاہتا ہے، وہاں سے اس کی واپسی ناممکن ہو جائے گی اور پھر؟ پھر دنیائے اسلام کے بیش تر حصے پر اسی طرح فاتحہ پڑھ لینے کی نوبت آسکتی ہے جس طرح اندلس اور مشرقی یورپ کے مسلمانوں پر عرصہ ہوا پڑھی جا چکی، جس طرح جنوبی امریکا، تاتارستان اور سائبیریا میں لاکھوں مسلمانوں اور اب نئی تحقیقات کے مطابق خود ریاست ہائے متحدہ امریکا میں لاکھوں مسلمانوں کا وجود مٹ چکا۔ خدا نہ کرے دنیائے اسلام کے اور بہت سے علاقوں میں یہی منظر دہرایا جائے۔ یہ منظر اتنا تکلیف دہ ہے کہ اس کے تصور ہی سے احساس میں شدت، تحریر میں تیزی اور اسلوب میں سوزش پیدا ہونے لگتی ہے۔

نوائے من ازاں پرسوزوبے باک وغم انگیز است
بخاشا کم شرار افتاد و باد صبح دم تیز است

مغرب کا فکری اور تہذیبی چیلنج اور علما کی ذمے داریاں

۲ جنوری ۲۰۰۵ء کو الشریعہ اکادمی گجراں والا میں

''دینی مدارس میں عمرانی علوم کی تدریس: ضرورت اور اہمیت''

کے زیر عنوان منعقد ہونے والی فکری نشست سے خطاب

مغرب کا فکری اور تہذیبی چیلنج

اور علما کی ذمے داریاں

برادرانِ محترم!

اس وقت دنیائے اسلام جس دور سے گزر رہی ہے، یہ دور اسلام کی تاریخ کا انتہائی مشکل دور ہے۔ امت مسلمہ کو جو مشکلات آج درپیش ہیں، شاید ماضی میں اتنی مشکلات کبھی درپیش نہیں ہوئیں۔ یوں تو ایک اعتبار سے امت مسلمہ کی پوری تاریخ بحرانوں کی تاریخ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ نبوت کے آغاز سے لے کر، جب آپ دارارقم میں قیام فرماتے، آج تک کوئی صدی اور صدی کا کوئی حصہ یا کوئی عشرہ ایسا نہیں گزرا، جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ اس میں مسلمانوں کو کوئی مشکل درپیش نہیں تھی۔ لیکن ان ساری مشکلات میں اور آج کی مشکل، بل کہ امہات المشاکل میں ایک بڑا بنیادی فرق پایا جاتا ہے، جس کو اس گفت گو میں سامنے رکھنا چاہیے۔ ماضی قریب یا ماضی بعید میں دنیائے اسلام کو جو مشکلات اور پریشانیاں ہوتی تھیں، وہ عموماً زندگی کے کسی ایک گوشے تک محدود ہوتی تھیں۔ مسلمانوں کو عسکری اعتبار سے کسی دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا، پیچھے ہٹنا پڑا، پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ یہ ایک عسکری شکست یا عسکری ہزیمت کا معاملہ تھا۔ یا کہیں مسلمانوں کی کوئی حکومت کم زور ہوئی، غیر ملکی قوتیں مضبوط ہو گئیں اور مسلمان سیاسی طور پر پس ماندگی کا

شکار ہوئے، یہ سیاسی میدان میں کم زوری تھی۔ اس طرح کی کم زوریاں جو عموماً سیاسی، مالی، عسکری یا مادی ہوتی تھیں، تقریباً ہر دور میں پیش آتی رہیں، لیکن ان سب مشکلات سے مسلمان عہدہ بر آ ہوتے رہے۔ ان میں سے کسی مشکل نے مسلمانوں کو ذہنی یا اعصابی شکست سے دوچار نہیں کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان سارے ادوار میں مسلمانوں کا خاندان، مسلمانوں کی تعلیم، مسلمانوں کا نظام تربیت اور مسلمانوں کی جو اندرونی ساخت اور تشکیل (Internal Fabric) تھی، وہ اکثر و بیش تر بیرونی خطرات اور حملوں سے محفوظ رہی۔ تاتاریوں کے حملے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیائے اسلام پر اس سے برا وقت کوئی نہیں آیا، اور یقیناً وہ بہت برا وقت تھا کہ افغانستان کے مشرقی علاقوں، بل کہ منگولیا کی حدود سے لے کر مصر تک اور ترکی کے جنوبی علاقوں سے لے کر جزیرۃ العرب کے وسط تک، یہ سارا علاقہ تاتاریوں کی تاخت و تاراج کی آماج گاہ تھا۔ انہوں نے ہزاروں علمائے کرام کو شہید کیا اور بڑے بڑے جید ترین اکابر اسلام ان کی تلوار کا نشانہ بنے۔ خواجہ فرید الدین عطار، جن کے بارے میں مولانا رومؒ نے فرمایا:

عطار روح بود وسنائی دو چشم او
ما از پئے سنائی وعطار آمدیم

اس درجے کے انسان کہ جن کی پیروی پر مولانا روم جیسے آدمی نے فخر کا اظہار کیا ہے، ایسے اونچے اونچے لوگ تاتاریوں کی تلوار کا شکار ہوئے۔ کتب خانے انہوں نے جلا دیے، شہر برباد کر دیے، یہاں تک کہ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور کتاب البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی شکست خوردگی اور پست ہمتی کا یہ عالم تھا کہ:

اذا قیل لك ان التاتار انهزموا فلا تصدق

اگر تمھیں یہ خبر دی جائے کہ تاتاریوں کو شکست ہو گئی ہے تو اس پر یقین نہ کرو۔

گویا تاتاریوں کی شکست ناقابل تصور سمجھی جاتی تھی اور یہ بات ضرب المثل بن

گئی تھی۔ لیکن اس ساری تباہی اور بربادی کے باوجود تاتاریوں کی شکست و ریخت کا دار و مدار سارا کا سارا مسلمانوں کی عسکری اور سیاسی کمزوری پر تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے منتشر اور غیر متحد دیکھا تو اس سے فائدہ اٹھایا۔ عسکری اعتبار سے کمزور پا کر نقصان پہنچایا۔ اس سے زیادہ تاتاری کچھ نہ کر سکے۔ ان کے پاس کوئی دین نہیں تھا، کوئی پیغام نہیں تھا، کوئی تہذیب نہیں تھی، کوئی مذہب نہیں تھا، کوئی فکری یا تہذیبی ایجنڈا نہیں تھا، اس لیے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، تربیت اور خاندانی نظام ان کے حملوں سے محفوظ رہا اور ان میں سے کوئی چیز متاثر نہیں ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی اندرونی قوت نے ان کو سنبھالا دیا۔ مسلمان عوام نے اہل دل اور اہل درد مصلحین کا ساتھ دیا اور بہت جلد وہ تاتاریوں کی شکست کے نتائج اور ثمراتِ بد سے نکلنے میں کام یاب ہو گئے۔ یہی کیفیت بقیہ بہت سے معاملات کی بھی رہی۔

آج جو صورت حال درپیش ہے، اور آج سے نہیں، پچھلے ڈیڑھ سو سال سے درپیش ہے، وہ یہ ہے کہ ہر آنے والا دن، ہر آنے والی رات، بل کہ اب تو آنے والا ہر لمحہ خطرے کی یا پریشانی کی ایک نئی جہت لے کر آتا ہے۔ آج اسلامی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو خطرات سے دوچار نہ ہو۔ فرد کے ذاتی کردار اور تربیت کا معاملہ ہو، گھر کے اندر ماں اور بچوں کے درمیان کے امور ہوں، میاں بیوی کے تعلقات کا سوال ہو، گھر کی خواتین کے رویے کا معاملہ ہو، تعلیم و تربیت کا معاملہ ہو، یا مساجد کے اندر جاری سرگرمیوں اور معمولات کا سوال ہو، ان میں سے ہر چیز آج بہ راہِ راست مغربی حملے کی زد میں ہے۔ تاتاریوں نے شاید کبھی یہ نہیں پوچھا ہو گا کہ جامعہ ازہر میں کیا پڑھایا جا رہا ہے؟ مسلمانوں کی نصاب کی کتابوں میں کیا لکھا جا رہا ہے یا فقہ کی کتابوں میں کیا لکھا ہے؟ انہوں نے کبھی یہ چیز زیر بحث لانے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح انگریز جب شروع میں یہاں آئے تو انہوں نے بھی ان معاملات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ جہاں جہاں گئے، وہاں مسیحی پادریوں کی حوصلہ افزائی کی، مغربی تعلیم کے اداروں کی سرپرستی کی، مغربی تہذیب کے رنگ میں

رنگ جانے والوں کو طرح طرح سے نوازا، لیکن اس حد سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کی داخلی زندگی، مذہبی امور اور مذہبی تعلیم میں بہ راہِ راست مداخلت اور زبردستی نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز کے ڈیڑھ دو سو سال یہاں رہنے کے باوجود مسلمانوں کی اندرونی ساخت بڑی حد تک مغربی اثرات سے محفوظ رہی اور ایسے لوگ ہزاروں نہیں، بل کہ لاکھوں کروڑوں تھے، جن کی زندگی کا ایک لمحہ یا ایک گوشہ بھی انگریزی اثرات سے متاثر نہیں ہوا۔

میرے خاندان کے ایک بزرگ تھے، حافظ محمد اسماعیل جو بڑے عالم اور محدث تھے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے والد تھے اور رشتے میں میرے والد کے پھوپھا تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کسی انگریز کی شکل نہیں دیکھی، انگریزی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا اور اپنے گھر میں کسی کو انگریزی کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ہندوستان میں پہلے شاید ٹماٹر نہیں ہوتا تھا، بعد میں جب یہاں ٹماٹر آیا تو یہ لفظ شاید انگریزی کے Tomato کی اردو شکل تھی۔ حافظ اسماعیل صاحب ٹماٹر کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی یہ لفظ بولتا تھا تو اس پر ناخوشی کا اظہار کرتے تھے۔ انہوں نے اس کا نام لال بینگن رکھا ہوا تھا۔ میرے والد صاحب بتاتے تھے کہ ایک دن گھر میں انہوں نے پوچھا کہ سالن میں کیا ڈالا ہے؟ ان سے کہا گیا کہ ٹماٹر ڈالا ہے تو وہ سخت ناراض ہوئے کہ نصرانیت میرے گھر میں گھس آئی۔ اس کو لال بینگن کیوں نہیں کہتے؟

بہ ظاہر یہ بات آج ہمیں لطیفہ معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر مسلمانوں میں کچھ لوگ اتنی شدت کے ساتھ مغربی اثرات میں رکاوٹ پیدا نہ کرتے تو مغربی اثرات آج سے سو سال پہلے اسی طرح لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے، جس طرح آج ہر جگہ گھستے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔ اس طرح کی مثالیں ایک دو نہیں، ہزاروں ہیں اور سیکڑوں، لاکھوں، بل کہ کروڑوں انسان ایسے ہیں، جنہوں نے مغربی اثرات کے خلاف مزاحمت کی اور مسلمانوں کو ان سے محفوظ رکھنے کی سعی کی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ انہوں نے مغرب کی مثبت چیزوں کو بھی رد کا۔ یقیناً بعض باتیں مغرب

میں مثبت بھی تھیں، جن کے بہت سے ثمرات سے مسلمان محروم رہے، لیکن آج یہ بات کہنا اور تبصرہ کرنا تو بڑا آسان ہے کہ فلاں بزرگ نے فلاں چیز پر پابندی لگا دی تھی اور فلاں شخص نے مغربی اثرات کے ثمرات سے مسلمانوں کو محروم رکھا، لیکن آج سے دو ڈیڑھ سو سال پہلے کے ماحول میں جو انسان خود کو طوفان کے سامنے کھڑا محسوس کرتا ہے، طوفان اس کو امنڈتا ہوا دکھائی دے رہا ہے، اپنا گھر اور وطن تباہ ہوتا اس کو نظر آرہا ہے اور اس طوفان کے نتائج و عواقب اس کے سامنے ہیں، وہ حالات کا جائزہ لے کر فوری طور پر ایک فیصلہ کرلے اور اس فیصلے کے نتیجے میں بعض منفی اور بیش تر مثبت چیزیں سامنے آئیں تو آج ہم یہ طے کرنے میں حق بہ جانب نہیں ہیں کہ فیصلہ کرنے والے کو کیا فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ ویسے بھی لو (اے کاش) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ ماضی میں جس نے کوئی فیصلہ کیا، اس نے اس کی ذمے داری بھی لی۔ بعض لوگوں نے ایک فیصلہ کیا تو بعض نے دوسرا۔ دونوں کے ثمرات و نتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔ ہم نتائج پر تو بات کرسکتے ہیں، لیکن ماضی کو مستقبل کی طرف سے مشورہ دینا کہ ان کو کیا کرنا چاہیے تھا، یہ ایک غیر ضروری مشورہ ہے، جس کا کوئی نتیجہ مستقبل میں نکلنے والا نہیں۔ البتہ ہم ماضی کے اس تجربے سے مستقبل کے بارے میں بہتر فیصلہ کرسکتے ہیں۔ وہ آج ہمیں کرلینا چاہیے۔

آج کی صورت حال یہ ہے کہ جن حضرات نے ڈیڑھ سو سال پہلے امت مسلمہ کو مغرب کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی، وہ سب اپنا اپنا کام کرکے دنیا سے جاچکے۔ انہوں نے جو جذبہ پیدا کیا، جس رویے کو جنم دیا، وہ جذبہ اور رویہ آج کم زور پڑ گیا ہے اور آج مغرب کے تہذیبی، ثقافتی، فکری، حتیٰ کہ مذہبی اثرات کے لیے مسلمانوں کے ہر گھر کے دروازے اور ہر کمرے کی کھڑکیاں اس طرح کھلی ہیں کہ اس میں مغرب کے کسی اچھے یا برے اثرات یا نتائج کو داخل ہونے سے روکنا آسان نہیں رہا۔ ہمارے ہاں بہت سے حضرات کا یہ خیال ہے کہ مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں کو ہمیں اپنے اندر آنے کا موقع دینا چاہیے اور اس کے منفی اثرات کا

راستہ روکنا چاہیے۔ اگرچہ یہ رائے رکھنے والوں میں اس پر اتفاق رائے نہیں ہے کہ مغرب کے کون سے اثرات و ثمرات مثبت ہیں اور کون سے منفی، لیکن اصولی طور پر یہ ایک درست رویہ ہے اور ہر صاحب بصیرت مسلمان اس سے اتفاق کرے گا۔ یہ **خذ ما صفا ودع ما کدر** کا اسلامی اصول ہے، جس سے مسلمانوں نے ہمیشہ اتفاق کیا اور جو مسلمانوں کی فکری اور علمی تاریخ کا ہمیشہ طرۂ امتیاز رہا ہے، لیکن ہم میں سے بہت سے لوگ یہ اندازہ نہیں کر پاتے کہ کیا مغرب کا ایجنڈا بھی یہی ہے کہ ہم **خذ ما صفا ودع ما کدر** پر عمل کریں۔ جو چیز ہمارے لیے قابل قبول ہو، وہ ہمارے سامنے پلیٹ میں رکھ کر پیش کر دیں اور جو چیز ہمارے لیے قابل قبول نہ ہو، اس کو واپس اپنی الماری میں رکھ دیں؟ حقیقت یہ ہے کہ مغرب اس انتخاب واختیار کے رویے سے اتفاق نہیں کرتا۔ وہ اپنا پورا ایجنڈا یہاں لانا چاہتا ہے اور انہوں نے ہم سے زیادہ اس مسئلے پر غور کیا ہے کہ ان کی تہذیب کا جو پورا پیکج ہے، اس کی کون سی چیزیں اس پر منفی اثرات مرتب کر سکتی ہیں۔ اس پر باقاعدہ تحقیقات کی گئی ہیں، کتابیں لکھی گئی ہیں اور صرف عام سطح پر نہیں، بل کہ بڑی سے بڑی اور اعلیٰ سے اعلیٰ سطح پر اس پر غور و خوض ہوا ہے۔ حتیٰ کہ خالص سیاسی قائدین بھی ان فکری اور تہذیبی مسائل پر سوچتے اور اظہار خیال کرتے رہے ہیں۔ اگر آپ نے سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن کی کتاب **Seize the Moment** پڑھی ہو تو آپ کو یاد ہو گا کہ اس میں اس نے پوری تفصیل سے یہ بات بیان کی ہے کہ دنیائے اسلام میں مغربی اثرات کا نفوذ کس حد تک ہے اور کس طرح ہونا چاہیے۔ یہ بات نہ صرف نکسن نے لکھی ہے، بل کہ ان کے صف اول کے تمام دانش ور، مفکرین اور مدبرین یہ بات لکھ رہے ہیں۔

آج سے چند سال پہلے مجھے جرمنی میں ایک اجتماع میں جانے کا موقع ملا، جس میں مختلف ممالک کے دانش ور اور مفکرین مدعو کیے گئے تھے، جن میں واحد مسلمان شریک غالباً میں تھا۔ میرے علاوہ باقی لوگ مغربی یورپ اور خاص طور پر وسطی یورپ سے بلائے گئے تھے۔ اس اجتماع کا عنوان تھا: **Is Islam a threat to Western**

Europe? (کیا اسلام مغربی یورپ کے لیے ایک خطرہ ہے؟) جرمنی کے ایک علمی اور تحقیقی ادارے نے مجھے بلایا تھا کہ میں بھی اس موضوع پر مسلمانوں کی طرف سے اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ یہ کوئی ایک ہفتے کی نشست تھی، جس میں انہوں نے چودہ آدمیوں کو اپنے خیالات وافکار کو تفصیل سے پیش کرنے کی دعوت دی تھی۔ ایک دن میں دو آدمیوں کی گفت گو ہوتی تھی، جس میں ہر شخص تفصیل سے اپنے خیالات حاضرین کے سامنے پیش کرتا تھا۔ ان خیالات پر بھرپور بحث و تمحیص اور تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ اس میں ایک دن مجھے بھی گفت گو کرنے کا موقع ملا، جس میں یہ سوال سامنے آیا کہ دنیائے اسلام میں مغربی اثرات کے حوالے سے کیا رویہ رہا ہے؟ اس کے جواب میں، میں نے کہا کہ عالم اسلام میں جب سے مغربی اثرات آئے ہیں، جس کو کم وبیش دو سو سال کا عرصہ ہو چکا ہے، اس کے بارے میں دنیائے اسلام نے تین رویے اختیار کیے ہیں۔ ان میں سے دو رویے تو بہ تدریج کم زور ہو رہے ہیں یا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ کم زور ہو رہے ہیں، اور تیسرا رویہ بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اس میں پچھلے پچاس، سو سالوں میں نسبتاً زیادہ قوت پیدا ہوئی ہے۔

ایک رویہ جو سمٹ رہا ہے اور سمٹتے سمٹتے یقیناً ختم ہونے کے قریب ہے، وہ ہے جس کی مثال میں نے لال بینگن اور ٹماٹر کے حوالے سے دی۔ اب شاید دنیائے اسلام میں اس طرح کی مزاحمت کرنے والے لوگ موجود نہیں، بل کہ اس طرح کی مزاحمت کی افادیت کے قائل بھی میں سمجھتا ہوں کہ نہیں رہے۔ اگر ہیں تو بہت تھوڑے لوگ ہیں، جن کا کوئی قابل ذکر اثر معاشرے میں نہیں ہے۔ یہ وہ رویہ تھا جو ابتدا میں بہت مضبوط تھا، لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ ختم یا بہت کم زور ہوتا گیا۔

دوسرا رویہ جو شروع میں بہت قوت سے سامنے آتا محسوس ہوتا تھا، مسلمانوں کی اکثریت نے اس سے بھی زیادہ اتفاق نہیں کیا اور یہ رویہ بھی، جس کی نمائندگی انیسویں صدی کے اواخر میں ایک طبقے نے بہت زور وشور سے کی، کم زور ہوتا

محسوس ہو رہا ہے۔ وہ مکمل طور پر مغرب کے رنگ میں رنگ جانے کا رویہ ہے۔ اس رویے کے علم بردار حضرات نے یہ سمجھا کہ مسلمان اگر مغرب کے ساتھ سو فی صد ہم آہنگی کرلیں تو شاید ان کے تمام مسائل حل اور تمام مشکلات دور ہو جائیں گی۔ اس رویے کے ترجمان انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں دانش وروں میں بھی، سیاسی لیڈروں میں بھی اور عام سطح پر بھی کثرت سے پائے جاتے تھے، لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ یہ رویہ بھی کم زور ہو رہا ہے۔

تیسرا رویہ جو آغاز میں بہت کم زور اور تقریباً برائے نام تھا، اب دنیائے اسلام میں اس نے اپنی جگہ بنالی ہے اور مسلمان مفکرین اور دانش وروں کی ایک بڑی تعداد اس کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ وہی **خذ ما صفا ودع ما کدر** کا رویہ ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں سے مسلمانوں کو پورا پورا استفادہ کرنا چاہیے۔ مغرب کی سائنس، مغرب کی ٹیکنالوجی، مغرب کی سہولتیں، یہ سب چیزیں مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہیں۔ ان کو سیکھنا چاہیے اور ان کو اپنانا چاہیے، البتہ اہل مغرب کی تہذیب و ثقافت کے جو منفی پہلو ہیں، مثلاً اخلاقی اقدار کے متعلق ان کے خیالات و نظریات، یا سیکولرازم اور لا مذہبیت، یا مرد و زن کی آزادی کا تصور جو ان کے ہاں ہے، یہ سب باتیں خلاف اسلام ہیں، یہ چیزیں دنیائے اسلام کو قبول نہیں کرنی چاہییں۔ یہ رویہ پہلے بہت محدود تھا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں وسعت پیدا ہوئی ہے اور آج دینائے اسلام کی ایک بڑی تعداد اس رویے پر کاربند محسوس ہوتی ہے۔

۱۹۹۴ء، ۱۹۹۵ء میں مذکورہ اجتماع میں جب میں نے ایک سوال کے جواب میں مذکورہ تجزیہ تفصیل سے بیان کیا تو اس کے جواب میں اجتماع کے شرکا نے، جن میں فرانسیسی نمائندے بھی شامل تھے، جرمن اور آسٹریا کے لوگ بھی شامل تھے، تقریباً بالاتفاق مجھے Controvert کیا اور کہا ٹھیک ہے، آپ اس رویے کو درست سمجھتے ہوں گے، لیکن مغرب ان شرائط پر اپنی ٹیکنالوجی اور اپنی تہذیب و تمدن سے آپ کو استفادہ کرنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں ہو گا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت پہلی

مرتبہ یہ پہلو میرے سامنے آیا۔ اس سے پہلے میرا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں کبھی یہ سوال نہیں آیا تھا کہ آیا مغرب بھی اس بات پر تیار ہے یا نہیں کہ آپ کی شرائط پر اپنی ٹیکنالوجی اور تہذیب سے آپ کو استفادہ کرنے کی اجازت دے۔ کم از کم اس اجتماع کے شرکا کا جواب بالاتفاق یہی تھا کہ مغرب آپ کو اس کی اجازت نہیں دے گا۔ مغرب کی رائے میں یہ ایک پورا پیکج ہے، جس کو آپ کو جوں کا توں قبول کرنا پڑے گا اور اس میں وہ آپ کو اخذ و انتخاب (Pick and Choose) کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس وقت میں نے یہ سمجھا کہ یہ دانش ور اور مفکرین شاید اپنے ہاں کی جمہور یا اکثریت کی رائے کی ترجمانی نہیں کر رہے، اور مغربی تہذیب میں جو فیصلہ کن قوتیں ہیں، ان کی زبان نہیں بول رہے۔ اس وقت میرا احساس یہ تھا کہ جس طرح ہر شخص اپنی تہذیب کے بارے میں ایک عصبیت کا رویہ رکھتا ہے، یہ حضرات بھی اپنی تہذیب کے بارے میں شدید عصبیت اور حمیت رکھتے ہیں اور اس عصبیت کی وجہ سے یہ بات ان کو پسند نہیں آئی کہ ہم ان کی تہذیب کے بعض پہلوؤں کو کمزور، غیر اخلاقی اور منفی قرار دے کر مسترد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک کمزور اور غریب فقیر آدمی کسی دولت مند شخص سے، جس کا وہ ممنونِ احسان بھی رہتا ہے اور اس کے خاندان کے بہت سے افراد اس کے زلہ ربا بھی ہوں، یہ کہے کہ آپ کی کوٹھی یا محل میں فلاں فلاں چیزیں مجھے غلط اور بے محل معلوم ہوتی ہیں اور میں انہیں مسترد کرتا ہوں تو ظاہر ہے کہ یہ منفی تبصرہ، وہ بھی ایک محتاج کی زبان سے ایک دولت مند مربی کو اچھا نہیں لگے گا اور وہ اس کو بے وقوف سمجھے گا۔ میرا تاثر یہ تھا کہ شاید وہ اس نفسیاتی کیفیت میں میری بات کی تردید کر رہے ہیں، لیکن پچھلے بارہ پندرہ سالوں میں مغرب کے بہت سے لوگوں سے ملنے، ان کی باتیں سننے اور ان کی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا، اور اب مجھے یہ لگتا ہے کہ یہ ان کی طے شدہ پالیسی ہے، جو انہوں نے سوچ سمجھ کر اختیار کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیائے اسلام اپنے آپ کو مکمل طور پر مغرب کے رنگ میں رنگے اور مکمل طور پر مغربی ایجنڈے کو اختیار کرے تو مشرق و مغرب میں پرامن

بقائے باہمی ممکن ہے، اور اگر دنیائے اسلام اس شرط کے ساتھ بقائے باہمی کے لیے تیار نہ ہو تو مغربی تہذیب کے فوائد یا مثبت اثرات سے مسلمانوں کو یک طرفہ طور پر متمتع ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہ بات جو ۱۹۹۴ء۔۱۹۹۵ء سے پہلے میرے علم میں نہیں تھی، اب وقت کے ساتھ ساتھ روز روشن کی طرح ایسی واضح ہے کہ مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ پوری دنیائے مغرب کا ایک طے شدہ فیصلہ ہے کہ دنیائے اسلام پر مغرب کے ایجنڈے کو سو فی صد نافذ کیا جائے اور عالم گیریت کے نئے نظریات اور تصورات سے کام لے کر اہل مشرق کو بالعموم اور دنیائے اسلام کو بالخصوص مغرب کا تابع مہمل اور نقل، مطابق اصل بنایا جائے۔

مغرب کا ایجنڈا ایک ہمہ گیر ایجنڈا ہے اور اس میں سیاست، و معیشت، تجارت و مالیات اور تعلیم و ثقافت سے لے کر فرد اور خاندان تک ہر چیز شامل ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو بہت سے کام ہو رہے ہیں، وہ محض اتفاق سے یا مسلمانوں کی کم زوری کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ یقیناً مسلمانوں میں کم زوریاں بھی ہیں اور ان کی دینی حمیت میں کمی بھی آئی ہے، ان کے آپس کے اختلافات اور شخصی اور گروہی مفادات کے ٹکراؤ نے ان کے لیے ان گنت مسائل پیدا کیے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ بالادست قوتیں بھی ہیں، جو طے شدہ پروگرام کے تحت آگے بڑھ رہی ہیں اور دنیائے اسلام کو ایک خاص رخ پر چلانا چاہتی ہیں۔ اب مسلمان کس حد تک اس میں ساتھ جانے کو تیار ہیں، اس کے بارے میں مختلف طبقوں کے رد عمل مختلف اور رویے متفاوت ہیں۔ حکم رانوں کے مفادات یہاں عامۃ الناس کے احساسات اور تصورات سے متعارض ہیں۔ مسلمان دانش ور جو سمجھتے ہیں کہ مغرب کی مثبت چیزوں سے اتفاق کریں اور منفی چیزوں کو مسترد کر دیں، وہ کس حد تک اس میں کام یاب ہوں گے اور مستقبل کیا خبر لائے گا؟ یہ اللہ ہی کو بہتر معلوم ہے، لیکن اس رویے کی کام یابی کا سارا دار و مدار مسلمانوں کے فہم صحیح پر، مسلمانوں کی بصیرت اور ان کے عزم و ارادے پر ہے اور اس فہم صحیح کے لیے جو چیز سب سے پہلے درکار ہے، وہ خود دنیائے اسلام میں اسلامی تہذیب، اسلامی علوم

وفنون اور معارف اسلامی سے گہری اور ماہرانہ واقفیت ہے۔ جب تک شریعت اور شریعت کے پیغام اور تعلیم میں یہ گہری بصیرت اور ماہرانہ واقفیت پیدا نہیں ہو گی، اس وقت تک کوئی ایسی بنیاد فراہم نہیں ہو سکتی، جس پر آگے چل کر عمارت کھڑی کی جا سکے۔

ایک زمانہ تھا کہ دنیائے اسلام میں علوم وفنون کی اساس قرآن مجید تھا۔ قرآن مجید وہ جڑ فراہم کرتا تھا، جس سے علوم وفنون کا سدا بہار گلستان پیدا ہوا، جس نے ایک ہزار سال تک دنیا کو علم وتحقیق کے ثمرات سے بہرہ مند کیا۔ یہی وہ درخت تھا جس کے برگ وبار اور ثمرات مسلمانوں کے بقیہ علوم وفنون کی صورت میں سامنے آئے۔ آج سے کم وبیش ایک ہزار سال پہلے قاضی ابو بکر بن العربی نے، جو ایک مشہور مفسر اور مالکی فقیہ ہیں، لکھا تھا کہ مسلمانوں کے جملہ علوم وفنون کی تعداد سات سو ہے۔ ان سات سو علوم وفنون کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ سنت سے ہے اور یہ سب کے سب سنت کی شرح کی حیثیت رکھتے ہیں، اور سنت رسول قرآن مجید کی تشریح وتفسیر ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی حیثیت اس بنیاد اور جڑ کی ہے، جس پر مسلمانوں کی ساری تعلیمی، فکری اور تہذیبی سرگرمی کا دارومدار ہے۔ یہی بات ایک جگہ اس سے پہلے امام شافعی نے فرمائی تھی۔ ان کا ارشاد تھا کہ مسلمانوں کے تمام اقوال ونظریات سنت رسول کی شرح ہیں اور سنت رسول قرآن مجید کی شرح ہے۔ یہ کیفیت کم وبیش گیارہ، بارہ سو سال قائم رہی اور ایک منفرد تعلیمی روایت نے اس کیفیت کو برقرار رکھا۔ ایسے نظام تعلیم نے، جس کی اساس قرآن مجید، سنت رسول اور ان دونوں سے پیدا ہونے والے علوم وفنون پر تھی، امت مسلمہ کی تمام ضروریات کو پورا کیا۔ امت مسلمہ میں بڑی بڑی ریاستیں بھی قائم ہوئیں، دنیائے اسلام میں بڑی بڑی تہذیبیں سامنے آئیں، اور یورپ کے کم وبیش آدھے حصے پر مسلمانوں کی حکومت رہی۔ مسلمانوں کی فوجیں آسٹریا کے حدود تک پہنچیں اور ویانا کا محاصرہ کیا۔ مشرقی اور جنوبی یورپ میں مسلمانوں کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ اسی طرح اسپین میں آج بھی مسلمانوں کی سات سو سالہ حکومت کے

آثار موجود ہیں۔ جہاں بانی کے اس پورے سلسلے میں اسلامی علوم وفنون اور وحدت پر مبنی نظام تعلیم نے مسلمانوں کے خالص دینی تقاضے بھی پورے کیے اور خالص دنیوی تقاضے بھی۔

یہ تاثر کہ دینی اور دنیوی علوم جدا جدا اور الگ الگ بہنے والی مختلف نہریں ہیں، اسلامی تاثر نہیں، بل کہ یہ مغرب کا تحفہ اور مغربی سیکولرازم کی باقیات سیئات واثراتِ بد میں سے ہے۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں اور میں بغیر کسی تردد کے یہ بات عرض کرتا ہوں کہ جب تک مذہبی اور دنیاوی تعلیم کے یہ دو نظام الگ الگ برقرار رہیں گے، دنیائے اسلام میں سیکولرازم کو فروغ ملتا رہے گا۔ جو علمائے کرام دینی اور دنیاوی تعلیم کو الگ الگ رکھنے پر مصر ہیں، وہ اپنے اس رویے سے سیکولرازم کو فروغ دے رہے ہیں، وہ سیکولرازم جس کو مغرب کا سب سے بڑا فکری اور نظریاتی فتنہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ سیکولرازم کیا ہے؟ سیکولرازم یہ ہے کہ دنیا کے معاملات دین اور مذہب کی راہ نمائی سے آزاد رہیں۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہوں۔ جو چیز مذہبی ہے، وہ مذہبی دائرے میں رہے اور جو غیر مذہبی ہے، وہ غیر مذہبی دائرے میں رہے اور ان دونوں کے درمیان کوئی ہم آہنگی اور اتفاق پیدا نہ ہو۔ یہ دونوں ایک نہر یا ایک دریا کے دو کنارے ہیں، جو کبھی آپس میں نہیں ملتے اور ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہتے ہیں۔ زندگی کو دو متوازی (بل کہ متحارب) نظاموں اور دو متوازی حصوں میں تقسیم کرنا، اسی کو سیکولرازم کہتے ہیں۔ یہی لامذہبیت اور لادینیت ہے۔ لادینیت کسی اور چیز کا نام نہیں ہے۔

انگریز کے زمانے میں جب مسلم معاشرے کی اصل قیادت مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن گئی تو اس وقت مسلمانوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ اسلامی علوم وفنون کے تحفظ کے لیے ایک خالص دینی نظام تعلیم کے قیام پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ یہ ایک دفاعی حکمت عملی تھی اور امت مسلمہ میں مذہب کی باقیات کو بچانے کا واحد طریقۂ کار یہی تھا کہ مذہبی تعلیم کے نام پر جو کچھ کیا جاسکتا

ہے، وہ کیا جائے اور جس حد تک مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو برقرار رکھا جا سکتا ہے، رکھا جائے۔ اس سے پہلے کبھی بھی ایسا نہیں تھا کہ دینی تعلیم اور دنیادی تعلیم کے دو الگ الگ نظام موجود رہے ہوں۔ چناں چہ مغلیہ دور میں جس نظام تعلیم اور جن درس گاہوں نے، جس نصاب تعلیم اور جس تعلیمی روایت نے مجدد الف ثانی جیسا شخص پیدا کیا، جن کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم کا یہ تعارفی جملہ میں ہمیشہ دہرایا کرتا ہوں کہ:

The greatest religious genius produced by Muslim India

مسلم ہندوستان نے سب سے بڑا جو مذہبی عبقری پیدا کیا، وہ شیخ احمد سرہندی تھے)، اسی نظام میں نواب سعد اللہ خان بھی تیار ہوا تھا، جو مجدد صاحب کی طرح اس نظام کی پیداوار تھا اور جو سلطنت مغلیہ کا وزیر اعظم بنا، وہ سلطنت مغلیہ جو موجودہ افغانستان، پاکستان، ہندوستان، نیپال، بنگلہ دیش، سری لنکا، بھوٹان، سکم، برما جیسی بڑی بڑی ریاستوں کے بیش تر حصے پر مشتمل تھی۔ اس وسیع سلطنت کے نظام کو اس نے شاہ جہاں کے زمانے میں کام یابی سے چلایا تھا۔ پھر استاد احمد معمار جس نے تاج محل بنایا، یہ بھی اسی نظام کی پیداوار تھا۔ یہ تینوں ایک ہی نظام تعلیم کے ثمرات تھے اور ایک ہی نصاب کے پڑھے ہوئے تھے۔ اب دیکھیے کہ ایک وہ شخص جس نے دنیا کی متمدن ترین سلطنت کو اس کے کام یاب ترین ادوار میں قیادت فراہم کی اور اس کا نظام چلا کر دکھایا، دوسرا وہ شخص جو ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بڑا مذہبی عبقری ہے، جس کی فکری گہرائی اور روحانی عظمت کو بیان کرنا بھی دشوار ہے اور جس نے برصغیر کی دینی تحریکات پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ بعد کی کوئی دینی تحریک اور کوئی دینی سرگرمی اس کے اثر اور شخصیت کے احترام سے خالی نہیں ہے، اور تیسرا وہ شخص جس نے دنیا کے سات عجائب میں سے ایک عجوبہ بنایا، یہ تینوں افراد ایک ہی نصاب کے پڑھے ہوئے اور ایک ہی تعلیمی نظام کی پیداوار تھے۔ یہی اسلام کا آئیڈیل اور یہی اسلام کا معیار ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد ہم اس پر از سرِ نو غور کرتے اور یہ طے کرتے کہ آزاد مسلم مملکت پاکستان میں تعلیمی ضروریات کیا ہوں گی؟ پاکستانی معاشرے کو دینی راہ نمائی فراہم کرنے کے لیے کس انداز کے اہل علم درکار ہوں گے؟ پاکستان کی اسلامی خطوط پر تعمیر نو کے لیے کیسے ماہرین کی ضرورت ہو گی؟ لیکن غور و فکر کا یہ کام نہ حکومتوں نے کیا اور نہ ہی اہل علم نے اس پر ابھی تک کوئی توجہ دی ہے۔ یہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے، جس پر ملک وملت کی آئندہ تعمیر کا دار و مدار ہے۔ اس پر جتنی جلدی غور کر کے اس کو حتمی طور پر طے کرلیا جائے، اتنا ہی اچھا ہو گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام پوری امت مسلمہ کی تاریخ کے ایک مرحلے کی تشکیل نو کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک نئے دور کی بنیاد رکھنے کے مترادف ہے اور میں اس کو اس سے کہیں زیادہ اہم سمجھتا ہوں، جتنی اہمیت دار العلوم دیوبند کے قیام کی تھی۔ میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا اور اسے ہر گز غیر اہم نہیں سمجھتا۔ برصغیر اور پورے جنوبی ایشیا میں پچھلے ڈیڑھ سو سال میں مسلمانوں کی پوری مذہبی تاریخ دار العلوم دیوبند اور اس کے موسسین کی مرہونِ منت ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک وقتی اور دفاعی حکمت عملی تھی۔ اب ضرورت دائی اور اقدامی حکمت عملی کی ہے۔ یہ کام جس کا آغاز آج مولانا زاہد الراشدی اور ان کے ہم خیال اہل علم نے کیا ہے یا کر رہے ہیں، اگر یہ نتیجہ خیز ثابت ہو تو اس کے اثرات دیوبند کے اثرات سے کہیں زیادہ دیرپا اور دور رس ہوں گے، اس لیے کہ یہ اس روایت کا احیا کرنے کے مترادف ہے، جو اصل اسلامی روایت ہے۔ دار العلوم دیوبند کی کاوش یا مہم ایک بدلی ہوئی صورت حال میں دفاعی اور وقتی کوشش تھی۔ وہ آئیڈیل صورت نہیں تھی اور نہ ہی وہ آئیڈیل حالات تھے۔ نہ وسائل دست یاب تھے، نہ حکومتی سرپرستی دست یاب تھی، اور نہ وہاں کے فارغ شدہ حضرات کے لیے قیادت کے مناصب موجود تھے، نہ معاشرہ ان کی قیادت کو ماننے اور ان سے رہ نمائی لینے کے لیے تیار تھا۔ ان کی رہ نمائی مسجد اور مدرسے کے خاص دائرے تک محدود تھی۔ اس کے

لیے انہوں نے جو کچھ کیا، وہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے کیا اور بہت دردمندی اور اخلاص و قربانی کے جذبے سے کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے گا اور آج جتنا دین موجود ہے، وہ اکثر و بیشتر ان ہی کی کاوش کی وجہ سے موجود ہے۔ لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جو دین موجود ہے، اس کو زندگی کے روزمرہ معاملات سے Relate کیا جائے اور اس کو دوبارہ معاشرے میں فعال قائدانہ کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں لایا جائے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ اہل دین کے پاس دینی علوم کا تخصص بھی موجود ہو اور جس دنیا اور جس معاشرے میں انہیں قیادت فراہم کرنی ہے، اس کے بارے میں بھی قائدانہ اور ناقدانہ واقفیت انہیں حاصل ہو۔

جب میں یہ بات عرض کرتا ہوں تو بعض علمائے کرام یہ سمجھتے ہیں اور مجھ سے انہوں نے اس کا اظہار بھی فرمایا کہ میں دینی تخصصات کو غیر اہم سمجھتا ہوں اور ان کی جگہ دوسرے دنیاوی تخصصات کو فروغ دینا چاہتا ہوں۔ ان حضرات کے خیال میں گویا میں اس بات کا داعی ہوں کہ دینی مدارس کو میڈیکل کالجز میں تبدیل کر دیا جائے یا مغربی تعلیم اور فنی تخصصات کے ادارے بنا دیا جائے۔ ایک بڑے محترم اور بزرگ عالم نے مجھ سے غصے سے پوچھا کہ کیا انجینئر نگ کالج میں مولوی تیار ہوتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر دینی مدارس میں انجینئر کیوں تیار ہوں؟ لیکن یہ ایک خلط مبحث ہے۔ نہ یہ مقصد ہے اور نہ یہ اعتراض درست ہے۔ اس لیے کہ نہ انجینئر تیار کرنا مقصد ہے اور نہ میڈیکل ڈاکٹر تیار کرنا، بل کہ علمائے کرام ہی تیار کرنا مقصد ہے، لیکن قاضی ابو یوسف، امام محمد یا کم از کم ملا محب اللہ بہاری، میر زاہد ہروی اور نواب سعد اللہ کی طرح کے علمائے کرام۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر دور کا ایک محاورہ اور ایک زبان ہوتی ہے۔ قرآن مجید اور سنت تو ایسے سرچشمے ہیں جو ہمیشہ کے لیے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ ان کا محاورہ ہر دور کے لیے ہے اور ہر دور کے لیے رہے گا۔ ان کے محاورے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ وہ ہمیشہ وہی رہے گا، اور ان کو ہمیشہ ان ہی کے محاورے اور ان ہی کی

اصطلاح میں سمجھا جائے گا، لیکن فقہائے کرام، شارحین حدیث اور مفسرین نے شریعت کے نصوص کو اپنے اپنے زمانے سے Relate کیا اور اپنے زمانے کے محاورے میں اس کی تعلیم کو مرتب کیا ہے۔ یہ محاورہ حالات کے بدلنے سے بدل سکتا ہے۔ ماضی میں بھی بدلتا رہا ہے اور آئندہ بھی بدلتا رہے گا۔ اس کی چھوٹی سی مثال میں آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں کہ وہ علمائے کرام جن کے پاس ٹھوس دینی علوم موجود ہیں، ان کے پاس گویا بجلی کا پاور ہاؤس اور اس میں قوت کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس ذخیرے سے استفادے کے لیے ضروری ہے کہ استفادہ کرنے والوں اور پاور ہاؤس کے درمیان کنکشن ممکن بھی ہو اور موجود بھی۔ دونوں ایک ہی وولٹیج پر کام کرتے ہوں۔ اب یہ پاور ہاؤس تو دائمی ہے، وولٹیج اس آلے کے بدلنے سے بدلتا رہے گا، جس کو بجلی سے چلانا مقصود ہے۔ یہی حال علمائے کرام کے وولٹیج یا محاورے کا ہے۔ چوں کہ ان کا محاورہ آج کے محاورے سے مختلف ہے، اس لیے دورِ جدید کا آدمی ان کے علم سے استفادہ نہیں کرتا۔

آج سے کم و بیش ۲۵ سال پہلے وفاقی شرعی عدالت قائم ہوئی۔ جسٹس صلاح الدین مرحوم اس کے پہلے چیف جسٹس تھے۔ بہت نفیس انسان تھے۔ میرے مشورے سے انہوں نے بعض علمائے کرام کو وفاقی شرعی عدالت کا مشیر مقرر کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ جن حضرات کو آپ نے مشیر مقرر کیا ہے، جن کی تعداد ۳۰، ۳۵ کے قریب تھی، ان سب کو آپ کھانے کی دعوت دیں۔ چناں چہ انہوں نے پورے پاکستان سے ان جید علمائے کرام کو کھانے کی دعوت دی۔ ایک بزرگ جو بہت ٹھوس عالم تھے، انتہائی گہرا علم رکھتے تھے، وہ ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔ چیف جسٹس صاحب نے ان سے پوچھا کہ حضرت! Islamic State کی Minimum Requirement کیا ہے؟ بالکل یہی الفاظ تھے، یعنی کسی ریاست کے اسلامی ریاست ہونے کے کم سے کم تقاضے کیا ہیں؟ اس کا وہ بزرگ کوئی صحیح جواب نہیں دے پائے۔ شاید سمجھے نہ ہوں۔ جسٹس صاحب نے دوبارہ اردو میں پوچھا کہ اسلامی ریاست کے کم سے کم تقاضے کیا ہیں؟ تو اس پر بھی وہ بزرگ کوئی صحیح جواب نہیں

دے پائے۔ میں تھوڑے فاصلے پر تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ صف اول کے عالم ہیں، اگر یہی چیف جسٹس کے اس سوال کا جواب نہ دے سکے تو ہو سکتا ہے کہ علما کے بارے میں ایک منفی تاثر جسٹس صاحب کے دل میں بیٹھ جائے۔ میں نے درمیان میں مداخلت کی گستاخی کرتے ہوئے کہا کہ شاید چیف جسٹس صاحب یہ پوچھنا چاہ رہے ہیں کہ دارالاسلام کی تعریف کیا ہے؟ اب انہوں نے فوراً جواب دیا اور بڑے مدلل انداز میں جواب دے کر چیف جسٹس کو بڑی حد تک مطمئن کر دیا۔ اس وقت یہ بات مجھ پر واضح ہوئی کہ علمائے کرام کے پاس علم تو ہے، لیکن اس کو آج کل کے انسانوں کے لیے دست یاب کرنے کے لیے جس محاورے کی ضرورت ہے، وہ محاورہ کم یاب ہے۔

محاورہ ہر زمانے کا مختلف ہوتا ہے اور ہر زمانے کے علوم سے متاثر ہوتا ہے۔ جس زمانے میں مسلمانوں میں منطق اور یونانی علوم وعقلیات کا رواج نہیں تھا، آپ اس زمانے کی اصول فقہ کی کتابیں دیکھیں کہ ان کا انداز کیا تھا؟ امام شافعی کی کتاب الرسالہ پڑھیں۔ اس کے بعد آپ خود شافعی فقیہ امام غزالی کی المستصفیٰ پڑھیں۔ دونوں کے محاورے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اسرار حدیث پر کتاب لکھی ہے۔ اسرار حدیث پر معالم السنۃ میں امام خطابیؒ نے بھی لکھا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں معالم السنۃ سے استفادے کا اعتراف بھی کیا ہے۔ آپ ان دونوں کتابوں کو پڑھیں تو دونوں کے محاورے میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوگا۔ شاہ ولی اللہ کا محاورہ سارے کا سارا یونانی فلسفے اور عقلیات پر مبنی ہے اور یونانی فلسفہ، جیسا کہ برصغیر میں پڑھایا جاتا تھا، میبذی اور شرح ہدایۃ الحکمۃ اور فلسفے کے بارے میں جو جو کتابیں اس وقت رائج تھیں، ان سب کے اثرات اور مصطلحات شاہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ میں موجود ہیں۔ غور فرمایئے کہ علم حدیث کی بات ہو رہی ہے اور شاہ صاحب علم اسرار حدیث پر گفت گو فرما رہے ہیں، لیکن منطق اور فلسفے کے محاورے میں۔ جو بات خطابی نے کی ہے، وہی بات شاہ صاحب کہہ رہے ہیں اور اسی کو آگے بڑھا رہے ہیں، لیکن ایک دوسرے اسلوب اور ایک

نئے لہجے اور انداز بیان میں۔ اگر خطابی شاہ صاحب کے زمانے میں زندہ ہوتے تو شاہ صاحب کے بہت سے مباحث کا شاید ایک لفظ نہ سمجھتے اور ان کو شاید یہ پتا نہ چلتا کہ شاہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں، جیسا کہ چیف جسٹس صاحب کی بات وہ بزرگ عالم نہیں سمجھ پائے۔

آپ کے پاس ریڈیو سیٹ تو ہو، لیکن ریڈیو اسٹیشن سے جس فریکونسی پر پیغام نشر ہو رہا ہے، آپ کا ریڈیو سیٹ اس فریکونسی پر کام نہ کرتا ہو تو آپ کے لیے وہ ریڈیو سیٹ بھی بے کار ہے۔ جب تک آپ اپنے ریڈیو سیٹ کو مطلوبہ فریکونسی پر نہیں لائیں گے، آپ ریڈیو اسٹیشن کی نشریات سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح یہ ضروری ہے کہ علمائے کرام کے پاس جو علم دین کا پاور ہاؤس ہے، اور ایک عام آدمی جو دین کی راہ نمائی چاہتا ہے اور جس کو آپ راہنمائی دینا چاہتے ہیں، ان دونوں کی فریکونسی ایک ہو۔ اس فریکونسی کو موافق بنانے کے لیے ایک تو تخصص ضروری ہے، جس پر میں ابھی مزید بات کروں گا، اور دوسرا ادور جدید کا محاورہ درکار ہے۔ یہ خلط مبحث اور غلط فہمی ہے کہ علما کو انجینئر یا ڈاکٹر بنانا مقصود ہے۔ نہیں، بل کہ مقصود یہ ہے کہ وہ علوم وفنون جنہوں نے آج کل کی تہذیب کی تشکیل کر رکھی ہے اور جن کی بنیاد پر آج ساری دنیا کا نظام چل رہا ہے، حتیٰ کہ پاکستان، سعودی عرب اور ایران میں بھی چل رہا ہے، ان علوم وفنون سے علما بھی مناسب طور پر واقف اور مانوس ہوں۔

مسلمانوں نے اپنے دور میں علوم وفنون کی ایک الگ تقسیم کی تھی۔ کچھ علوم مقاصد یا علوم حقیقی ہیں اور کچھ علوم وسائل یا علوم آلیہ ہیں۔ اسی طرح کچھ علوم ہیں، کچھ صنائع ہیں اور کچھ فنون ہیں۔ یہ مسلمانوں کی اختیار کردہ تقسیم تھی۔ آج عملاً یہ تقسیم موجود نہیں ہے۔ آج تعلیم کا نظام عملاً اس تقسیم پر نہیں چل رہا۔ آج دنیا میں ایک نئے انداز سے علوم کی مختلف تقسیمیں کی جاتی ہیں۔ ان میں ایک اہم تقسیم علوم عمرانی (Social Sciences) اور علوم انسانی (Humanities) کی ہے۔ سوشل سائنسز میں وہ ان علوم وفنون کو شامل کرتے ہیں جو انسانی معاشرے کی

تشکیل اور معاشرتی زندگی سے بحث کرتے ہیں۔ ان میں تاریخ، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات اور کسی حد تک قانون شامل ہیں۔ یہ عمرانی علوم ہیں، جن سے اجتماعی رویوں کی تشکیل ہو رہی ہے۔ انسانیات، یعنی Humanities وہ علوم ہیں، جو انسان کے مطالعے پر مبنی ہیں، یعنی فرد کے خیالات، فرد کے افکار، فرد کی نفسیات، فرد کے احساسات وجذبات، یہ سب کے سب ہیومینیٹیز کہلاتے ہیں۔ اس میں فلسفہ، نفسیات اور بشریات شامل ہیں۔

علوم وافکار کے میدانوں میں یہ میدان ہیں، جن سے دورِ جدید میں تہذیب کی تشکیل ہوئی ہے۔ آج ہمارا ایک پڑھا لکھا انسان، چاہے وہ پاکستان کا ہو یا سعودی عرب کا یا مصر کا یا کسی بھی اسلامی ملک کا، جب وہ بات کرتا ہے تو اسلامی علوم اور تصورات کے تناظر (Perspective) میں بات نہیں کرتا۔ وہ اسلامی اصطلاحات یا فقہی سیاق وسباق یا فقہی محاورے میں بات نہیں کرتا، بل کہ وہ مغربی سوشل سائنسز کے محاورے میں بات کرتا ہے۔ عمرانی علوم اور انسانی علوم کے علاوہ مختلف قسم کے طبیعی علوم بھی ہیں، جن کی حیثیت وسائل اور آلات کی ہے، جن سے لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانا مقصود ہے۔ ان کا دینی علوم سے بہ راہِ راست کوئی تعلق یا تصادم نہیں۔ بالواسطہ طور پر اگرچہ ان وسائل کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے اور اس غلط استعمال کے نتائج بھی منفی ہو سکتے ہیں، لیکن رویوں کی تشکیل میں ان علوم آلیہ کا براہ راست حصہ بہت کم ہے۔ رویوں اور نظریوں کی تشکیل میں اصل کردار عمرانی اور انسانی علوم ہی کا ہے۔ آج جس چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ علمائے کرام بہ قدر ضرورت سوشل سائنسز اور ہیومینیٹیز سے واقفیت رکھتے ہوں۔ اسی طرح کی واقفیت رکھتے ہوں، جیسے آج سے ایک ہزار سال پہلے، یعنی تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں یونانی عقلیات، فلسفے اور منطق سے واقفیت کی ضرورت پیش آئی تھی۔

اگر آپ اس دور یعنی تیسری چوتھی صدی کے مباحث پڑھیں تو معلوم ہو گا کہ جب یونانی منطق اور فلسفے کی کتابیں ترجمہ ہونا شروع ہوئیں تو مسلمانوں میں اسی

تشکیل اور معاشرتی زندگی سے بحث کرتے ہیں۔ ان میں تاریخ، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات اور کسی حد تک قانون شامل ہیں۔ یہ عمرانی علوم ہیں، جن سے اجتماعی رویوں کی تشکیل ہو رہی ہے۔ انسانیات، یعنی Humanities وہ علوم ہیں، جو انسان کے مطالعے پر مبنی ہیں، یعنی فرد کے خیالات، فرد کے افکار، فرد کی نفسیات، فرد کے احساسات و جذبات، یہ سب کے سب ہیومینیٹیز کہلاتے ہیں۔ اس میں فلسفہ، نفسیات اور بشریات شامل ہیں۔

علوم و افکار کے میدانوں میں یہ میدان ہیں، جن سے دورِ جدید میں تہذیب کی تشکیل ہوئی ہے۔ آج ہمارا ایک پڑھا لکھا انسان، چاہے وہ پاکستان کا ہو یا سعودی عرب کا یا مصر کا یا کسی بھی اسلامی ملک کا، جب وہ بات کرتا ہے تو اسلامی علوم اور تصورات کے تناظر (Perspective) میں بات نہیں کرتا۔ وہ اسلامی اصطلاحات یا فقہی سیاق و سباق یا فقہی محاورے میں بات نہیں کرتا، بل کہ وہ مغربی سوشل سائنسز کے محاورے میں بات کرتا ہے۔ عمرانی علوم اور انسانی علوم کے علاوہ مختلف قسم کے طبیعی علوم بھی ہیں، جن کی حیثیت وسائل اور آلات کی ہے، جن سے لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانا مقصود ہے۔ ان کا دینی علوم سے بہ راہِ راست کوئی تعلق یا تصادم نہیں۔ بالواسطہ طور پر اگرچہ ان وسائل کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے اور اس غلط استعمال کے نتائج بھی منفی ہو سکتے ہیں، لیکن رویوں کی تشکیل میں ان علوم آلیہ کا براہ راست حصہ بہت کم ہے۔ رویوں اور نظریوں کی تشکیل میں اصل کردار عمرانی اور انسانی علوم ہی کا ہے۔ آج جس چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ علمائے کرام بہ قدر ضرورت سوشل سائنسز اور ہیومینیٹیز سے واقفیت رکھتے ہوں۔ اسی طرح کی واقفیت رکھتے ہوں، جیسے آج سے ایک ہزار سال پہلے، یعنی تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں یونانی عقلیات، فلسفے اور منطق سے واقفیت کی ضرورت پیش آئی تھی۔

اگر آپ اس دور یعنی تیسری چوتھی صدی کے مباحث پڑھیں تو معلوم ہو گا کہ جب یونانی منطق اور فلسفے کی کتابیں ترجمہ ہونا شروع ہوئیں تو مسلمانوں میں اسی

طرح کے تین رویے پائے جاتے تھے، جو آج مغربی تہذیب کے بارے میں نظر آتے ہیں۔ علمائے کرام، محدثین اور مفسرین کا ایک بہت بڑا طبقہ وہ تھا، جو ان سب چیزوں کو فضول، بے کار، بل کہ ناپاک اور گردن زدنی سمجھتا تھا، جو یونانی منطق اور فلسفے سے اعتنار کھنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج یا اس کی حدود پر سمجھتا تھا اور فلاسفہ، بل کہ بہت سے متکلمین کو بھی مسلمانوں کا نمائندہ اور اسلامی فکر کا ترجمان سمجھتے تھے۔ یہ بحثیں تک دینی حلقوں میں موجود تھیں کہ منطق کی کتابوں سے استنجا جائز ہے یا نہیں۔ یہ جزئیات آپ کو فقہ کی کتابوں میں مل جائیں گی، یعنی یہاں تک ناپسندیدگی اور نفرت کی کیفیت تھی۔ یہ شعر آپ نے اکثر پڑھا ہو گا کہ:

وا عجبا لمنطق الیونان
کم فیه من افك ومن بهتان
مخبط لجید الاذهان

ایک لمبی نظم ہے، پتا نہیں کس بزرگ کی ہے؟ آغاز میں عقلیات اور منطق کے بارے میں یہ کیفیت تھی۔ اس کے بعد یہ رویہ محدود ہوتا گیا، جیسے وہ تماثر والا رویہ محدود ہو گیا۔ پھر یہ کیفیت آئی کہ خالص اسلامی علوم میں منطق و فلسفہ شامل ہو گیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ علم اسرار حدیث پر بہترین کتاب ہے۔ میری محدود دانست اور ناچیز رائے میں اس سے بہتر اسلامی علوم کی نمائندہ کتاب برصغیر میں نہیں لکھی گئی اور میں شاہ صاحب کو برصغیر میں مسلمانوں کا امیر المومنین فی الحدیث سمجھتا ہوں۔ لیکن جب تک آپ منطق اور فلسفے کی اصطلاحات سے واقف نہ ہوں، ان ہی یونانیوں کی منطق جو بت پرست اور مشرک تھے، بدکار تھے، اخلاقی اعتبار سے بھی کچھ اونچے لوگ نہ تھے، تو آپ علم کلام اور اصول فقہ کی بہت سی کتابوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ حتیٰ کہ یونانی بت پرستوں کی کتابوں کو سمجھے بغیر اور ان کے افکار کو جانے بغیر آپ علم اسرار حدیث پر اسلامی لٹریچر کی بہترین کتاب حجۃ اللہ البالغہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ شاہ ولی اللہ تو خیر بعد کے ہیں۔ امام غزالی جیسے حجۃ الاسلام کی کتاب المستصفیٰ جو اصول فقہ جیسے خالص اسلامی علم پر ہے،

کے باوجود کہ ان کے بہت سے خیالات اسلامی عقائد سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

آج بھی اسی بات کی ضرورت ہے کہ وہ حضرات یا ارادہ جو یہ صلاحیت رکھتے ہوں اور خواہش رکھتے ہوں کہ آگے چل کر امت مسلمہ کی فکری قیادت کی ذمے داری انجام دیں، ان کو بہ قدر ضرورت مغربی علوم سے ناقدانہ اور قائدانہ واقفیت ہونی چاہیے۔ ان کے لیے یہ ضروری نہیں کہ مثلاً وہ اصول قانون کے اسی طرح ماہر ہوں، جس طرح کوئی ماہر مغرب میں پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی فقیہ مغربی اصول قانون کا بھی ماہر ہونا چاہتا ہے تو ضرور ہو جائے، لیکن فقہی معاملات و مسائل کو دور جدید کے محاورے میں بیان کرنے کے لیے اتنی مہارت کی ضرورت نہیں۔ اس غرض کے لیے صرف یہ جاننا کافی ہے کہ اصول قانون، جیسا کہ مغرب میں ہے، اس کے اساسی مسلمات، اصول موضوعہ، اس کے بنیادی عقائد، اس کے بنیادی Concerns and Issues جس سے وہ بحث کرتا ہے، وہ کیا ہیں؟ کیوں پیدا ہوئے ہیں اور ان کے جو بنیادی تصورات اور اصول موضوعہ ہیں، وہ گرفت میں آجائیں۔ اس کے بعد ان پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر ایک صاحب علم فقیہ یہ دیکھے کہ اس میں کیا چیز علمی حیثیت سے کمزور ہے اور کیا چیز مضبوط عقلی بنیادوں پر قائم ہے، اور کیا چیز یا کیا اسلوبِ استدلال ہے، جس سے کام لے کر اصول فقہ کے تصورات و مبادی کو بہتر انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام ایک ناقدانہ انداز کا متقاضی ہے۔

آپ دیکھیں کہ اصول فقہ کو جس طرح امام شافعیؒ نے مرتب فرمایا تھا اور جس طرح امام سرخسیؒ نے اس پر اصول السرخسی لکھی تھی، جو فقہ حنفی میں اصول فقہ کی پہلی جامع کتاب ہے، اس انداز کی کتابیں بعد میں شاذ و نادر ہی لکھی گئیں۔ امام رازی اور امام غزالی کی کتابیں اس انداز کی نہیں ہیں۔ ان میں منطق اور فلسفہ بہت بھرپور انداز میں شامل ہو گیا ہے۔ ان حضرات کے ہاں اصول فقہ کے مباحث میں فلسفہ، کلام، منطق، عقلیات، لسانیات اور لغویات سب شامل ہے۔ امام غزالی نے اصول فقہ کے ہر مسئلے کو منطق کے دلائل سے اس طرح ثابت کر کے دکھایا کہ یونانی فلسفہ و منطق کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر امام غزالی کے استدلال

طرح کے تین رویے پائے جاتے تھے، جو آج مغربی تہذیب کے بارے میں نظر آتے ہیں۔ علمائے کرام، محدثین اور مفسرین کا ایک بہت بڑا طبقہ وہ تھا، جو ان سب چیزوں کو فضول، بے کار، بل کہ ناپاک اور گردن زدنی سمجھتا تھا، جو یونانی منطق اور فلسفے سے اعتنار کھنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج یا اس کی حدود پر سمجھتا تھا اور فلاسفہ، بل کہ بہت سے متکلمین کو بھی مسلمانوں کا نمائندہ اور اسلامی فکر کا ترجمان سمجھتے تھے۔ یہ بحثیں تک دینی حلقوں میں موجود تھیں کہ منطق کی کتابوں سے استنجا جائز ہے یا نہیں۔ یہ جزئیات آپ کو فقہ کی کتابوں میں مل جائیں گی، یعنی یہاں تک ناپسندیدگی اور نفرت کی کیفیت تھی۔ یہ شعر آپ نے اکثر پڑھا ہوگا کہ:

وا عجبا لمنطق الیونان

کم فیہ من افک ومن بہتان

مخبط لجید الاذہان

ایک لمبی نظم ہے، پتا نہیں کس بزرگ کی ہے؟ آغاز میں عقلیات اور منطق کے بارے میں یہ کیفیت تھی۔ اس کے بعد یہ رویہ محدود ہوتا گیا، جیسے وہ تماثر والا رویہ محدود ہوگیا۔ پھر یہ کیفیت آئی کہ خالص اسلامی علوم میں منطق وفلسفہ شامل ہوگیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ علم اسرار حدیث پر بہترین کتاب ہے۔ میری محدود دانست اور ناچیز رائے میں اس سے بہتر اسلامی علوم کی نمائندہ کتاب برصغیر میں نہیں لکھی گئی اور میں شاہ صاحب کو برصغیر میں مسلمانوں کا امیر المومنین فی الحدیث سمجھتا ہوں۔ لیکن جب تک آپ منطق اور فلسفے کی اصطلاحات سے واقف نہ ہوں، ان ہی یونانیوں کی منطق جو بت پرست اور مشرک تھے، بدکار تھے، اخلاقی اعتبار سے بھی کچھ اونچے لوگ نہ تھے، تو آپ علم کلام اور اصول فقہ کی بہت سی کتابوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ حتیٰ کہ یونانی بت پرستوں کی کتابوں کو سمجھے بغیر اور ان کے افکار کو جانے بغیر آپ علم اسرار حدیث پر اسلامی لٹریچر کی بہترین کتاب حجۃ اللہ البالغہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ شاہ ولی اللہ تو خیر بعد کے ہیں۔ امام غزالی جیسے حجۃ الاسلام کی کتاب المستصفیٰ جو اصول فقہ جیسے خالص اسلامی علم پر ہے،

کے باوجود کہ ان کے بہت سے خیالات اسلامی عقائد سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

آج بھی اسی بات کی ضرورت ہے کہ وہ حضرات یا ارادہ جو یہ صلاحیت رکھتے ہوں اور خواہش رکھتے ہوں کہ آگے چل کر امت مسلمہ کی فکری قیادت کی ذمے داری انجام دیں، ان کو بہ قدر ضرورت مغربی علوم سے ناقدانہ اور قائدانہ واقفیت ہونی چاہیے۔ ان کے لیے یہ ضروری نہیں کہ مثلاً وہ اصول قانون کے اسی طرح ماہر ہوں، جس طرح کوئی ماہر مغرب میں پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی فقیہ مغربی اصول قانون کا بھی ماہر ہونا چاہتا ہے تو ضرور ہو جائے، لیکن فقہی معاملات و مسائل کو دور جدید کے محاورے میں بیان کرنے کے لیے اتنی مہارت کی ضرورت نہیں۔ اس غرض کے لیے صرف یہ جاننا کافی ہے کہ اصول قانون، جیسا کہ مغرب میں ہے، اس کے اساسی مسلمات، اصول موضوعہ، اس کے بنیادی عقائد، اس کے بنیادی Concerns and Issues جس سے وہ بحث کرتا ہے، وہ کیا ہیں؟ کیوں پیدا ہوئے ہیں اور ان کے جو بنیادی تصورات اور اصول موضوعہ ہیں، وہ گرفت میں آجائیں۔ اس کے بعد ان پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر ایک صاحب علم فقیہ یہ دیکھے کہ اس میں کیا چیز علمی حیثیت سے کمزور ہے اور کیا چیز مضبوط عقلی بنیادوں پر قائم ہے، اور کیا چیز یا کیا اسلوبِ استدلال ہے، جس سے کام لے کر اصول فقہ کے تصورات و مبادی کو بہتر انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام ایک ناقدانہ انداز کا متقاضی ہے۔

آپ دیکھیں کہ اصول فقہ کو جس طرح امام شافعیؒ نے مرتب فرمایا تھا اور جس طرح امام سرخسیؒ نے اس پر اصول السرخسی لکھی تھی، جو فقہ حنفی میں اصول فقہ کی پہلی جامع کتاب ہے، اس انداز کی کتابیں بعد میں شاذ و نادر ہی لکھی گئیں۔ امام رازی اور امام غزالی کی کتابیں اس انداز کی نہیں ہیں۔ ان میں منطق اور فلسفہ بہت بھرپور انداز میں شامل ہو گیا ہے۔ ان حضرات کے ہاں اصول فقہ کے مباحث میں فلسفہ، کلام، منطق، عقلیات، لسانیات اور لغویات سب شامل ہے۔ امام غزالی نے اصول فقہ کے ہر مسئلے کو منطق کے دلائل سے اس طرح ثابت کر کے دکھایا کہ یونانی فلسفہ و منطق کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر امام غزالی کے استدلال

سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ اس طرح انہوں نے اصول فقہ کو یونانی منطق کے ماہرین کے فہم کے قریب کر کے ان کے لیے قابل قبول بنا دیا۔ یوں منطق سے متاثر لوگ اصول فقہ سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے اصول فقہ کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا کہ یہ فن عقل و نقل دونوں کی میزان پر پورا اترتا ہے۔ یہی کام آج ہمیں کرنا پڑے گا۔ جب تک آپ غزالی اور رازی کی اس سنت کو زندہ نہیں کریں گے، بات آگے نہیں بڑھے گی۔

آج قانون دان ماہرین کا جو قابل احترام طبقہ ہمارا اور آپ کا نظام چلا رہا ہے، یہ اصول فقہ اور فقہ کی گہرائیوں اور نزاکتوں سے واقف نہیں ہے۔ یہ انگریزی قانون اور اصول قانون سے واقف ہے۔ اینگلو سیکسن لا، اس کے تصورات و استدلالات اور عقائد، سب ان حضرات کے رگ وپے اور گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب یا تو آپ انہیں مجبور کریں کہ وہ اپنا سب کام چھوڑ کر فقہ اور اصول فقہ پڑھیں اور ضروری مہارت فراہم کریں تو یہ عملاً ممکن نہیں ہو گا۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ آپ اپنی ملازمت، تدریس، نوکری یا حالیہ مشاغل و مصروفیات کو چھوڑ کر پانچ سال یا دس سال انگریزی قانون یا اصول قانون پڑھنے پر لگائیں تو آپ اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ آپ کے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ کے وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے۔ آپ کے مشاغل اس کے متحمل نہیں ہوں گے۔ اسی طرح ان لوگوں کے مشاغل بھی اس کے متحمل نہیں ہوتے کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر قدیم محاورے میں لکھے ہوئے اسلامی علوم وفنون میں مہارت حاصل کریں۔ اس مہارت کو حاصل کرنے کے لیے ایک وکیل کو اپنی وکالت چھوڑنا پڑے گی۔ ایک وکیل اپنی وکالت کیوں چھوڑے؟ اگر چھوڑ دے تو کھائے کہاں سے اور وہ کیوں پانچ سال اصول فقہ یا فقہ پڑھنے پر لگائے؟ پانچ سال میں بھی اتنی واقفیت پیدا نہیں ہو گی جتنی ہونی چاہیے۔ اس لیے مطالبے کرنے سے، جلوس نکالنے سے، بینر لگانے سے کوئی جج یا وکیل خود بہ خود فقہ کا ماہر نہیں ہو جائے گا۔ وہ فقہ کا ماہر تب بنے گا، جب وہ اسلامی علوم اور فقہ کو براہِ راست بنیادی مآخذ سے پڑھے گا،

اس لیے گفت گو میں تھوڑی سی تلخ نوائی کا عنصر آنے کی اجازت دیجیے۔ جب دار العلوم دیوبند قائم ہوا، اس وقت مسلمانوں کو مسئلہ کیا درپیش تھا؟ اس وقت مسلمانوں کو مسئلہ یہ درپیش تھا کہ انگریز نے پورے برصغیر پر قبضہ کر لیا تھا، مسلمانوں کے مذہبی اور دینی ادارے سب ختم کر دیے گئے تھے، اوقاف ایک ایک کر کے ضبط کر لیے گئے تھے، تعلیمی ادارے سب بند کر دیے گئے تھے۔ علمائے کرام جو سارے نظام کو چلا رہے تھے، ان کو ملازمتوں سے الگ کر دیا گیا تھا۔ عدالتوں کا نظام کسی نہ کسی حد تک شریعت کے مطابق تھا، اس کو ختم کر کے انگریزی عدالتیں قائم کر دی گئیں، انگریزی قانون شریعت کی جگہ نافذ کر دیا گیا۔ فارسی جو نظام حکومت کی زبان تھی، اس کو ختم کر کے انگریزی جاری کر دی گئی۔ جہاں جہاں مسلمان کارندے مقرر تھے، ان کی جگہ ہندو کارندوں کو مقرر کر دیا گیا۔ بڑے بڑے تمام مناصب پر انگریز آگئے اور مسلمان منصب قیادت سے معزول ہو کر معاشرے کا ناپسندیدہ عنصر بنا دیے گئے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی عزت کا ذریعہ تھیں، وہ مسلمانوں کی ذلت کا ذریعہ بنا دی گئیں۔ مسلمانوں کا لباس، مسلمانوں کے عہدے، مسلمانوں کے مناصب، مسلمانوں کے القاب، ہر چیز جو اونچے درجے کی تھی اور قابل عزت سمجھی جاتی تھی، اس کو انگریز نے ذلت کی علامت بنا دیا۔ یہ وہ حالات تھے، جن میں مخلص اہل علم و دین نے یہ محسوس کیا کہ وہ نصاب یا وہ نظام جو آسانی سے اس وقت اپنایا جا سکتا ہے، وہ ماضی کا درس نظامی ہے، لہٰذا اس کو اپنا لیا جائے۔

اس وقت درس نظامی برصغیر کے بیش تر علاقوں میں رائج تھا۔ درس نظامی کیا ہے؟ یہ بھی میں ذرا وضاحت اور صراحت سے عرض کر دوں۔ درس نظامی نہ کوئی آسمانی چیز ہے، نہ اس کو اختیار کرنا شریعت کا کوئی حکم ہے، نہ خیر القرون میں، اسلام کے سنہری دور میں اس نام کی کوئی چیز پائی جاتی تھی۔ اس درس کا تذکرہ نہ قرآن میں آیا ہے، نہ حدیث میں، نہ اس کا اسلام کے مستقبل یا ماضی سے کوئی تعلق ہے۔ یہ چند ماہرین تعلیم اور علما کے اپنے تجربے پر مبنی ایک نصاب ہے، جو اپنے زمانے میں

سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ اس طرح انہوں نے اصول فقہ کو یونانی منطق کے ماہرین کے فہم کے قریب کر کے ان کے لیے قابل قبول بنا دیا۔ یوں منطق سے متاثر لوگ اصول فقہ سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے اصول فقہ کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا کہ یہ فن عقل و نقل دونوں کی میزان پر پورا اترتا ہے۔ یہی کام آج ہمیں کرنا پڑے گا۔ جب تک آپ غزالی اور رازی کی اس سنت کو زندہ نہیں کریں گے، بات آگے نہیں بڑھے گی۔

آج قانون دان ماہرین کا جو قابل احترام طبقہ ہمارا اور آپ کا نظام چلا رہا ہے، یہ اصول فقہ اور فقہ کی گہرائیوں اور نزاکتوں سے واقف نہیں ہے۔ یہ انگریزی قانون اور اصول قانون سے واقف ہے۔ اینگلو سیکسن لا، اس کے تصورات و استدلالات اور عقائد، سب ان حضرات کے رگ و پے اور گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب یا تو آپ انہیں مجبور کریں کہ وہ اپنا سب کام چھوڑ کر فقہ اور اصول فقہ پڑھیں اور ضروری مہارت فراہم کریں تو یہ عملاً ممکن نہیں ہو گا۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ آپ اپنی ملازمت، تدریس، نوکری یا حالیہ مشاغل و مصروفیات کو چھوڑ کر پانچ سال یا دس سال انگریزی قانون یا اصول قانون پڑھنے پر لگائیں تو آپ اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ آپ کے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ کے وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے۔ آپ کے مشاغل اس کے متحمل نہیں ہوں گے۔ اسی طرح ان لوگوں کے مشاغل بھی اس کے متحمل نہیں ہوتے کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر قدیم محاورے میں لکھے ہوئے اسلامی علوم وفنون میں مہارت حاصل کریں۔ اس مہارت کو حاصل کرنے کے لیے ایک وکیل کو اپنی وکالت چھوڑنا پڑے گی۔ ایک وکیل اپنی وکالت کیوں چھوڑے؟ اگر چھوڑ دے تو کھائے کہاں سے اور وہ کیوں پانچ سال اصول فقہ یا فقہ پڑھنے پر لگائے؟ پانچ سال میں بھی اتنی واقفیت پیدا نہیں ہو گی جتنی ہونی چاہیے۔ اس لیے مطالبے کرنے سے، جلوس نکالنے سے، بینر لگانے سے کوئی جج یا وکیل خود بہ خود فقہ کا ماہر نہیں ہو جائے گا۔ وہ فقہ کا ماہر تب بنے گا، جب وہ اسلامی علوم اور فقہ کو براہِ راست بنیادی مآخذ سے پڑھے گا،

اس لیے گفت گو میں تھوڑی سی تلخ نوائی کا عنصر آنے کی اجازت دیجیے۔ جب دار العلوم دیوبند قائم ہوا، اس وقت مسلمانوں کو مسئلہ کیا درپیش تھا؟ اس وقت مسلمانوں کو مسئلہ یہ درپیش تھا کہ انگریز نے پورے برصغیر پر قبضہ کر لیا تھا، مسلمانوں کے مذہبی اور دینی ادارے سب ختم کر دیے گئے تھے، اوقاف ایک ایک کر کے ضبط کر لیے گئے تھے، تعلیمی ادارے سب بند کر دیے گئے تھے۔ علمائے کرام جو سارے نظام کو چلا رہے تھے، ان کو ملازمتوں سے الگ کر دیا گیا تھا۔ عدالتوں کا نظام کسی نہ کسی حد تک شریعت کے مطابق تھا، اس کو ختم کر کے انگریزی عدالتیں قائم کر دی گئیں، انگریزی قانون شریعت کی جگہ نافذ کر دیا گیا۔ فارسی جو نظام حکومت کی زبان تھی، اس کو ختم کر کے انگریزی جاری کر دی گئی۔ جہاں جہاں مسلمان کارندے مقرر تھے، ان کی جگہ ہندو کارندوں کو مقرر کر دیا گیا۔ بڑے بڑے تمام مناصب پر انگریز آ گئے اور مسلمان منصب قیادت سے معزول ہو کر معاشرے کا ناپسندیدہ عنصر بنا دیے گئے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی عزت کا ذریعہ تھیں، وہ مسلمانوں کی ذلت کا ذریعہ بنا دی گئیں۔ مسلمانوں کا لباس، مسلمانوں کے عہدے، مسلمانوں کے مناصب، مسلمانوں کے القاب، ہر چیز جو اونچے درجے کی تھی اور قابل عزت سمجھی جاتی تھی، اس کو انگریز نے ذلت کی علامت بنا دیا۔ یہ وہ حالات تھے، جن میں مخلص اہل علم و دین نے یہ محسوس کیا کہ وہ نصاب یا وہ نظام جو آسانی سے اس وقت اپنایا جا سکتا ہے، وہ ماضی کا درس نظامی ہے، لہٰذا اس کو اپنا لیا جائے۔

اس وقت درس نظامی برصغیر کے بیش تر علاقوں میں رائج تھا۔ درس نظامی کیا ہے؟ یہ بھی میں ذرا وضاحت اور صراحت سے عرض کر دوں۔ درس نظامی نہ کوئی آسمانی چیز ہے، نہ اس کو اختیار کرنا شریعت کا کوئی حکم ہے، نہ خیر القرون میں، اسلام کے سنہری دور میں اس نام کی کوئی چیز پائی جاتی تھی۔ اس درس کا تذکرہ نہ قرآن میں آیا ہے، نہ حدیث میں، نہ اس کا اسلام کے مستقبل یا ماضی سے کوئی تعلق ہے۔ یہ چند ماہرین تعلیم اور علما کے اپنے تجربے پر مبنی ایک نصاب ہے، جو اپنے زمانے میں

ایک اچھی مفید چیز تھی۔ آج بھی اس میں ایک حد تک افادیت پائی جاتی ہے۔اس کی افادیت سے انکار نہیں۔

انگریز کی حکومت جب برصغیر میں قائم ہوئی تو اس وقت ہندوستان میں چار پانچ قسم کے درس رائج تھے۔ایک درس مشرقی ہندوستان، جون پور وغیرہ میں رائج تھا جو شیراز ہند کہلاتا تھا۔شیراز ہند اس لیے کہلاتا تھا کہ جون پور اور مشرقی علاقوں میں عقلیات اور فلسفے پر زور زیادہ تھا اور وہاں کے فارغ التحصیل حضرات منطق اور فلسفے کے ماہر ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں عقلیات پر جتنی کتابیں برصغیر میں لکھی گئیں، وہ اکثر و بیش تر جون پوریوں نے لکھیں۔ کئی اور اچھی کتابیں خیر آبادی اسکول کی طرف سے لکھی گئیں۔ فضل حق خیر آبادی اور فضل امام خیر آبادی اس اسکول کے معروف نام ہیں۔ جون پور اور اس کے اطراف کے علما کی لکھی ہوئی کتابیں ہدیہ سعیدیہ اور شمس بازغہ وغیرہ مشہور ہیں، جن سے آپ واقف ہیں۔

ایک دوسرا درس تھا جو افغانستان کے اثرات سے آیا تھا اور موجودہ صوبۂ سرحد، (خیبر پختون خوا) افغانستان اور موجودہ پنجاب وغیرہ میں رائج تھا۔ اس میں صرف و نحو اور نحوی بحثوں پر زور دیا جاتا تھا۔ کافیہ اور اس کی شرحیں پڑھنے پر لوگ دس دس سال لگا دیا کرتے تھے۔ کافیہ میں نحو کے قواعد کے بارے میں کیا لکھا ہے، اس سے پڑھنے پڑھانے والوں کو زیادہ بحث نہیں ہوتی تھی، لیکن مفرداً مرفوع ہے یا منصوب یا مجرور، اس پر تین تین دن بحث ہوتی رہتی تھی۔پھر کافیہ کی شرح، شرح جامی پڑھائی جاتی تھی۔ پھر شرح جامی کی شرح، پھر اس کے حواشی سوال باسولی، سوال کابلی، تحریر سنبٹ وغیرہ کا مرحلہ آتا تھا۔ یوں دس دس سال اس میں لگ جاتے تھے۔بہ ہر حال، یہ تخصص کا ایک میدان تھا۔اساتذہ اور طلبہ کی ایک تعداد کو اس سے دل چسپی تھی۔اس سرگرمی کی علمی افادیت کیا تھی؟ اس پر ہر ایک کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔جو حضرات اس سرگرمی کو پسند کرتے تھے، وہ ان کی رائے تھی، جس پر ہمیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔

تیسرا نصاب وہ تھا جو مغربی ہندوستان اور سندھ میں رائج تھا، جس میں علوم

اور اس کا فیصلہ کیسے کیا جائے کہ کوئی شخص عالم یا فقیہ ہے؟ انہوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں تین چار قسم کے نصاب رائج ہیں اور ہر نصاب کے فارغ التحصیل کو عالم کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کوئی ایسا نصاب ہونا چاہیے جو ان تینوں چاروں رائج الوقت نصابات کے خصائص کا جامع ہو۔ اب ان تینوں خصائص کا جامع نظام وہ تھا، جو فرنگی محل میں رائج تھا۔

فرنگی محل ایک بہت بڑے مکان کا نام تھا، جو جہاں گیر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا تھا۔ جہاں گیر اس زمانے میں بیمار ہوا۔ کئی مقامی طبیبوں، ویدوں اور دوسرے لوگوں نے اس کا علاج کیا، لیکن کام یاب نہیں ہوئے۔ ایک انگریز ڈاکٹر نے کام یاب علاج کر کے اس کی شکایت کو دور کر دیا۔ اس پر جہاں گیر نے خوش ہو کر پوچھا کہ کیا چاہیے؟ انگریز ہمیشہ اپنی قوم کا وفادار ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ میری قوم کے کچھ لوگ یہاں لکھنو میں تجارت کے لیے آئے ہیں، ان کو بعض اوقات مشکل پیش آتی ہے، اس لیے آپ ان کو تجارت کی اجازت دے دیں اور ان کو مناسب مراعات عطا کر دیں۔ اس پر جہاں گیر نے فرمان جاری کر دیا اور لکھنو میں ایک بہت بڑا محل یا کوٹھی ان کو دے دی۔ انگریزوں کی وجہ سے وہ کوٹھی فرنگی محل کہلاتی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں کسی حوالے سے اس کو خبر ملی کہ انگریزوں نے اس فرمان میں دی گئی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے، جو جہاں گیر نے طے کی تھیں اور بعض ایسے کام کیے ہیں جو حکومت کی پالیسیوں کے خلاف ہیں۔ اس پر اورنگ زیب نے وہ کوٹھی ضبط کر لی اور انگریز ساہو کاروں کو نکال کر وہ کوٹھی ملا نظام الدین سہالوی کو دے دی۔

ملا نظام الدین سہالوی اپنے وقت کے جید علما میں سے تھے۔ انہوں نے فتاویٰ عالم گیری کی تدوین کے کام کی نگرانی بھی کی تھی اور فقہ میں گہرا ادراک رکھتے تھے۔ اورنگ زیب کے مشورے پر انہوں نے اس عمارت میں ایک دینی درس گاہ قائم کی، جہاں فقہ کی تدریس پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ یہ درس گاہ مدرسہ فرنگی محل کے نام سے مشہور ہوئی، چناں چہ اس درس گاہ کے فارغ التحصیل علما فرنگی محلی

ایک اچھی مفید چیز تھی۔ آج بھی اس میں ایک حد تک افادیت پائی جاتی ہے۔ اس کی افادیت سے انکار نہیں۔

انگریز کی حکومت جب برصغیر میں قائم ہوئی تو اس وقت ہندوستان میں چار پانچ قسم کے درس رائج تھے۔ ایک درس مشرقی ہندوستان، جون پور وغیرہ میں رائج تھا جو شیراز ہند کہلاتا تھا۔ شیراز ہند اس لیے کہلاتا تھا کہ جون پور اور مشرقی علاقوں میں عقلیات اور فلسفے پر زور زیادہ تھا اور وہاں کے فارغ التحصیل حضرات منطق اور فلسفے کے ماہر ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں عقلیات پر جتنی کتابیں برصغیر میں لکھی گئیں، وہ اکثر وبیشتر جون پوریوں نے لکھیں۔ کئی اور اچھی کتابیں خیر آبادی اسکول کی طرف سے لکھی گئیں۔ فضل حق خیر آبادی اور فضل امام خیر آبادی اس اسکول کے معروف نام ہیں۔ جون پور اور اس کے اطراف کے علما کی لکھی ہوئی کتابیں ہدیہ سعیدیہ اور شمس بازغہ وغیرہ مشہور ہیں، جن سے آپ واقف ہیں۔

ایک دوسرا درس تھا جو افغانستان کے اثرات سے آیا تھا اور موجودہ صوبۂ سرحد، (خیبر پختون خوا) افغانستان اور موجودہ پنجاب وغیرہ میں رائج تھا۔ اس میں صرف ونحو اور نحوی بحثوں پر زور دیا جاتا تھا۔ کافیہ اور اس کی شرحیں پڑھنے پر لوگ دس دس سال لگا دیا کرتے تھے۔ کافیہ میں نحو کے قواعد کے بارے میں کیا لکھا ہے، اس سے پڑھنے پڑھانے والوں کو زیادہ بحث نہیں ہوتی تھی، لیکن مفرد امرفوع ہے یا منصوب یا مجرور، اس پر تین تین دن بحث ہوتی رہتی تھی۔ پھر کافیہ کی شرح، شرح جامی پڑھائی جاتی تھی۔ پھر شرح جامی کی شرح، پھر اس کے حواشی سوال باسولی، سوال کابلی، تحریر سنبٹ وغیرہ کا مرحلہ آتا تھا۔ یوں دس دس سال اس میں لگ جاتے تھے۔ بہ ہر حال، یہ تخصص کا ایک میدان تھا۔ اساتذہ اور طلبہ کی ایک تعداد کو اس سے دلچسپی تھی۔ اس سرگرمی کی علمی افادیت کیا تھی؟ اس پر ہر ایک کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ جو حضرات اس سرگرمی کو پسند کرتے تھے، وہ ان کی رائے تھی، جس پر ہمیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔

تیسرا نصاب وہ تھا جو مغربی ہندوستان اور سندھ میں رائج تھا، جس میں علوم

اور اس کا فیصلہ کیسے کیا جائے کہ کوئی شخص عالم یا فقیہ ہے؟ انھوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں تین چار قسم کے نصاب رائج ہیں اور ہر نصاب کے فارغ التحصیل کو عالم کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کوئی ایسا نصاب ہونا چاہیے جو ان تینوں چاروں رائج الوقت نصابات کے خصائص کا جامع ہو۔ اب ان تینوں خصائص کا جامع نظام وہ تھا، جو فرنگی محل میں رائج تھا۔

فرنگی محل ایک بہت بڑے مکان کا نام تھا، جو جہاں گیر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا تھا۔ جہاں گیر اس زمانے میں بیمار ہوا۔ کئی مقامی طبیبوں، ویدوں اور دوسرے لوگوں نے اس کا علاج کیا، لیکن کام یاب نہیں ہوئے۔ ایک انگریز ڈاکٹر نے کام یاب علاج کر کے اس کی شکایت کو دور کر دیا۔ اس پر جہاں گیر نے خوش ہو کر پوچھا کہ کیا چاہیے؟ انگریز ہمیشہ اپنی قوم کا وفادار ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ میری قوم کے کچھ لوگ یہاں لکھنو میں تجارت کے لیے آئے ہیں، ان کو بعض اوقات مشکل پیش آتی ہے، اس لیے آپ ان کو تجارت کی اجازت دے دیں اور ان کو مناسب مراعات عطا کر دیں۔ اس پر جہاں گیر نے فرمان جاری کر دیا اور لکھنو میں ایک بہت بڑا محل یا کوٹھی ان کو دے دی۔ انگریزوں کی وجہ سے وہ کوٹھی فرنگی محل کہلاتی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں کسی حوالے سے اس کو خبر ملی کہ انگریزوں نے اس فرمان میں دی گئی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے، جو جہاں گیر نے طے کی تھیں اور بعض ایسے کام کیے ہیں جو حکومت کی پالیسیوں کے خلاف ہیں۔ اس پر اورنگ زیب نے وہ کوٹھی ضبط کر لی اور انگریز ساہو کاروں کو نکال کر وہ کوٹھی ملا نظام الدین سہالوی کو دے دی۔

ملا نظام الدین سہالوی اپنے وقت کے جید علما میں سے تھے۔ انھوں نے فتاویٰ عالم گیری کی تدوین کے کام کی نگرانی بھی کی تھی اور فقہ میں گہرا ادراک رکھتے تھے۔ اورنگ زیب کے مشورے پر انھوں نے اس عمارت میں ایک دینی درس گاہ قائم کی، جہاں فقہ کی تدریس پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ یہ درس گاہ مدرسہ فرنگی محل کے نام سے مشہور ہوئی، چناں چہ اس درس گاہ کے فارغ التحصیل علما فرنگی محلی

کہلانے لگے۔ مولانا جمال میاں فرنگی محلی، عبدالوہاب فرنگی محلی، عبدالباری فرنگی محلی، یہ نام آپ نے سنے ہوں گے۔ یہ سب حضرات فرنگی محل کی اسی درس گاہ کے فارغ التحصیل تھے۔ فرنگی محل میں ملا نظام الدین سہالوی کا مرتب کردہ جو نصابِ تعلیم تھا، اس میں انہوں نے منطق، فلسفہ، نحو اور حدیث کے ساتھ ساتھ اصول فقہ اور فقہ کی بنیادی کتابیں بھی خصوصیت سے شامل کر دیں، اس لیے کہ وہ خود فقہ کے متخصص تھے، مفتی اور محتسب رہے تھے اور فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین میں بھی شریک رہے تھے۔

جب انگریزوں کو پتا چلا کہ فرنگی محل کا جو نصاب تعلیم ہے، اس میں فقہ کی اچھی بنیاد موجود ہے اور وہاں کے فارغ التحصیل حضرات فقہ کے ماہر ہوتے ہیں تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسی درس نظامی کے فارغ التحصیل حضرات کو قاضی و مفتی مقرر کیا جائے گا۔ چناں چہ بڑے پیانے پر اس درس گاہ کے فضلا کی مانگ ہونے لگی۔ چوں کہ یہ حضرات بڑی بڑی تن خواہوں پر قاضی و مفتی مقرر ہونے لگے، اس لیے درس نظامی کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ درس نظامی کے فارغ التحصیل حضرات کو ایک اچھا دنیاوی موقع ملا، ان کی تن خواہیں اچھی تھیں، ان کے وسائل اچھے تھے، معیارات اچھے تھے، اس لیے بڑے پیانے پر مدارس نے اسی نصاب کو اپنانا شروع کر دیا۔ ہوتے ہوتے اس نصاب کے فارغ التحصیل حضرات بڑی تعداد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمتوں میں آگئے۔ آپ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تاریخ میں بیسیوں علمائے کرام کے نام سنیں گے، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کے طور پر کام کرتے تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ کا نام آپ نے سنا ہو گا۔ وہ اسی درس نظامی کے پڑھے ہوئے تھے اور انگریزوں کے نظام میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ صدر الصدور تھے انہیں یعنی دہلی اور اس کے قرب و جوار کے مذہبی امور کے جتنے قاضی تھے، ان کی سربراہی ان کے پاس تھی۔ آپ انہیں اس علاقے کا چیف جسٹس کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

یہ نصاب تھا جس سے لوگ مانوس تھے اور گزشتہ کم و بیش سو برس یا ۸۰ برس

سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے؟

غرض حفظ قرآن اور میٹرک کے بعد تین چار سال کا ایک نظام اور نصاب ایسا ہو، جس میں بہ قدر ضرورت عربی زبان پڑھائی جائے۔ اتنی کہ طالب علم تفسیر اور حدیث کی کتابیں اور فقہ کی عام کتابیں پڑھ سکے۔ عربی زبان کے علاوہ حدیث اور علوم حدیث پر کوئی ایک آدھ جامع کتاب، مثلاً مشکوٰۃ کا انتخاب یا التاج الجامع للاصول، ترجمان السنۃ، معارف الحدیث یا کوئی اور اچھی کتاب پڑھا دی جائے۔ اسی طرح اردو کی کوئی تفسیر، مثلاً تفسیر عثمانی یا تفسیر ماجدی اور کوئی ایک عربی کی مختصر تفسیر پڑھائی جائے۔ ایک دو فقہ کی کتابیں ہوں اور کوئی ایک آدھ کتاب جدید معاشیات اور سیاسیات پر۔ اس طرح کا ایک تین سالہ یا چار سالہ نصاب ہو، جس میں تقریر کی مشق بھی ہو اور تجوید بھی اس میں شامل ہو۔ جو طالب علم یہ نصاب مکمل کر لے، وہ امام بننے کا اہل ہو اور اس کو پھر امام بننے کا موقع دینا چاہیے، تا کہ وہ اپنا اور ادارے کا مزید وقت اور وسائل ضائع نہ کرے، اس لیے کہ اس کو اس سطح سے آگے کام نہیں کرنا۔

اب یہ ایک تقاضا ہے جس کے لیے آپ جب تک کوئی نظام نہیں بنائیں گے، وہی کچھ ہوتا رہے گا، جو آج ہو رہا ہے۔ آپ سے ایک اور تلخ کی بات کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے اور جب تک آپ حقائق کا سامنا نہیں کریں گے، مستقبل کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ آج ہمارا امام جب معاشرے میں جا کر اپنی ذمے داریاں سنبھالتا ہے تو اکثر صورتوں میں وہ ذہنی، فکری اور تہذیبی طور پر اپنے کو وہاں اجنبی محسوس کرتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے جو کچھ پڑھا ہے، وہ سب اس معاشرے میں Irrelevant ہے اور یہاں لوگ جو سوال کر رہے ہیں، اس کا میرے پاس جواب نہیں ہے۔ اس صورت حال میں وہ اپنی پڑھی ہوئی از کار رفتہ یا فروعی اور غیر اہم چیزوں کو Relevant بنانے کے لیے وہاں وہ مسائل پیدا کرتا ہے، جن پر وہ ذرا طلاقتِ لسانی اور روانی سے گفت گو کر سکے اور اپنی علمیت کی دھاک بٹھا سکے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو اس کے اپنے مسائل ہیں، وہ

کہلانے لگے۔ مولانا جمال میاں فرنگی محلی، عبدالوہاب فرنگی محلی، عبدالباری فرنگی محلی، یہ نام آپ نے سنے ہوں گے۔ یہ سب حضرات فرنگی محل کی اسی درس گاہ کے فارغ التحصیل تھے۔ فرنگی محل میں ملا نظام الدین سہالوی کا مرتب کردہ جو نصابِ تعلیم تھا، اس میں انہوں نے منطق، فلسفہ، نحو اور حدیث کے ساتھ ساتھ اصول فقہ اور فقہ کی بنیادی کتابیں بھی خصوصیت سے شامل کر دیں، اس لیے کہ وہ خود فقہ کے متخصص تھے، مفتی اور محتسب رہے تھے اور فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین میں بھی شریک رہے تھے۔

جب انگریزوں کو پتا چلا کہ فرنگی محل کا جو نصاب تعلیم ہے، اس میں فقہ کی اچھی بنیاد موجود ہے اور وہاں کے فارغ التحصیل حضرات فقہ کے ماہر ہوتے ہیں تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسی درس نظامی کے فارغ التحصیل حضرات کو قاضی و مفتی مقرر کیا جائے گا۔ چناں چہ بڑے پیمانے پر اس درس گاہ کے فضلا کی مانگ ہونے لگی۔ چوں کہ یہ حضرات بڑی بڑی تن خواہوں پر قاضی و مفتی مقرر ہونے لگے، اس لیے درس نظامی کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ درس نظامی کے فارغ التحصیل حضرات کو ایک اچھا دنیاوی موقع ملا، ان کی تن خواہیں اچھی تھیں، ان کے وسائل اچھے تھے، معیارات اچھے تھے، اس لیے بڑے پیمانے پر مدارس نے اسی نصاب کو اپنانا شروع کر دیا۔ ہوتے ہوتے اس نصاب کے فارغ التحصیل حضرات بڑی تعداد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمتوں میں آ گئے۔ آپ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تاریخ میں بیسیوں علمائے کرام کے نام سنیں گے، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کے طور پر کام کرتے تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ کا نام آپ نے سنا ہو گا۔ وہ اسی درس نظامی کے پڑھے ہوئے تھے اور انگریزوں کے نظام میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ صدر الصدور تھے انہیں یعنی دہلی اور اس کے قرب و جوار کے مذہبی امور کے جتنے قاضی تھے، ان کی سربراہی ان کے پاس تھی۔ آپ انہیں اس علاقے کا چیف جسٹس کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

یہ نصاب تھا جس سے لوگ مانوس تھے اور گزشتہ کم و بیش سو برس یا ۸۰ برس

سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے؟

غرض حفظ قرآن اور میٹرک کے بعد تین چار سال کا ایک نظام اور نصاب ایسا ہو، جس میں بہ قدر ضرورت عربی زبان پڑھائی جائے۔ اتنی کہ طالب علم تفسیر اور حدیث کی کتابیں اور فقہ کی عام کتابیں پڑھ سکے۔ عربی زبان کے علاوہ حدیث اور علوم حدیث پر کوئی ایک آدھ جامع کتاب، مثلاً مشکوٰۃ کا انتخاب یا التاج الجامع للاصول، ترجمان السنۃ، معارف الحدیث یا کوئی اور اچھی کتاب پڑھا دی جائے۔ اسی طرح اردو کی کوئی تفسیر، مثلاً تفسیر عثمانی یا تفسیر ماجدی اور کوئی ایک عربی کی مختصر تفسیر پڑھائی جائے۔ ایک دو فقہ کی کتابیں ہوں اور کوئی ایک آدھ کتاب جدید معاشیات اور سیاسیات پر۔ اس طرح کا ایک تین سالہ یا چار سالہ نصاب ہو، جس میں تقریر کی مشق بھی ہو اور تجوید بھی اس میں شامل ہو۔ جو طالب علم یہ نصاب مکمل کر لے، وہ امام بننے کا اہل ہو اور اس کو پھر امام بننے کا موقع دینا چاہیے، تاکہ وہ اپنا اور ادارے کا مزید وقت اور وسائل ضائع نہ کرے، اس لیے کہ اس کو اس سطح سے آگے کام نہیں کرنا۔

اب یہ ایک تقاضا ہے جس کے لیے آپ جب تک کوئی نظام نہیں بنائیں گے، وہی کچھ ہوتا رہے گا، جو آج ہو رہا ہے۔ آپ سے ایک اور تلخی کی بات کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے اور جب تک آپ حقائق کا سامنا نہیں کریں گے، مستقبل کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ آج ہمارا امام جب معاشرے میں جا کر اپنی ذمے داریاں سنبھالتا ہے تو اکثر صورتوں میں وہ ذہنی، فکری اور تہذیبی طور پر اپنے کو وہاں اجنبی محسوس کرتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے جو کچھ پڑھا ہے، وہ سب اس معاشرے میں Irrelevant ہے اور یہاں لوگ جو سوال کر رہے ہیں، اس کا میرے پاس جواب نہیں ہے۔ اس صورت حال میں وہ اپنی پڑھی ہوئی از کار رفتہ یا فروعی اور غیر اہم چیزوں کو Relevant بنانے کے لیے وہاں وہ مسائل پیدا کرتا ہے، جن پر وہ ذرا طلاقتِ لسانی اور روانی سے گفت گو کر سکے اور اپنی علمیت کی دھاک بٹھا سکے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو اس کے اپنے مسائل ہیں، وہ

لوگوں کے بھی مسائل بن جائیں۔ جب وہ ان کے مسائل بن جائیں گے اور وہ پوچھیں گے تو میں ان کا جواب دوں گا۔ وہ مسائل کیا ہوتے ہیں؟ وہ فرقہ وارانہ فروعی مباحث ہوتے ہیں۔ اب عامۃ الناس اور سادہ لوح مخلص نمازیوں میں جن بے چاروں کو ان لایعنی اور فروعی مباحث کا کچھ پتا نہیں ہوتا اور نہ کبھی ان کے ذہن میں یہ خیال آیا ہوتا ہے کہ حضور نور تھے یا بشر تھے، ان کے لیے امام یہ مسئلہ پیدا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم واجب التعمیل ہے، یہ کوئی نہیں بتاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شریعت اور صراط مستقیم کیا تقاضا کرتی ہے؟ اس سے امام کو بحث نہیں ہوتی۔ لوگوں کی زندگیاں کیسے تبدیل ہوں، لادینیت اور مغربیت کے منفی اثرات کو کیوں کر روکا جائے، اس سے نہ نوریوں کو بحث ہوتی ہے نہ بشریوں کو۔ اس کے برعکس ایک اس پر زور دینا شروع کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے اور دوسرا اس پر کہ آپ نور تھے۔ یہ نور کا ایک محدود مفہوم بیان کرتا ہے، وہ بشر کا ایک محدود مفہوم بیان کرتا ہے اور جب علم کی کمی کی وجہ سے لوگوں کا ایک گروہ ان امور کو دین کے سب سے اہم اور بنیادی مسائل مان کر امام صاحب کی قیادت کو قبول کر لے گا اور اس کام میں ان کے بپا کردہ معرکوں میں دامے، درمے، سخنے، بل کہ دستے وچوبے (اور اب توبندوقے و کلاشنکوفے) حصہ لینے کے لیے تیار ہو جائے گا تو اب امام صاحب کی نوکری پکی ہو جائے گی اور انہیں کوئی وہاں سے نہیں ہٹائے گا۔ یہ ایک افسوس ناک اور تلخ حقیقت ہے، جس پر غور کرنا چاہیے۔ اس کو محض تنقید کے مفہوم میں نہ لیں۔ جب تک مرض کی آپ تشخیص نہیں کریں گے، اس وقت تک اس کا علاج نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا ان خرابیوں کو دور کرنے کا راستہ یہی ہے کہ امام کو اس کام کے لیے تیار کریں، جو شریعت نے اس کے سپرد کیا ہے۔ اس کو وہ علم دیں جس کی معاشرے کو ضرورت ہے۔ جب اسے معاشرے کے زندہ مسائل معلوم ہوں گے تو وہ غیر متعلق مسائل پیدا نہیں کرے گا۔

اس کے بعد تعلیم کا دوسرا درجہ ان لوگوں کے لیے ہے، جو دینی علوم کے

مدرس یا معلم بننا چاہتے ہیں۔ آج پاکستان کے ہر اسکول اور کالج میں ایف اے تک اسلامیات لازمی ہے۔ بہت سے لوگ بی اے میں بھی اسلامیات کے مضامین پڑھتے ہیں۔ ہر کالج اور ہر اسکول میں اسلامیات کے ٹیچر ہوتے ہیں۔ یہ دو طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو سرکاری اداروں سے ایم اے کرکے آئے ہیں، جن کا علم عموماً بڑا کمزور، سطحی اور ناپختہ ہوتا ہے۔ وہ اردو میں درسی کتابیں اور خلاصے پڑھ کر امتحان پاس کر لیتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ قرآن پاک ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ میں نے اسلامیات کے ایسے اساتذہ دیکھے ہیں، جن سے نماز پڑھانے کے لیے کہا جائے تو نماز نہیں پڑھا سکتے۔ قرآن پاک کی شاید چار سورتیں بھی ان کو حفظ نہ ہوں، اس لیے کہ قرآن پاک انہوں نے پڑھا ہی نہیں ہوتا۔ اردو میں چند کتابیں پڑھ کر امتحان پاس کر لیتے ہیں۔ یوں ایم اے اسلامیات کی ڈگری ان کو مل جاتی ہے اور وہ اسلام کے مجتہد اور مفتی بھی بن جاتے ہیں۔ یہ ایک دوسری خطرناک بات ہے جو ہو رہی ہے۔ اسلامیات کے مدرسین میں دوسرے وہ لوگ ہیں جو مدرسوں کی لائن سے آئے ہیں۔ مدرسوں میں میبذی، شرح عقائد اور خیالی قسم کی جو اسلامیات پڑھائی جاتی ہے، وہ نئے ماحول اور نئے اداروں میں زیادہ کام نہیں آتی۔ فقہی اور کلامی نوعیت کے اختلافی مباحث بھی اسکولوں اور کالجوں کے ماحول میں زیادہ مقبول نہیں ہوتے۔ یہاں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لیے ہم نے ان لوگوں کو تیار نہیں کیا۔ تدریسی ضروریات کے اس مقصد کے لیے ابتدائی تین چار سال کے بعد مزید تین سال کا ایک نصاب ہونا چاہیے، جس کا مقصد یہی ہو کہ آپ کو اسکولوں اور کالجوں کے لیے اسلامیات کے معلم تیار کرنے ہیں۔ اس سطح پر عربی ادب کی چند کتابیں، تاریخ اسلام، سیرت، اسلامی معاشیات، فقہ، عقائد کے ساتھ ساتھ حدیث اور تفسیر کا بہ قدر ضرورت حصہ شامل ہونا چاہیے۔ مزید برآں تاریخ پاکستان اور جدید دنیائے اسلام سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

اس کے بعد تیسری ضرورت یہ ہے کہ ہمیں ایسے لوگ درکار ہیں، جو خود ان دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے علوم کے اعلیٰ درجے کے متخصص ہوں، اونچے

درجے کے مضامین اور اعلیٰ سطح کی کتابیں پڑھا سکیں اور اعلیٰ درجے کے علوم وفنون کی تدریس کرسکیں۔ ہمیں فقہاء درکار ہیں، محدثین درکار ہیں، مفسرین درکار ہیں، مفتی درکار ہیں، جو اپنے اپنے علوم کے متخصص ہوں۔ اس کے لیے الگ سے چار پانچ سال کی تیاری درکار ہے۔ جب تک وہ تیاری نہیں ہو گی، مطلوبہ افراد تیار نہیں ہوں گے۔

اس وقت درس نظامی میں کیا ہوتا ہے؟ درس نظامی میں اس وقت ان اسلامی علوم میں سے کسی میں تخصص کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔ درس نظامی میں سب سے Neglected چیز قرآن پاک ہے، جس پر سب سے کم توجہ دی جاتی ہے۔ اب بعض مدارس میں ترجمۂ قرآن شروع ہو گیا ہے۔ اول سے آخر تک لفظی ترجمہ پڑھا دیتے ہیں، جس کی نوعیت اس عوامی درس قرآن سے مختلف نہیں ہوتی جو بہت سی مسجدوں میں ہوتا ہے، جس میں بیٹھ کر لوگ ثواب کی خاطر درس سن لیتے ہیں۔ ایک عالم صاحب نے درس دے دیا، لوگوں نے عقیدت سے سن لیا۔ کچھ یاد رہا، کچھ یاد نہیں رہا۔ اسی طرح سے مدرسوں میں جو درس ہوتا ہے، وہ اکثر لوگوں کو یاد نہیں رہتا۔ اس درس میں علوم قرآن، علم تفسیر، مضامین قرآن، مشکلات قرآن جیسے مباحث کو تو جانے دیجیے، قرآن کی تعلیم، قرآن کی دی ہوئی ہدایت اور دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلے میں قرآن کا امتیاز، یہ مضامین بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تفسیر کے عنوان سے مدرسوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ بیضاوی کی سورۂ بقرہ ہے۔ میرے خیال میں بیضاوی کوئی اچھی تفسیر نہیں ہے۔ میں امام بیضاوی کے پورے احترام کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں۔ نہ ان کی یہ کتاب تفسیر کا اچھا نمونہ ہے، نہ کسی اور چیز کا۔ تفسیر بیضاوی انہوں نے کیوں لکھی؟ وہ اصل میں متکلم تھے اور اصول فقہ کے آدمی تھے۔ انہوں نے بہ طور متکلم یہ دیکھا کہ زمخشری کی تفسیر بہت مقبول ہو رہی ہے۔ زمخشری کے ہاں قرآن پاک کے بلاغی نکتوں کے پہلو بہ پہلو معتزلی عقائد بھی بہ کثرت آ گئے ہیں۔ اس پر انہوں نے سوچا کہ زمخشری کی تفسیر سے بلاغت کے نکتے تو لے لیے جائیں، لیکن معتزلی عقائد کو نکال کر اشعری عقائد بیان کر دیے جائیں اور اس طرح

سے ایک نئی تفسیر مرتب کر دی جائے۔ اب جن جن باتوں میں انہوں نے زمخشری کی تردید کی ضرورت سمجھی، وہ ساری سورۂ بقرہ میں آ گئیں، اس لیے وہ تو بڑی لمبی ہو گئی اور باقی تفسیر میں بس مختصر حواشی ہیں، جنہیں کوئی پڑھتا نہیں۔ بیضاوی پر اکتفا کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عملاً تفسیر قرآن تو طلبہ کو پڑھائی نہیں جاتی۔ میں نے جید علما میں سے بھی بہت سوں کو دیکھا کہ نہ علم تفسیر سے واقف ہیں، نہ علوم قرآن میں جو مسلمانوں کے کارنامے ہیں، ان سے آشنا ہیں نہ از خود ان کو قرآن مجید پر تدبر کا موقع ملا۔ اکثر لوگوں کو بڑی تفسیروں کے نام بھی پتا نہیں ہوتے۔ آپ چاہیں تو بیضاوی کے کسی استاد سے پوچھ کر دیکھ لیں کہ دس بہترین تفسیروں کے نام بتادیں تو شاید طبری اور ایک آدھ کے علاوہ وہ کوئی قابل ذکر نام بھی نہ بتا سکیں۔ یہ اکثر صورتوں میں واقفیت کا عالم ہوتا ہے۔ بعض صورتیں بلاشبہ مستثنیٰ ہیں۔

اب اگر قرآن پاک ہمارے علوم وفنون، ہماری فکر، ہماری تہذیب اور پوری زندگی کی اساس ہے تو پھر اس کو فی الواقع تعلیم کی بھی اساس ہونا چاہیے۔ یہ بات کہ آپ نے پہلے طالب علم کو ساری چیزیں پڑھا کر اس کے ذہن کا ایک سانچا بنایا، اس کے بعد اس سانچے کے مطابق آپ اسے قرآن پڑھا رہے ہیں، یہ میرے خیال میں قرآن مجید کی توہین ہے۔ قرآن اصل سانچا ہے۔ قرآن کے سانچے سے باقی علوم کو جانچنا چاہیے۔ باقی علوم کے سانچے سے قرآن کو نہیں جانچنا چاہیے۔ کسی کو اچھا لگے یا برا لگے، میں اس کو غلط سمجھتا ہوں اور بہ بانگ دہل غلط کہتا ہوں۔ قرآن معیار ہے، قرآن اصل کسوٹی ہے، قرآن کے معیار اور کسوٹی پر فقہ، اصول فقہ، عقائد اور ہر چیز کو جانچنا چاہیے۔ ہم پہلے متاخرین کے مرتب کردہ عقائد اور فتاویٰ اور فروعی وذیلی مباحث پڑھا کر طالب علم کا ایک ذہن بناتے ہیں، پھر اس سے کہتے ہیں کہ اب اس ذہن سے قرآن کو پڑھو۔ جہاں قرآن پاک کے الفاظ تمہارے ذہن کا ساتھ نہ دیں، وہاں اللہ کی کتاب کے الفاظ کو توڑو اور مروڑو اور توڑ مروڑ کر اپنے گروہ کے خیالات کے مطابق ایڈجسٹ کرو۔ یہ میرے خیال میں قرآن کا صحیح استعمال نہیں ہے۔ اس لیے میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ علوم قرآن کی تعلیم کا ایک نیا نظام

ہونا چاہیے۔ کیا ہونا چاہیے؟ یہ سوال ایک تفصیلی گفت گو کا متقاضی ہے۔ اس پر کبھی بات ہو گی تو میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ علوم قرآن میں تخصص موجودہ درس نظامی سے حاصل نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ اپنی ذاتی دل چسپی یا ذوق سے پیدا کرلیں تو کرلیں، نظام میں اس کا بندوبست نہیں ہے۔ کوئی Inherent Mechanism نظام میں نہیں ہے کہ قرآن کے متخصصین پیدا ہوں۔

یہی حال علم حدیث کا ہے۔ علم حدیث کا متخصص از خود کوئی پیدا ہو جائے، اللہ تعالیٰ انور شاہ کشمیری کی طرح کے کسی آدمی کو پیدا کر دے تو کر دے، لیکن اس نصاب کو پڑھ کر جو لوگ تیار ہوتے ہیں، ان میں کوئی حدیث اور علوم حدیث کا متخصص نہیں ہوتا۔ ان کو محض چند فقہی اور کلامی موضوعات سے متعلق وہ حدیثیں یاد ہوتی ہیں، جن میں فقہائے احناف کا کوئی کلام یا فقہائے شوافع کا کوئی متدل ہے۔ مدارس میں تین تین ماہ تک اس پر بحث ہوتی رہتی ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی؟ یہاں لوگوں کے ایمان ضائع ہو رہے ہیں۔ لوگ ایمان ہی کو نہیں مان رہے کہ ایمان بھی کوئی چیز ہے۔ آپ اس کو چھوڑ کر تین مہینے اس پر بحث کرتے رہتے ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے کسی کو بحث نہیں۔ آپ نے ایمان کے بارے میں کیا فرمایا، وہ کسی کا Concern نہیں۔ لوگوں کا مسئلہ صرف یہ ہے کہ اپنے کسی مقتدا یا پیشوا کے نقطۂ نظر کو کسی نہ کسی تاویل یا عقلی احتمالات کے بل بوتے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت کر دیں۔ اس کے بعد اگلے چھ مہینے ان احادیث پر خرچ ہو جاتے ہیں، جن میں فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین کی طرح کے اختلافی موضوعات بیان ہوئے ہیں۔ اس کے بعد جو طالب علم سب سے تیز پڑھنے والا ہوتا ہے، اس کو حکم ہوتا ہے کہ تم حدیث کی کتابوں کے صفحات پڑھو اور روزانہ چالیس صفحے پڑھو۔ اس تیز خوانی میں نہ استاد کو اس سے کوئی بحث ہوتی ہے اور نہ شاگردوں کو ہی کچھ پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی، جو ساری شریعتوں کا ناسخ اور ہر چیز

کا معیار ہے اور جس کے بعد ہر بات کالعدم ہے، میں کیا بات کہی گئی ہے۔ شروع کے چند اختلافی مباحث کے علاوہ مضامین حدیث اور جواہر نبوت سے طلبہ جوں کے توں ناواقف رہتے ہیں۔

یہی حال کتب حدیث کی شرحوں کا ہے۔ کتب حدیث کی شروح کو دیکھیے۔ جو شروع کی بحثیں ہیں، ان میں ایک باب تین جلدوں میں آیا ہے تو دوسرا باب چار جلدوں میں، جب کہ آخر میں تین تین چار چار سطروں کے حاشیے ہیں کہ **کذا قال فلانیا قد سبق البحث عنه یا انظر الکتاب الفلانی**۔ یہ شرحوں کی کیفیت ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ حدیث میں بھی کوئی تخصص مدارس کے موجودہ نصاب اور طرز تدریس کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوتا۔ فقہ میں تخصص کی صورت حال بھی یہی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان اہم اسلامی تخصصات کے لیے متخصصین کی تیاری کا ایک نیا نصاب ہونا چاہیے، جس میں درس نظامی کی ساری کتابیں شامل ہوں۔ درس نظامی کی کسی کتاب کو میں متخصصین کے لیے غیر ضروری نہیں سمجھتا، لیکن درس نظامی کی ان کتابوں کے ساتھ مزید بہت کچھ شامل کرنا ضروری ہے، تاکہ واقعی ایسے متخصص پیدا ہوں جو اس فن یا علم کو آگے چل کر پڑھا سکیں۔ تفسیر، حدیث اور فقہ میں تخصص کے نصابات تیار کرنے کی ذمے داری ایک اجتماعی ذمے داری ہے۔ اس پر جب بھی کوئی سنجیدہ گفت گو ہو گی تو میں بھی اپنی گزارشات پیش کروں گا۔ ان اہم اسلامی علوم کے متخصصین کی تیاری ایک فوری اور انتہائی اہمیت کا کام ہے۔ وطن عزیز میں علوم اسلامیہ کے مستقبل کو یقینی بنانے کے لیے یہ قدم ایک بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

دینی تعلیم کے یہ تین درجے تو عام ہیں، جن کی ملک وملت کو ہر وقت ضرورت ہے۔ ان کے بعد ایک درجہ اور ہے جس کے لیے مزید محنت درکار ہے۔ یہ درجہ ایسے جید ماہرین ومفکرین کی تیاری اور تربیت کا درجہ ہے جو مغربی علوم وفنون کی تنقیح کا فریضہ انجام دے سکیں اور ناقدانہ جائزہ لے کر یہ بتا سکیں کہ ان میں کیا چیز کم زور ہے اور کیا چیز مضبوط ہے؟ کون سی بات اسلام کے مطابق ہے اور کون سی اسلام کے

مطابق نہیں ہے؟ ان ماہرین میں جو فقہ کا متخصص ہو، وہ مغربی قانون کا تنقیدی جائزہ لے۔ جو فقہ المعاملات کا متخصص ہو، وہ ان کی معاشیات کا جائزہ لے۔ جو اصول فقہ کا متخصص ہو، وہ ان کے اصول قانون کا جائزہ لے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اس میں کتنا وقت لگے گا، کتنے وسائل درکار ہوں گے، آخر کار کتنے لوگ تیار ہوں گے، وہ کیا کیا کام کر سکیں گے؟ یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن جب تک یہ سارے کام نہیں ہوں گے، اس وقت تک امت مسلمہ کا مستقبل اس طرح بن نہیں سکتا، جس طرح ہم بنانا چاہتے ہیں۔ ماہرین اور مستقبل کے فکری اور تہذیبی معماروں کی تیاری کا یہ کام دنیا کی بہت سی قومیں کرتی ہیں۔ مغربی اقوام میں تو اس غرض کے لیے بیسیوں ادارے بنائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی گوکھلے نے انیسویں صدی کے آخر میں اسی غرض کے لیے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ بنایا تھا۔ علامہ اقبال کے ذہن میں بھی ایسے ہی ایک ادارے کا نقشہ تھا۔

آج صورت یہ ہے کہ ملک وملت کا اجتماعی نظام ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اسلام سے براہِ راست واقف نہیں ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی تو ہے اور ان میں بہت سے اچھے مسلمان بھی ہیں، لیکن جذباتی وابستگی کی بنیاد پر عمارت بنانے کی مثال ایسے ہی ہے، جیسے آپ ریت پر بیس منزلہ عمارت بنانا چاہیں۔ جیسے وہ قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح یہ عمارت بھی لازماً گر جائے گی۔ چناں چہ جب کبھی بھی تھوڑی سی ایسی کوئی بات آتی ہے جو اس طبقے کے خیالات سے مختلف ہو تو وہ فوراً اس کی دوراز کار تاویلوں میں عافیت سمجھتے ہیں، کیوں کہ ان کا پیراڈائم اور Intellectual Framework اسلامی نہیں ہے۔ ان کے ہاں فہم اسلام کی کوئی مضبوط علمی اور فکری بنیاد نہیں ہے۔ اس لیے یہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس فکری بنیاد کی فراہمی کے لیے وقت درکار ہے۔ یہ کام ایک دو دن میں نہیں ہو گا۔ کسی وعظ یا مطالبے یا بینر یا دھرنے سے نہیں بنے گا۔ اس کے لیے لگ کر کام کرنا پڑے گا۔

حاضرین محترم! یہ وہ چند باتیں تھیں جو میں اسلامی علوم وفنون کے طلبہ سے کرنا

چاہتا تھا۔ چوں کہ آپ بھی اسی میدان کے شہ سوار ہیں اور اس ضرورت کی تکمیل کی ذمے داری آپ کے کندھوں پر بھی ہے، اس لیے میری گفت گو میں تھوڑی سی تلخی آ گئی جو میں نے جان بوجھ کر شامل کی ہے، تا کہ اس تلخی کا احساس آپ کو یہ سوچنے پر مجبور کرے کہ ہم جو بات کر رہے ہیں، اس کا تعلق کسی ذہنی عیاشی یا محض کسی عام تفریحی فکری سر گرمی سے نہیں ہے، بل کہ وہ واقعی بڑی اہم بات اور مسلمانوں کی ایک نا گزیر ضرورت ہے۔ میں علامہ اقبال کے ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ زبور عجم کا شعر ہے:

نوائے من ازاں پر سوز و بے باک و غم انگیز است

بخاشاکم شرار افتاد و باد صبح دم تیز است

یعنی میں اس لیے تلخ باتیں کر رہا ہوں کہ میرے آشیانے کو آگ لگ گئی ہے اور ہوا تیز ہے۔ آشیانے کو ابھی اور فوراً بچانے کی ضرورت ہے۔ امر واقعہ یہی ہے کہ ہمارے ملی اور تہذیبی آشیانے کو آگ لگ چکی ہے اور باد صبح دم تیز ہے۔ آشیانہ جل جانے کا خطرہ ہے اور بہت جلد اس کو بچانے کی ضرورت ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دینی مدارس میں تخصص اور اعلیٰ تعلیم و تحقیق

ماہنامہ الشریعہ۔ گجراں والا

دینی مدارس میں تخصص اور اعلیٰ تعلیم و تحقیق

دینی مدارس میں درجاتِ تخصص کا قیام اور اسلامی علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کا بندوبست وقت کی ایک ایسی اہم اور فوری ضرورت ہے، جس کی اہمیت اور فوری نوعیت کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بہت سے مدارس میں درس نظامی کے بعد تخصص اور تکمیل کے شعبے گزشتہ چند عشروں کے دوران کثرت سے قائم ہوئے ہیں۔ تخصص اور تکمیل کے یہ شعبے عموماً تفسیر، فقہ، فتوے اور تجوید وقرأت کے میدانوں سے متعلق ہیں۔ بلاشبہ یہ شعبے مفید کام کر رہے ہیں اور ان کی موجودگی سے اسلامی تخصصات کی اہمیت کا احساس بڑھا ہے، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی شعبے سے تخصص کے وہ مقاصد اب تک کماحقہ پورے نہیں ہو سکے، جن کی آج ملک وملت کو شدید ضرورت ہے۔

تخصص کے شعبے کا مقصد درج ذیل قسم کے اصحاب کی تیاری ہونا چاہیے:

۱۔ نمایاں اسلامی علوم (تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، اسلامی معاشیات) کے اعلیٰ مضامین کی تدریس کے لیے ایسے اساتذہ کی تیاری، جو ان مضامین کی اعلیٰ سطح پر کماحقہ تعلیم دے سکیں اور دینی مدارس کے طلبہ کو آنے والے چیلنجوں اور خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر سکیں۔

۲۔ ایسے علمائے کرام کی تیاری جو ملکی جامعات اور عصری تعلیمی اداروں میں اعلیٰ سطح پر اسلامی علوم کی تدریس کی ذمے داریاں کامیابی سے انجام دے سکیں اور

وطن عزیز میں نفاذ اسلام کے عمل کی موثر رہنمائی کر سکیں۔

۳۔ ایسے اہل علم اور اصحاب تخصص کی تیاری جو اسلامی علوم کے بارے میں پیدا کی جانے والی بد گمانیوں اور اسلامی عقائد و احکام کے بارے میں کیے جانے والے اعتراضات کا مدلل اور تسلی بخش جواب دے سکیں۔

۴۔ ایسے اہل علم کی تیاری جو اپنی عمیق دینی مہارت کی بنیاد پر مغربی علوم و فنون کا ناقدانہ جائزہ لے سکیں اور مغربی افکار و تصورات کا اسلامی شریعت کی روشنی میں تنقیدی مطالعہ کر کے ان کے رطب و یابس کو الگ الگ کر سکیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ دینی مدارس کے نظام اور نصاب میں ان میں سے کسی بھی ضرورت کی تکمیل کا کوئی بندوبست نہیں۔ تفسیر میں تخصص کے شعبے متعدد مدارس میں قائم ہیں، لیکن وہ چند ماہ میں پورا قرآن حکیم کسی ایک استاد یا مفسر کے طرز تفسیر کے مطابق سرسری طور پر پڑھا دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان تفسیری پروگراموں کے فارغ التحصیل اصحاب زیادہ سے زیادہ اپنے شیخ کے طرز پر عوامی یا مناظرانہ انداز کا درس قرآن دینے کے قابل تو ہو سکتے ہیں، لیکن ان پروگراموں کے نتیجے میں وہ علوم قرآن، ذخائر تفسیر، تفسیر کے مہتم بالشان مسائل، مناہج مفسرین، دور جدید میں قرآن پاک پر کیے جانے والے اعتراضات اور شبہات، تاریخ تدوین قرآن اور ان جیسے امہات مسائل سے اکثر ناواقف ہی رہتے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ آج قرآن پر از سر نو اعتراضات اور شبہات کی لہریں زور و شور کے ساتھ مشرق و مغرب میں پھیل رہی ہیں۔ قرآن مجید کی تفسیر و تشریح کے بارے میں طرح طرح کے شبہات عقلی و علمی انداز میں مشرق و مغرب میں اٹھائے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے ان روز افزوں اعتراضات اور شبہات کا مدلل اور سنجیدہ جواب دینے کے لیے جس طرح کے متخصص اہل علم درکار ہیں، وہ ناپید ہیں، یہاں تک کہ خود مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں یہ نئے گمراہ کن اسالیب جگہ پا رہے ہیں اور مسلمان طلبہ کے ذہنوں کو پراگندہ اور پریشان کر رہے ہیں۔

یہی حال حدیث اور فقہ کے تخصص کا ہے۔ علم حدیث کے وسیع ذخائر، علوم

حدیث کے لا متناہی دفاتر اور معارف حدیث کے عمیق مباحث عموماً تخصص حدیث کے شعبوں میں بار نہیں پاتے۔ حدیث میں تخصص اور دو دو سال میں دورۂ حدیث کرنے والے طلبہ علوم حدیث کے امہات مسائل، بل کہ اہم کتابوں کے ناموں تک سے ناواقف رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تخصص حدیث دراصل احادیث احکام کے مسلکی مطالعے سے عبارت بن کر رہ گیا ہے۔ مختلف مسالک کے اہل علم نے اپنے اپنے مسلک کی تائید کے نقطۂ نظر سے منتخب احادیث کے مطالعے کو تخصص کا نام دے دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طلبہ کو اپنے اپنے فقہی اور کلامی موقف کے بارے میں چند گنی چنی احادیث اور روایات کے بارے میں تو واقفیت خوب ہو جاتی ہے، لیکن علوم حدیث کے اعلیٰ مباحث، ہدایت نبوی کے حقائق و معارف اور محدثین اسلام کی غیر معمولی کاوشیں طلبہ کی پہنچ سے باہر رہتی ہیں۔ یہی، بل کہ اس سے بھی گیا گزرا حال فقہ کے تخصص کا ہے۔

اس صورت حال میں اب تک کیے جانے والے تجربات پر از سر نو غور کرکے تخصصات کے ایسے نئے نصاب اور نظام کی تیاری کی فوری ضرورت ہے، جہاں دینی مدارس کے فارغ التحصیل اصحاب سے ذی استعداد نوجوان اہل علم کو منتخب کرکے متعلقہ اسلامی علوم وفنون میں ٹھوس تربیت دی جائے۔ لیکن تخصص کا کوئی بھی نظام یا نصاب اس وقت تک موثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا، جب تک تعلیم کے ابتدائی مراحل پر بھی بھرپور اور تفصیلی نظر ثانی نہ کی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تخصص کے لیے جس صلاحیت اور سطح کے رجال کار اور طلبہ درکار ہوں گے، جب تک وہ بنیادی اسلامی علوم میں گہری استعداد اور علوم آلیہ سے اچھی طرح واقفیت نہ رکھتے ہوں، ان کے لیے تخصص کی سطح پر اعلیٰ تعلیم کا حصول ممکن نہ ہو گا۔ اس لیے تخصص پر گفت گو کرنے سے پہلے چند ضروری اشارات قبل از تخصص مراحل کے بارے میں بھی پیش کرنا ضروری ہے۔

اس وقت امر واقعہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کی بہت بڑی تعداد مساجد کی امامت اور خطابت کے فرائض سرانجام دی رہی ہے۔ بلاشبہ مساجد کی

امامت اور خطابت مسلم معاشرے میں ایک انتہائی اور بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ معاشرے کی دینی تشکیل اور رائے عامہ کی اسلامی تربیت میں ائمہ اور خطبا کے کام کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی باک نہیں کہ درس نظامی کا موجودہ نظام اور نصاب پاکستان کے لیے مطلوبہ صلاحیت اور صفات کے ائمہ اور خطبا تیار نہیں کرتا۔ امامت و خطابت کے لیے بہت سی ضروری صلاحیتوں کی تیاری کا بندوبست درس نظامی میں موجود نہیں۔ اسی طرح مستقبل کا امام بہت سی ایسی چیزیں پڑھنے پر خود کو مجبور پاتا ہے، جو اس کے لیے امامت اور خطابت میں کسی بھی حیثیت سے کار آمد نہیں۔ منطق اور قدیم یونانی فلسفے کے اعلیٰ مسائل سے پاکستان میں کسی بھی امام کو کوئی واسطہ نہیں پڑتا۔ اس لیے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدارس کے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح کے تین، بل کہ چار سالوں کا نصاب اس طرح تیار کیا جائے کہ اس کے فارغ التحصیل حضرات اچھے امام، اچھے خطیب یا ابتدائی مدرس اور سرکاری اسکولوں کے اچھے مدرس بن سکیں۔ اس سطح پر درس نظامی کی عام کتابوں کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشیات، اسلام کے سیاسی افکار، سیرۃ النبی، صدر اسلام کی تاریخ، تاریخ پاکستان، برصغیر میں اسلامی تحریکات کی تاریخ جیسے موضوعات کے علاوہ تجوید و قرأت کے مضامین کو لازمی طور پر شامل کیا جائے۔ اس سطح پر اردو و عربی کی ایک آسان تفسیر اور حدیث کی دو یا تین کتب ضرور شامل ہوں۔ ابتدائی سالوں میں جب طلبہ کی عربی کی استعداد زیادہ نہ ہو تو اردو میں دست یاب احادیث کے مجموعوں میں سے کوئی ایک مجموعہ منتخب کیا جا سکتا ہے۔ میری ناچیز رائے میں سال اول و دوم میں معارف الحدیث اور سال سوم اور چہارم میں ترجمان السنۃ شامل کی جا سکتی ہیں۔ مزید بر آں فقہ اور اصول فقہ کی متداول درسی کتب کے ساتھ ساتھ ایک یا دو کتابیں اردو اور آسان عربی میں شامل ہونی چاہییں۔ علمائے ندوہ نے اور مولانا محمد انور بدخشانی نے یہ کام بہت آسان کر دیا ہے۔

جو طلبہ نصاب کا یہ مرحلہ مکمل کرلیں، ان کو مناسب سند دے کر ادارے سے فارغ التحصیل کر دیا جائے۔ میری ذاتی رائے میں طلبہ کا تقریباً پچاس فی صد حصہ

اس مرحلے پر فارغ ہو کر چلا جائے۔ اگلے مرحلے کے لیے صرف ذی استعداد طلبہ قبول کیے جائیں، جن کا اصل مقصد امامت، خطابت، ابتدائی اداروں کی تدریس یا سرکاری اسکولوں کی ملازمت نہیں، بل کہ ذرا اعلیٰ سطح کی تدریس ہو۔ یہ مرحلہ بھی تین سے چار سال تک مشتمل ہو سکتا ہے۔ مناسب یہ ہو گا کہ اس مرحلے میں تخصص کے پہلے قدم کے طور پر طلبہ کو دو یا زائد گروپوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ کچھ طلبہ جو فقہ اور علوم فقہ میں تخصص کرنا چاہیں، ان کے نصاب کی تفصیلات میں فقہی کتابوں اور مضامین اور فقہی موضوعات میں مہارت اور تخصص پر زیادہ زور دیا جائے۔ جو طلبہ مثلاً علوم قرآن و تفسیر اور علوم حدیث میں تخصص کرنا چاہیں، ان کے تجویز کردہ نصاب میں فقہی کتب کی تعداد کو نسبتاً کم کر کے حدیث و تفسیر کی کتب شامل کی جائیں۔ لیکن درس نظامی کی موجودہ کتب چند ایک کے اضافے کے ساتھ دونوں گروپوں کے لیے رہنی چاہییں۔ اس سطح پر طلبہ کو اسلامی معاشیات، اسلامی بینکاری، اسلامی بیمہ کاری کے ساتھ ساتھ مغربی افکار اور نظریات کے بارے میں بھی ایک دو کتب لازمی طور پر پڑھائی جائیں۔ مناسب یہ ہو گا کہ اس مرحلے میں جو طلبہ داخل کیے جائیں، وہ انگریزی زبان سے کسی حد تک واقفیت رکھتے ہوں۔ مغربی افکار سے واقفیت کا بندوبست باقاعدہ نصابی کتب کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے اور ماہرین کے توسیعی خطبات کے ذریعے بھی۔

مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے کو بھی دو ذیلی مرحلوں میں تقسیم کیا جائے۔ پہلا ذیلی مرحلہ جو دو سال پر مشتمل ہو، وہ تمام طلبہ کے لیے مشترک ہو اور کوشش یہ کی جائے کہ ان دو سالوں کے دوران موقوف علیہ تک کی بنیادی اور اساسی کتب اور مضامین ختم ہو جائیں۔ دوسرا ذیلی مرحلہ حدیث اور تفسیر کے طلبہ کے لیے الگ اور فقہ اور اصول فقہ کے طلبہ کے لیے الگ ہو۔ کچھ مضامین میں دونوں طلبہ شریک ہوں۔ مثال کے طور پر جامع ترمذی کے درس میں دونوں گروپوں کے طلبہ شریک ہوں۔ اسی طرح آیات احکام یا فقہی تفسیر کے متعلق مضامین بھی دونوں گروپوں کے لیے لازمی ہوں۔ ان دونوں کے علاوہ چند اور مضامین بھی مشترک

ہو سکتے ہیں۔

امید کی جاتی چاہیے کہ ہدایہ کے چاروں حصے ابتدائی دو سالوں تک مکمل ہو جائیں گے۔ اب اگلے دو سالوں کے نصابات میں جو طلبہ آگے چل کر فقہ میں تخصص کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے کل مضامین کا آدھا حصہ فقہی مضامین پر مشتمل ہو اور باقی مضامین مشترک ہوں۔ اسی طرح جو طلبہ آگے چل کر حدیث اور تفسیر میں تخصص کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے کل مضامین کا کم از کم پچاس فی صد حدیث اور تفسیر پر مشتمل ہونا چاہیے۔ ان دو سالوں میں فقہ اور اصول فقہ میں آگے چل کر تخصص کرنے والے طلبہ کے لیے نصاب کا خاکہ اس طرح کا ہو سکتا ہے:

سال اول

۱۔ عقود رسم المفتی

۲۔ بدائع الصنائع کے منتخب ابواب، مثلاً کتاب الزکوۃ، کتاب النکاح، کتاب الطلاق۔

۳۔ البحر الرائق کے منتخب ابواب

۴۔ بدایۃ المجتہد (حصہ اول)

۵۔ مجلۃ الاحکام العدلیہ (باب اول)

۶۔ مشترک مضامین

۷۔ مشترک مضامین

۸۔ درس نظامی کی بقیہ کتب

۹۔ رد المحتار کے منتخب ابواب

۱۰۔ اصول السرخسی

۱۱۔ بدایہ المجتہد (حصہ اول)

۱۲۔ المغنی لابن قدامہ (منتخب ابواب)

۱۳۔ المہذب فی اصول الفقہ المقارن (جلد اول)

۱۴۔ مشترک مضامین

۱۵۔ مشترک مضامین

۱۶۔ درس نظامی کی بقیہ کتب

سال دوم

۱۔ نیل الاوطار (منتخب ابواب)

۲۔ شرح معانی الآثار

۳۔ احکام القرآن للجصاص

۴۔ المہذب فی اصول الفقہ المقارن (جلد دوم)

۵۔ المستصفیٰ للغزالی (از آغاز تا نہایت قطب ثانی)

۶۔ مشترک مضامین

۷۔ مشترک مضامین

۸۔ درس نظامی کی بقیہ کتب

ان دو مرحلوں کی کامیاب تکمیل کے بعد طلبہ کی بڑی تعداد فارغ التحصیل ہو جائے گی۔ وہ متداول درس نظامی کی تمام اہم کتابیں اور بنیادی مضامین پڑھ چکی ہو گی۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد مضامین سے ضروری واقفیت حاصل کر چکی ہو گی۔ اب صرف وہ ذی استعداد طلبہ رہ جائیں گے، جو اس مرحلے پر بھی بہت ممتاز اور نمایاں رہے ہوں۔ ان کو تخصص کی سطح کی تعلیم کے لیے منتخب کیا جائے۔ گویا اگر ادارے میں ابتدائی مرحلے میں ایک سو طلبہ داخل ہوئے ہوں تو ان میں سے پہلے مرحلے میں، یعنی ثانوی تعلیم کے چار سال کی تکمیل پر کم از کم پچاس طلبہ کو فارغ کر دیا جائے۔ بقیہ پچاس طلبہ میں سے کم از کم نصف، یعنی پچیس اگلے مرحلے، یعنی مزید چار سال کی تکمیل پر فارغ کر دیے جائیں اور تخصص کے مرحلے پر صرف ایک چوتھائی طلبہ کو قبول کیا جائے۔ یہ بات کہ ہر طالب علم کو آخر تک ہر چیز پڑھائی جائے، نہ مناسب ہے اور نہ قابل عمل۔ نہ ہر طالب علم کی یہ استعداد ہے اور نہ اس کی

ضرورت ہے کہ اس کو آخری سطح تک ادارے سے وابستہ رکھنے پر اصرار کیا جائے۔

یوں تو تخصص کی ضرورت مختلف میدانوں میں ہے، لیکن خاص طور پر درج ذیل شعبوں میں تخصص کی ضرورت آج انتہائی شدید ہے:

۱۔ تفسیر اور علوم قرآن

۲۔ حدیث اور علوم حدیث

۳۔ فقہ اور اصول فقہ

۴۔ افتا اور قضا

۵۔ عقیدہ اور کلام

۶۔ اسلامی معیشت و تجارت

۷۔ تقابل ادیان

۸۔ فکر جدید اور مطالعۂ مغرب

۹۔ عصر جدید میں اسلام اور اسلامی تہذیب

۱۰۔ عربی زبان وادب

تخصص کا پروگرام کسی صورت میں بھی تین سال سے کم نہیں ہونا چاہیے۔ ان تین سالوں میں ابتدائی دو سال باقاعدہ نصابات اور مقررہ کتب کی تدریس کے لیے وقف ہوں، اور تیسرا سال تحقیقی مقالے اور اپنے موضوع سے متعلق چند مضامین کی، جن کی تعداد دو یا تین سے زیادہ نہ ہو، تدریس پر مشتمل ہونا چاہیے۔

تخصص کی سطح پر متعلقہ میدان میں مغربی مفکرین نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے طلبہ کو گہری واقفیت ہونی چاہیے۔ امید کی جانی چاہیے کہ تخصص تک پہنچنے والے تمام طلبہ انگریزی کتب اور تحریروں سے بہ سہولت استفادہ کرنے کے اہل ہوں گے۔

تخصص کی سطح پر مضامین، موضوعات اور کتب کا تعین کرنے کے لیے تین معیارات کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

۱۔ متعلقہ میدان تخصص کے بارے میں اکابر اسلام کی نمایاں خدمات اور ان کے اساسی کام سے طلبہ بہ راہ راست واقف ہو جائیں۔

۲۔ متعلقہ میدانِ تخصص میں جو توسیعات اور ترقیاں ہوئی ہیں، ان سے طلبہ بہ راہ راست مانوس ہو جائیں۔

۳۔ متعلقہ میدانِ تخصص کی موجودہ صورت حال پورے طور پر طلبہ کی گرفت میں ہو، یعنی بیسویں صدی میں اس موضوع پر مسلمان اہل علم کا نمایاں کام کیا ہے؟ مغربی مستشرقین نے اس بارے میں کیا کہا ہے اور مستشرقین کے اثرات کے تحت دنیائے اسلام میں جو رجحانات پیدا ہوئے ہیں، ان سے کس طرح عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے؟

مثال کے طور پر فقہ اور اصول فقہ میں تخصص کے لیے ضروری ہو گا کہ ابتدائی دو سالوں میں جو نصاب پڑھایا جائے، وہ متقدمین کی کتابوں سے لے کر متاخرین تک ہر دور کی نمائندہ کاوشوں پر مشتمل ہو۔ اس سطح پر فقہ اسلامی کا تقابلی مطالعہ ناگزیر ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج دنیائے اسلام میں مختلف فقہی مسالک کا ایک دوسرے سے ارتباط اور احتکاک ہو رہا ہے۔ دنیا کے ہر بڑے شہر میں تقریباً ہر فقہی مسلک سے وابستہ مسلمان بڑی تعداد میں موجود ہیں، جن کا ایک دوسرے سے روزانہ کوئی نہ کوئی فقہی واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ان حالات میں فقہ کے متخصصین کو اپنے فقہی مسلک کے علاوہ دوسرے مسالک سے کسی قدر واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کام کے لیے ابن رشد کی بدایۃ المجتہد کے علاوہ دوسرے فقہی مسالک کی بعض منتخب کتب کے ابواب طلبہ کو پڑھانے چاہییں۔ اسی طرح اصولِ فقہ کا تقابلی مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ ایک معاصر سعودی عالم نے ”المہذب فی اصول الفقہ المقارن“ کے نام سے تقابلی اصول فقہ پر ایک جامع کتاب پانچ جلدوں میں تیار کی ہے۔ وہ اس مرحلے پر بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

فقہ میں تخصص کے طلبہ کے لیے انگریزی، اصول فقہ، ضابطہ فوج داری و دیوانی، تعزیراتِ پاکستان اور پاکستان کے آئین اور دو ایک منتخب قوانین کا مطالعہ

نا گزیر ہے۔ ان قوانین کے مطالعے کا مقصد طلبہ کو وکیل یا انگریزی قانون کا ماہر بنانا نہیں، بل کہ اس طرزِ فکر سے واقف کرانا ہے، جس کی بنیاد پر انگریزی قوانین مرتب ہوئے ہیں۔ اگر تخصص فی الفقہ کا مقصد اور ہدف ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے عمل میں حصہ لینا اور اس مقصد کو آگے بڑھانا ہے تو ملک کے قانون، عدالتی نظام اور دستوری نظام سے واقفیت ضروری ہے۔

تخصص کی سطح پر امید کی جانی چاہیے کہ طلبہ اعلیٰ استعداد کے حامل ہوں گے اور ان کو کوئی کتاب سبقاً سبقاً اول سے لے کر آخر تک پڑھانے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اس سطح پر استاد کا کام رہ نمائی کرنا اور طلبہ کا کام از خود مطالعہ ہونا چاہیے۔ تعلیم کے دو سالوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔ یہ چاروں حصے پانچ پانچ مہینوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ پانچ مہینوں کی اس مدت میں ایک طالب علم پانچ سے سات موضوعات تک بہ آسانی مطالعہ کر سکتا ہے۔ اس مرحلے پر پوری پوری کتابیں سبقاً سبقاً پڑھانے کے بہ جائے امہات الکتب کے منتخب ابواب پڑھائے جائیں۔ ایک مضمون کا استاد ہفتے میں تین یا چار مرتبہ طلبہ کو درس یا رہ نمائی کے لیے دست یاب ہو اور بقیہ اوقات میں طلبہ از خود مطالعہ کریں اور مطالعے کے نتائج کو تحریری طور پر مرتب کریں۔ یہ اسلوب انگریزی اور ملکی قانون کے مطالعے میں بہت آسانی سے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

یہاں مختلف موضوعات اور میدانوں میں تخصص کی مکمل اسکیم کی نشان دہی قبل از وقت ہو گی۔ اگر ان گزارشات سے فی الجملہ اتفاق ہو تو آغاز سے انتہا تک ایک مکمل نقشہ تجویز کرنا ہو گا۔ بنیاد اور ڈھانچے کی تعمیر سے قبل اونچی منزلوں کی تعمیر کا کام اور اس کی تجاویز غیر مناسب ہیں۔ ان صفحات میں تخصص کے لیے دس میدان تجویز کیے گئے ہیں۔ کسی ایک ادارے کے لیے ان سب میں بہ یک وقت تخصص کا پروگرام شروع کرنا نہ قابلِ عمل ہے اور نہ مناسب بھی بہتر یہی ہو گا کہ پہلے قدم کے طور پر بڑے بڑے دینی ادارے ایک ایک یا زیادہ سے زیادہ دو دو میدانوں میں تخصص کا پروگرام شروع کریں اور آہستہ آہستہ دوسرے شعبوں کی

طرف قدم بڑھائیں۔

وفاق المدارس کی طرف سے ایک مستقل نظامت اعلیٰ برائے تخصصاتِ شرعیہ قائم کی جانی چاہیے، جو تخصص کا نصاب اور نظام وضع کرے۔ وفاق کی اجازت اور منظوری کے بغیر کسی ادارے کو تخصص کا شعبہ قائم کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔ جہاں ایسے شعبے قائم ہوں، ان کی نگرانی مذکورہ نظامت اعلیٰ کرے اور معیار کی پابندی کو یقینی بنائے۔

ان صفحات میں اگرچہ گفت گو تخصص کے بارے میں کی گئی ہے، لیکن دو اہم باتوں کی نشان دہی کی اجازت چاہتا ہوں۔ ان دونوں باتوں کا تخصص کے پروگراموں کی کام یابی سے بھی اگر بہ راہ راست نہیں تو بالواسطہ تعلق ضرور ہے۔ میری مراد عربی اور فارسی زبان کی تدریس سے ہے۔

عربی زبان کی تدریس

مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ بیش تر دینی مدارس میں عربی زبان کی تدریس کا موجودہ نظام، نصاب اور انداز انتہائی ناقص، غیر تسلی بخش اور ناقابل قبول ہے۔ عربی، فارسی سے نابلد طلبہ فارسی کے ذریعے عربی صرف و نحو کے ضروری قواعد حفظ کرتے ہیں، پھر عربی کی از کار رفتہ اور فضول کتابوں کے ذریعے عربی صرف و نحو میں ''مہارت'' حاصل کرتے ہیں اور اس نامکمل اور انتہائی ناقص علم کے چند صفحات کو رٹ کر عربی زبان و ادب کے ماہرین بن جاتے ہیں۔ میں اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر عرض کرتا ہوں کہ مدارس میں عربی ادب کی ان کتابوں کی سال ہا سال تدریس کرنے والے اساتذہ میں سے بیش تر ان کتابوں کے درسی اجزا کے علاوہ عربی زبان و ادب کے پورے ذخیرے سے ناواقف رہتے ہیں۔

عربی زبان، جو دنیا کی سب سے زیادہ دقیق اور سائنٹفک زبان ہے، عربی ذخیرۂ الفاظ جو دنیا کی زبانوں کا سب سے وسیع ذخیرۂ الفاظ ہے، عربی صرف و نحو جس کا مقابلہ شاید ہی کسی زبان کی صرف و نحو کر سکے، دینی مدارس کے علما کی بڑی تعداد کے

لیے ایک بند دروازہ ہی رہتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان کی تدریس میں ندوۃ العلما کا تجربہ بہت کام یاب اور شان دار رہا ہے۔ اس تجربے نے گزشتہ نصف صدی سے زائد کے عرصے میں اپنی افادیت اور خوبی کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے، لہٰذا عربی زبان کی تدریس کے پورے نصاب و نظام پر ندوہ کے تجربے کی روشنی میں نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ ندوہ کی مرتب کردہ ابتدائی کتابیں وسطانی مدارس میں پڑھائی جانی چاہییں۔ مزید بر آں عربی نثر کی عمدہ کتابوں کے منتخب حصے نصاب میں شامل ہونے چاہییں۔ عربی شعر میں بھی متعدد مجموعے ایسے دست یاب ہیں، جو حماسہ اور سبعہ معلقہ سے پہلے پڑھا دیے جائیں تو زبان کا اچھا ذوق پیدا ہو سکتا ہے۔

عربی نثر میں سیرت ابن ہشام، البدایہ والنہایہ اور مقدمہ ابن خلدون کے منتخبات پر مشتمل ایک ترتیب دے دی جائے اور نفحۃ العرب کے بعد پڑھائی جائے تو عربی نثر کی اچھی بنیاد بن سکتی ہے۔ میری ذاتی رائے میں مقامات حریری کی تدریس محض وقت کا ضیاع ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین مقامے نمونے کے طور پر پڑھا دینا کافی ہے۔

فارسی زبان کا اہتمام

برصغیر میں ایک طویل عرصے تک دینی علوم و فنون کی تدریس فارسی زبان میں ہوتی رہی ہے۔ فارسی ہی جنوبی ایشیا اور افغانستان کی علمی اور ثقافتی زبان رہی ہے۔ ہند و پاکستان کے دینی مدارس میں ابتدائی تعلیم بھی فارسی ہی میں ہوتی تھی۔ اگرچہ فارسی کو ذریعۂ تعلیم بنانا اور دینی و عربی علوم کے لیے فارسی زبان کو استعمال کرنا اردو کے رواج پا جانے کے بعد غیر موزوں اور غیر مفید تھا، لیکن فی نفسہ فارسی زبان و ادب کی ضروری تعلیم میں بہت افادیت تھی۔ طلبہ برصغیر کے دینی ورثے سے واقف ہو جاتے تھے۔ برصغیر کے دینی اکابر کی تحریروں تک ان کی رسائی ہو جاتی تھی۔ لیکن گزشتہ تیس چالیس سال سے فارسی کو مکمل طور پر ختم کر دینے کے رجحان سے بہت نقصان ہوا ہے۔ آج بہت سے علما کے لیے مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

جیسے اکابر کی کتابیں ناقابل فہم ہو گئی ہیں۔ فارسی زبان کے ذریعے اخلاق، تہذیب اور روحانیت کا جو عنصر نصاب تعلیم کی بنیادوں میں شامل ہو جاتا تھا، اس سے طلبہ قریب قریب محروم ہو گئے ہیں۔

ان حالات میں فارسی زبان کی (بہ طور ایک مضمون کے) تدریس کا احیا کرنا ضروری ہے۔ اگر ابتدائی دینی مدارس میں حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی، حساب اور معاشرتی علوم کے مضامین شامل کر دیے جائیں تو پانچ سال کی مدت میں طالب علم قرآن مجید کا حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ نہ صرف اردو اور فارسی کی ضروری استعداد کا حامل ہو سکتا ہے، بل کہ ضروری حساب اور ابتدائی ریاضی سے بھی واقف ہو سکتا ہے۔

وسطانی مدارس میں فارسی کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت دی جانی چاہیے۔ اگر طالب علم ابتدائی مدارس میں آمد نامہ، گلزار دبستان، کریما، پند نامہ، گلستان اور بوستان پڑھ چکا ہو (جو ایک گھنٹہ روزانہ کے حساب سے چار سال میں بہت آسان ہے) تو وسطانی مدارس میں مثنوی مولانا روم کے منتخبات، بہارستان جامی، کشف المحجوب، امام غزالی کی کیمیائے سعادت کے منتخب ابواب پڑھانا مشکل نہ ہو گا۔ پھر ثانویہ عامہ اور عالیہ میں حضرت مجدد الف ثانی کے بعض منتخب مکتوبات اور مولانا اسماعیل شہید کی منصب امامت کو شامل کرنا آسان ہو گا۔ حضرت مجدد کے بعض طویل مکتوبات عقائد اور تصوف کے بنیادی اور مہتم بالشان مسائل کے بارے میں انتہائی عالمانہ اور وقیع مباحث پر مشتمل ہیں اور اچھی خاصی کتاب کی ضخامت کے برابر ہیں۔ ایسے چند مکتوبات کو نصابی کتاب کے طور پر پڑھایا جا سکتا ہے۔

ضمیمہ

موجودہ حالات میں علمائے کرام کی ذمہ داریاں

دعوۃ اکیڈمی کے زیر اہتمام
تربیت ائمہ کورس کی افتتاحی تقریب کے موقع پر کی جانے والی تقریر،
جسے شہزاد چنا نے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا۔

مسلکی اختلاف اور اس کی حدود

ماہنامہ دعوۃ، اسلام آباد: ستمبر ۲۰۰۲ء

موجودہ حالات میں

علمائے کرام کی ذمے داریاں

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ غالباً وہ پہلے انسان ہیں، جو امیر المومنین فی الحدیث کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کا مشہور شعر ہے:

وهل افسد الدين الا الملوك
واحبار سوء ورهبانها

دینی معاملات کو کس نے خراب کیا اور فاسد کیا ہے سوائے حکمرانوں اور علمائے سو کے۔

گویا وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلم معاشرے میں بالخصوص اور انسانی معاشرے میں بالعموم جب کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو دو طبقوں کی وجہ سے ہوتی ہے، ایک اس طبقے کی وجہ سے جو کسی ملک میں کسی نہ کسی حیثیت سے حکمرانی یا ذمے داری کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔ دوسرا علمائے کرام کا طبقہ جس سے مراد یہاں صرف علمائے دین نہیں، بل کہ اس سے مراد معاشرے کے وہ تمام لوگ ہیں جو کسی بھی اعتبار سے اپنے معاشرے کی علمی و فکری رہ نمائی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوں۔ گویا امت یا قوم کے سیاسی، فکری اور دینی قائدین اگر اچھے ہوں اور درست راستے پر گام زن ہوں تو پھر امت درست راستے پر گام زن رہتی ہے اور اگر یہ طبقے راہِ راست سے ہٹ جائیں تو بالآخر امت بھی

راستے سے ہٹ جاتی ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خیار ائمتکم الذین تحبونھم ویحبونکم وتصلون علیھم ویصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تلعنونھم ویلعنونکم ویبغضونکم وتبغضونھم

تمھارے بہترین ائمہ وہ لوگ ہیں، جن سے تم محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتے ہوں۔ تم ان کے لیے دعائے خیر کرتے ہو اور وہ تمھارے لیے دعائے خیر کرتے ہوں۔ اور بدترین ائمہ وہ ہیں کہ تم ان پر لعنتیں بھیجو، وہ تم پر لعنتیں بھیجیں۔ وہ تم سے نفرت کریں، تم ان سے نفرت کرو۔

یہاں ائمہ کا لفظ کسی خاص شعبے کے قائدین کے لیے استعمال نہیں ہوا، بل کہ ہر اس فرد کے لیے استعمال ہوا ہے جو امت میں قیادت اور امامت کا مقام رکھتا ہے۔ وہ تعلیم میں امامت ہو، مسجد کی امامت ہو، فکر کی امامت ہو، سیاست کی امامت ہو، کسی بھی طرح کی امامت ہو، اگر تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ وہ بہترین لوگ ہیں جو امت سے اخلاص رکھتے ہیں، امت ان کے اخلاص کی قدر کرتی ہے، اس کی وجہ سے ان کے لیے دعا گو ہے، ان سے محبت کرتی ہے اور وہ امت سے محبت کرتے ہیں تو پھر وہ بہترین قیادت ہے۔

ان دونوں اقوال، جن میں سے ایک حدیث پاک ہے اور دوسرا ایک عظیم محدث اور امام کا قول ہے، کی روشنی میں دیکھا جائے تو ائمہ کرام خصوصاً دینی ائمہ کرام کی ذمے داری نہایت ہی نازک اور بھاری ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر دور جدید میں یہ ذمے داری بہت نازک ہو گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو مغرب کی طرف سے بڑھتا ہو اسیکولرازم ہے جو ایک طوفان کی طرح دنیائے اسلام کو اپنے گھیرے میں لے رہا ہے۔ مغرب نے اپنے تاریک ادوار کے ایک ہزار سال کے ناگفتہ بہ تجربات کے بعد سیکولرازم کو اپنے لیے پناہ گاہ سمجھا اور یہ محسوس کیا کہ ان کے مصائب اور مشکلات کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مذہب اور سیاست یک جا تھے۔ ان کا مذہب اور ان کی سیاست چوں کہ اپنی داخلی کم زوریوں کی وجہ سے یک جا نہیں چل سکتے تھے، اس لیے انھوں نے ان دونوں کو الگ الگ کر دیا۔ اس علیحدگی کے بعد وہ بڑی حد تک ان مصائب سے آزاد ہو گئے، جن کا

وہ ایک ہزار سال شکار رہے، لیکن کچھ نئے مصائب کا شکار ہو گئے۔ مشکل یہ ہوئی کہ اگر یہ چیز مغرب تک محدود رہتی تو ہمارے لیے شاید زیادہ قابل اعتراض نہ ہوتی۔

یہاں ایک علمی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی تاریخ میں ایسا کیوں ہوا؟ چوں کہ ان کے مذہب اور سیاست میں تفریق اور دوری پیدا ہوئی تو جب تک ہم مغرب کے ان فکری اور مذہبی رجحانات اور مسائل سے واقف نہیں ہوں گے، جن کی وجہ سے وہاں دین و دولت میں جدائی عمل میں آئی، ہم سیکولرازم کے مسئلے سے کماحقہ نہیں نبٹ سکیں گے۔ ہمارے ہاں اصل خرابی اس لیے پیدا ہو رہی ہے کہ وہ نتائج جو مغرب میں مسیحیت کی خاص تاریخ اور یورپ کے خاص ماحول کی پیداوار تھے، وہ دنیائے اسلام میں بغیر سوچے سمجھے بڑے پیمانے پر درآمد کیے جا رہے ہیں، بل کہ مغرب کے موجودہ سیاسی اثر ورسوخ، اس کی عسکری طاقت، اس کی اقتصادی خوش حالی اور دنیوی معاملات میں ان کی بالادستی کی وجہ سے وہ نتائج بد اور اثرات شر دنیائے اسلام میں برآمد، بل کہ مسلط کیے جا رہے ہیں۔ نہ دنیائے اسلام کی تاریخ اس نوعیت کی تاریخ رہی ہے، جس سے دنیائے مغرب کو گزرنا پڑا، نہ دنیائے اسلام میں ریاست اور مذہب میں کبھی کش مکش پیدا ہوئی ہے، جو یورپ میں ایک ہزار سال موجود رہی، نہ وہ قباحتیں دنیائے اسلام میں پیدا ہوئیں، جن سے مغرب کو واسطہ پڑا، نہ یہاں مذہب نے ترقی و تہذیب کے راستے میں رکاوٹ پیدا کی، جو مغرب میں پیدا ہوئی، نہ یہاں مذہبی محاسبے کا وہ احتسابی عدالتی نظام تھا، جس سے سیکڑوں ہزاروں نہیں، بل کہ لاکھوں انسانوں کو مذہب کے نام پر موت کے گھاٹ اتارا گیا، نہ یہاں عقل وشعور کی ہر کاوش کا یہ کہہ کر انکار کیا گیا کہ فلاں مذہبی پیشوا اور فلاں مذہبی ادارہ اس سے اتفاق نہیں کرتا، نہ لوگوں کو اس لیے سزائے موت دے دی گئی کہ انھوں نے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر کوئی سائنسی نتیجہ بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ سارے معاملات دنیائے اسلام میں نہیں تھے۔

دنیائے اسلام میں تو پہلے دن سے عقل اور وحی کے درمیان اتنی ہم آہنگی، یک سانیت اور قرب تھا کہ دنیائے اسلام کی تاریخ میں کوئی لمحہ ایسا نہیں آیا کہ عقل اور وحی یا دین اور دنیا یا مذہب اور غیر مذہب دو متعارض اور متحارب کیمپوں میں تقسیم ہوئے ہوں

اور ان کی آپس میں کش مکش رہی ہو۔ ہمارے ہاں تو وہ لوگ بھی جو مذہبی فکر کے ترجمان نہیں سمجھے جاتے، ان کے ہاں بھی دین اور دنیا، عقل و وحی میں جو امتزاج پایا جاتا ہے، وہ اہل مغرب کے بڑے بڑے مذہبی علما سے کہیں بڑھ کر ہے۔ خالص فلسفی، ابن سینا اور فارابی جیسے لوگوں کی مثال دیکھیے، جن کو عموماً اسلامی فکر کا معتمد اور معتبر نمائندہ قرار نہیں دیا جاتا، بل کہ ان کو یونانی افکار کا ہی ترجمان سمجھا جاتا رہا، اگر یہ کہا جائے کہ مغرب کی تاریخ میں مذہب کے جو بہترین علم بردار تھے، یہ لوگ ان سے کہیں زیادہ مذہبی تھے تو غلط نہ ہو گا۔ یورپ کی تاریخ میں مذہب کے جو بہترین نمائندے رہے ہیں، مثلاً سینٹ ٹامس ایکوی ناس، جن کو مسیحیت میں حضرت عیسیٰ اور سینٹ پال کے بعد تیسرا بڑا مجدد مانا جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ یہ لوگ مذہبی اور دینی خیالات سے قریب تر تھے۔ انھوں نے جس طرح عقل اور دین کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور جس طرح سے دینی عقائد اور دینی تصورات کو عقلیات کی زبان میں کام یابی سے بیان کیا، ان کی مثالیں یورپ کی مذہبی تاریخ میں خال خال ہی ملیں گی۔

ہمارا بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے دانش وروں نے نہ اپنی تاریخ کا مطالعہ کیا، نہ مغربی تاریخ کا، نہ یہ دیکھا کہ ہمارے ہاں کیا خرابیاں تھیں اور کیا نہ تھیں اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ دوسروں کے ہاں جو خرابیاں اور کم زوریاں پیدا ہوئیں، وہ کیوں پیدا ہوئیں۔ اس ناواقفیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسروں کی کم زوریوں کو زبردستی مسلمانوں کی کم زوریاں قرار دیا جانے لگا۔ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے ہاں خرابیاں نہ تھیں، لیکن جو خرابیاں تھیں، ان کو کسی نے دیکھا نہیں اور جو خرابیاں نہیں تھیں، ان کو زبردستی اپنے اندر موجود مان لیا گیا۔ ان خرابیوں کو ماننے کے بعد وہ نتائج بھی خود تسلیم کر لیے گئے، جو یورپ میں ان خرابیوں کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ اس سے دنیائے اسلام میں سیکولرازم کا فروغ شروع ہو گیا۔ سیکولرازم کے فروغ کے نتیجے میں فکری کش مکش کی ایک ایسی صورت حال انڈونیشیا سے مراکش تک پیدا ہو گئی ہے، جو بین الاقوامی قوتوں کے مفاد کی وجہ سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آج مغرب کی بالادست قوتوں کی کوشش یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے مذہب کے دائرے کو زیادہ سے زیادہ محدود کر

دیا جائے اور ریاستی اور سرکاری، اجتماعی، قانونی، اقتصادی اور تہذیبی معاملات سے دین ومذہب کو نکال کر مذہب اور اخلاق کا دائرہ مسجد اور عبادت گاہ تک محدود کر دیا جائے۔

یہ وہ چیلنج ہے جو دنیائے اسلام کو آج درپیش ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک خالص فکری اور علمی مسئلہ ہے، جس کا روزمرہ کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن آج دنیائے اسلام کو جو مسائل درپیش ہیں، ان کا گہرائی سے جائزہ لیں اور فکری سطح پر دیکھیں کہ ان کے اسباب کیا ہیں تو یہی سیکولر رجحان اور لادینی طرز فکر ہی بنیادی سبب نظر آئے گا۔ آج دنیائے اسلام کے اہل علم و دانش کے خاصے قابل ذکر حصے میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ جس طرح سے مغرب ایک خاص انداز میں مذہب اور ریاست کو الگ الگ کرنے پر مجبور ہوا، دنیائے اسلام کو بھی آج اس نتیجے پر پہنچنا ہے۔

کبھی کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں شرعی قوانین بنیادی حقوق سے متعارض ہیں، کبھی کہا جاتا ہے کہ فلاں قسم کے نظام سے معاشرے میں تفریق پیدا ہو رہی ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ فلاں قسم کا نظام اگر آیا تو ریاست کے فلاں مفاد کو زد پہنچے گی۔ ریاست کے مفاد کو زک پہنچنے، امتیازی قوانین اور بنیادی حقوق کی یہ باتیں بہ ظاہر خوب صورت عنوانات ہیں، لیکن ان عنوانات کے پردے میں جو گفت گو کی جا رہی ہے، اس پر غور کریں تو بالآخر جو بنیاد نکلے گی اور لنگر جہاں پڑا ہوا ہے، وہ یہی ہے کہ ریاست یا مذہب کو اور مذہب یا زندگی کے بقیہ معاملات کو ایک دوسرے سے الگ الگ ہونا چاہیے۔ میرا مذہب کیا ہے، اس سے آپ کو سروکار نہیں اور آپ کا مذہب کیا ہے، مجھے اس سے سروکار نہیں۔

یہ طرز اسلام کے بنیادی تصور سے متعارض ہے۔ ہماری ساری شناخت ہی مذہب ہے۔ مسلمان کے ہاں ہر اچھائی اور برائی کا تعین مذہبی حوالے سے ہوتا ہے۔ اخلاق اور قانون کا تعلق مذہب سے ہے، تہذیب کا تعلق مذہب سے ہے، قانون اور تمدن کی اساس مذہبی عقائد پر ہے، نظام حکومت اور معاشرت کے بارے میں ہدایات مذہبی ذرائع سے ملتی ہیں، معیشت اور تجارت کے اصول و قواعد کے بارے میں رہ نمائی مذہب کی بارگاہ سے فراہم ہوتی ہے، غرض کوئی چیز مذہب کے اس جامع اور بھرپور دائرے سے باہر نہیں، جو قرآن مجید اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور اعمال کی صورت میں موجود

ہے۔ یہاں تو قانون کا بھی بنیادی حوالہ بالآخر مذہبی کتاب ہے اور دستور کا آخری اور حتمی حوالہ بھی مذہبی کتاب ہے، جب کہ وہاں یہ چیز ناقابل تصور ہے کہ ایک مذہبی کتاب کا دور جدید کے قانونی، دستوری، سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی معاملات سے کوئی تعلق ہو۔

ہمارے دینی قائدین جزئیات پر تو بہت زور دیتے ہیں، لیکن اس مسئلے کی اصل جڑ پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ علمائے کرام، دینی قائدین اور دینی فکر کے لوگوں کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ سب سے پہلے یہ اسلوب ذہن نشین کروائیں کہ حق ایک ہے اور اس میں کوئی تفریق دین ودنیا کی بنیاد پر نہیں ہو سکتی۔ جب یہ تفریق ہو گی تو ہوس کی بنیاد پر ہو گی:

ہوئی دین ودولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری

جب معاملاتِ دنیا، دین کی راہ نمائی سے آزاد ہوں گے تو پھر انسانی خواہشات اور انسانی شہوات ہی کی بالادستی ہو گی۔ جب بالادست طاقت کے احکامات چلیں گے، جیسا کہ آج دنیا میں چل رہے ہیں تو پھر جو کم زور اور مجبور ہے، وہ بہ تدریج مزید کم زور اور مزید مجبور ہوتا جائے گا۔ روزانہ کم زور سے ایک نیا مطالبہ کیا جائے گا اور بالادست روزانہ ایک ایک قدم آگے بڑھتا جائے گا، تاآں کہ وہ تسلیم کروالے کہ دین ومذہب الگ الگ چیزیں ہیں اور مذہب کا اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب تک یہ اصول مسلمان تسلیم نہیں کریں گے، اس وقت تک ان کے مطالبات جاری رہیں گے۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ، جس نے اکثر وبیش تر مغربی ماحول میں تعلیم پائی ہے اور مغربی یونی ورسٹیوں کا پڑھا ہوا ہے، اس میں بڑے ماہر، بڑے اچھے، بڑے مخلص اور محب وطن لوگ ہیں، لیکن مخلص اور محب وطن ہونا کافی نہیں ہوتا، جب تک ذہن کی بنیاد درست نہ ہو۔ جب تعمیر میں بنیاد ہی کج ہو جائے تو ساری عمارت کج ہی رہتی ہے:

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

اس بنیاد کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات کہ قرآن مجید ہر سچائی

اور ہر صداقت کا سرچشمہ ہے، اگر تسلیم ہے تو اس کے بعد سب حوالے ختم ہو جانے چاہییں۔ کسی بڑے سے بڑے انسان کی عقل، تجربہ حتیٰ کہ کسی بڑی سے بڑی تہذیب کی کوئی تہذیبی سچائی یا کلیہ اگر قرآن مجید سے متعارض ہے تو وہ ناقابل قبول ہے۔ جب تک یہ معیار لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو گا، اس وقت تک یہ جزوی مسائل اٹھتے رہیں گے اور لامتناہی سوالات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ علمائے کرام کی پہلی ذمے داری یہ ہے کہ وہ اس بنیادی سوال کے جواب کو جو ایک رویے کا سوال ہے، پہلے واضح کر دیں اور لوگوں کا ذہن اس معاملے میں صاف کریں۔

دوسری بڑی ذمے داری جو دور جدید میں علمائے کرام پر خاص طور پر آ گئی ہے، وہ یہ ہے کہ پچھلے چودہ سو سال سے مسلم معاشرے میں ان کا ایک خاص کردار ہے اور وہ کردار اس معاشرے میں متعین ہوا، جہاں اسلامی قوانین، اسلامی احکام، اسلامی اخلاق، اسلامی کردار قائم اور جاری و ساری تھا۔ اگر ایک چیز اسلامی خطوط پر قائم ہے، معاشرہ اسلامی اساس پر کارفرما ہے، اسلامی قوانین عدالتوں میں نافذ ہیں، لوگوں کی زندگیاں اسلامی ہیں، لوگوں کے علوم و فنون اسلامی ہیں، درس گاہ کا ماحول اسلام کے مطابق ہے، بازار میں کام اسلام کے مطابق ہو رہا ہے، وہاں علمائے کرام کی ذمے داری یہ ہوتی ہے کہ جزئیات کا جواب دیں۔ جزوی مسائل اگر کوئی پوچھے تو آپ بتا دیں کہ یہ چیز خریدنا حلال ہے اور وہ چیز خریدنا حرام ہے، یہ کاروبار جائز ہے اور وہ کاروبار ناجائز ہے، فلاں قسم کا لباس مکروہ ہے یا غیر مکروہ ہے۔ جزئیات کے یہ سوال اٹھتے رہتے ہیں اور علمائے کرام جزئیات کا جواب دیتے رہتے ہیں۔ آپ فتاویٰ کی ساری کتابیں دیکھیں، سب جزئیات پر مبنی ہیں۔

آج ہم جس دور میں جی رہے ہیں، اس میں اسلامی معاشرہ بڑی حد تک موجود نہیں ہے۔ اس نظام میں قوانین اسلام کے مطابق نہیں ہیں، اس میں معاشرتی اقدار اسلام سے بڑی حد تک ہٹ گئی ہیں، معیشت کا نظام اسلام کے مطابق نہیں ہے، حلال و حرام کی تمیز بھی کمزور پڑ گئی ہے، یہاں محض جزئیات کا جواب دینا کافی نہیں ہے۔

جزئیات کا جواب تو وہاں دیا جائے گا، جہاں کلیات اسلام کے مطابق ہوں، جزوی

خلاف ورزی ہو رہی ہو تو اب اس کی رہ نمائی کر دیں۔ جہاں سارے کلیات ہی بدل گئے ہوں، وہاں جزئیات کا جواب دینا کافی نہیں ہے۔ اگر ایک عمارت آپ کے استعمال میں ہے اور فرض کریں کہ آپ ڈیکوریشن کے ماہر ہیں، آپ سے پوچھا جائے کہ لکڑی اس ڈیزائن کی بنواؤں یا اس ڈیزائن کی، اسٹیج اس طرف ہو یا اس طرف تو آپ ان جزوی سوالات کا جواب اپنی عمارت کی بنیاد پر دے سکتے ہیں۔ لیکن خدانہ خواستہ عمارت ہی گری ہوئی ہو اور پھر کوئی یہ سوال پوچھے کہ کرسی کس ڈیزائن کی ہو اور اسٹیج کس طرف ہو تو یہ غیر متعلق سوال ہو گا اور یہ بحث بڑی حد تک قبل از وقت ہو گی۔ یہ جزوی سوال بعد میں آئے گا، پہلے آپ کلیات کو درست کریں۔

علمائے کرام اس تبدیلی کا احساس فرمائیں۔ یہ اسلوب اب بہت سے معاملات ومسائل میں کافی نہیں کہ آپ کے سامنے اپنے محترم شیخ کے جاری کیے ہوئے فتاویٰ یا معتمد علیہ اور مستند فتاویٰ کا مجموعہ رکھا ہو اور کوئی سوال آیا، آپ نے جواب دیا اور سمجھا کہ رہ نمائی کا کام پورا ہو گیا۔ یہ اسلوب آج کل کی صورت حال کے لحاظ سے کافی نہیں ہے۔ جزئیات کا جواب بھی یقیناً دیا جائے گا اور جو افراد، خاندان اور ادارے اسلام پر کاربند ہیں، ان کو جزئیات کے بارے میں سوال پوچھنے کی ضرورت ہو گی، لیکن اس کے ساتھ کلیات کے معاملات بھی ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔

آج بہت سے لوگ سوال پوچھتے ہیں کہ اسلامی معاشرے کے بنیادی اوصاف کیا ہیں؟ خاندان اسلام میں کیسے قائم ہوتا ہے؟ خاندان کے مابین تعلقات کیا ہیں؟ اسلام میں خاندان کس بنیاد پر قائم ہوتا ہے؟ یورپ میں جو خاندان کا ادارہ ٹوٹا ہے تو کیوں ٹوٹا ہے؟ دنیائے اسلام میں جو ٹوٹ رہا ہے تو کیوں ٹوٹ رہا ہے؟ وہ کیا چیز بگڑ گئی ہے، جس کی وجہ سے خاندان ٹوٹ رہا ہے؟ ان کلیات کا سوال جب کیا جاتا ہے تو اس کے جواب دینے میں اہل علم سے بالعموم دو غلطیاں ہوتی ہیں، جن کو سمجھنے کی ضرورت ہے: ایک یہ کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اسلام کی کلیات کا گہرا اور مربوط ومتکامل علم حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ ہماری تعلیم ایسی ہے جو اکثر وبیش تر جزئیات پر مشتمل ہے۔

پھر کلیات کے لحاظ سے تین چیزوں میں بہت سے لوگ فرق نہیں کرتے۔ کچھ چیزیں وہ ہیں جو قرآن کی نصوص ہیں، جن کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح کچھ چیزیں وہ ہیں، جو احادیث صحیحہ اور سنت ثابتہ یا متواترہ سے ثابت ہیں، وہ بھی نصوص کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ وہ ہیں جو اصول فقہ کی اصطلاح میں قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں اور دین کی اساسات ہیں۔ یہ ہیں کلیات، جن کی بنیاد پر معاشرے کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کلیات کی کسی تعبیر پر امت کا اتفاق ہے تو یہ تعبیر بھی ان ہی کا حصہ ہے۔

لیکن اس کے بعد کسی ایک یا دو تین فقہا کی جو اجتہادی آرا ہیں، وہ کلیاتِ دین نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں اگر اس دور کے اہل علم یہ فیصلہ کریں کہ ہمارے لیے یہ رائے یا فلاں تعبیر یا فلاں اجتہاد زیادہ موزوں ہے، اس لیے آج کے دور میں ہم اس کو اختیار کرتے ہیں تو اس کو بھی آپ کلیات میں شامل کر لیں، لیکن ان متفقہ امور کے بعد جو جزوی اور انفرادی آرا ہیں، مثلاً امام شافعیؒ کی ایک رائے ہے، امام غزالیؒ کی ایک رائے ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ایک رائے ہے، ضروری نہیں کہ وہ رائے آج ہمارے لیے اسی طرح اہمیت رکھتی ہو، جیسے قرآن پاک کا حکم اہمیت رکھتا ہے۔ دونوں کو ایک سطح پر رکھیں گے تو قباحتیں پیدا ہوں گی۔ قرآن پاک کو جو دوام حاصل ہے، وہ مثلاً امام غزالیؒ کی رائے کو حاصل نہیں ہے۔ سارے احترام کے باوجود وہ دوام امام ابو حنیفہؒ یا کسی اور کی رائے کو بھی حاصل نہیں ہے۔ وہ دوام تو اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

احکام شریعت کی اس درجہ بندی اور اس فرق مراتب کا خیال نہ رکھا جائے تو بڑی قباحت پیدا ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب آپ یورپ یا امریکا تشریف لے جائیں، وہاں ایک عالم ہندوستان سے آئے ہوئے ہیں، ایک سعودی عرب سے، ایک مصر سے۔ امریکا کا ایک سادہ آدمی جس نے کل اسلام قبول کیا ہے، ایک اس کو ایران کی بتا رہا ہے، ایک توران کی، ایک کہیں اور کی بتا رہا ہے اور کوئی یہ نہیں سوچ رہا کہ یہ بے چارہ نہ شافعی ہے، نہ حنبلی، نہ حنفی ہے، نہ مالکی۔ یہ کچھ نہیں۔ یہ تو مسلمان ہے، یہ

تو ذہنی اعتبار سے گویا سن پچیس ہجری میں مسلمان ہوا ہے۔ اس کو آپ ان چیزوں میں کیوں الجھاتے ہیں، پھنساتے ہیں؟ اس پر کیوں آپ فقہِ حنفی مسلط کر رہے ہیں؟ کیوں فقہ شافعی یا فقہِ اہل حدیث یا کوئی اور تعبیر زبردستی اس پر مسلط کر رہے ہیں؟ پھر اس سے بڑھ کر یہ ہوتا ہے کہ تم ہاتھ یہاں یا وہاں باندھو، اذان ہو تو انگوٹھا چومو یا مت چومو۔

اس نو مسلم کو ابھی آپ کچھ نہ کہیے۔ اس کو نماز پڑھنا سکھایئے، جو اساس دین ہے۔ جب وہ نماز پڑھنا سیکھ لے گا تو جس معاشرے میں اس کی تربیت ہوگی اور جس مسلم ماحول کا وہ حصہ بنے گا، بہ تدریج وہ خود ہی اس معاشرے کی صورت اختیار کر لے گا۔ پھر جب وہ آپ سے مسائل پوچھے تو آپ اسے مسائل بتائیں۔ فقہی اختلاف میں اس کو نہ لے جائیں، زیادہ سے زیادہ اپنا مسلک بتا دیں۔ ایک حد تک یہ بھی گوارا ہے کہ یہ بھی فقہا کے اقوال ہیں، یہ بھی دین کے شارحین کے ارشادات ہیں، اس حد تک بھی چلیے مان لیں۔

لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر کچھ چیزیں ہیں، جو مختلف مسلم ممالک کے مقامی رواج ہیں۔ کسی رواج کا اسلام کے مطابق ہونا اور چیز ہے اور اسلام ہونا اور چیز۔ ایک رواج جو اسلام سے متعارض نہیں ہے، وہ قابل قبول ہے، لیکن اپنے اس مقامی رواج کو آپ دوسرے ممالک کے مسلمانوں پر زبردستی مسلط کریں، یہ اسلام کا تقاضا نہیں۔

آپ کسی شیخ کے مرید ہیں، ان کا اللہ کی بارگاہ میں بہت اونچا مقام ہے۔ ان کا کچھ ذاتی ذوق تھا، آپ کا جی چاہے تو اس ذوق کی پیروی کریں، نہیں جی چاہتا تو مت کریں، لیکن پیغمبر کے علاوہ کسی کے ذوق کو زبردستی دوسروں سے منوانا، یہ شریعت کا نہ تقاضا ہے اور نہ حکم ہے۔ مثلاً آپ کے بزرگ ایک خاص انداز میں عمامہ باندھتے ہیں۔ آپ کو ان سے محبت ہے تو آپ اس طرح عمامہ باندھیے، لیکن جب آپ لوگوں سے یہ کہیں کہ اس طرح کا عمامہ باندھنا دین کا حکم ہے تو یہ چیز قابل اعتراض ہو جاتی ہے اور اس سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ دین کا تقاضا نہیں ہے۔ دین یہ نہیں کہتا کہ فلاں بزرگ کی طرح عمامہ باندھو یا، فلاں بزرگ کی طرح کا لباس پہنو۔ ہاں اگر کوئی مرد سونے کی انگوٹھی استعمال کرتا ہے تو اس کی نصوص میں ممانعت ہے، اس لیے اس

کورد کیں۔ کوئی عورتوں جیسالباس پہنتاہے تواس کو بھی رد کیں، کیوں کہ اس کی شریعت میں ممانعت ہے۔

یہ تین چیزیں جن میں عام طور پر لوگ تفریق نہیں کرتے، الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں اوران کواپنی اپنی سطح پر ہی رہنا چاہیے۔ سب سے پہلے قرآن وسنت کی نصوص ہیں جو دائمی ہیں، جو امریکا میں بھی رہیں گی، برطانیہ میں بھی، مصر، بنگلہ دیش اور ہر جگہ رہیں گی۔ نصوص کے بعد ائمہ کرام کے اجتہادات کا درجہ ہے۔ یہ اجتہادات اس ماحول کے مطابق ہیں، جس میں اس ماحول سے مانوس لوگ رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں امام ابوحنیفہؒ کے اجتہادات سے لوگ مانوس چلے آرہے ہیں۔ سال ہا سال سے یہاں کے لوگ امام ابوحنیفہؒ کی اور انڈونیشیا اور ملائیشیا کے لوگ امام شافعی کی تقلید کرتے آرہے ہیں اوران کے اجتہادات کو دین کی درست اور صحیح تعبیر و تشریح مان کران پر عمل کرتے آرہے ہیں، لیکن اس ماحول سے نکل کر آپ امریکا جائیں اور امریکا کے نومسلم کو زبردستی کہیں کہ تم ہاتھ یہاں باندھو، وہ کہے کہ میں یہاں باندھتا آرہا ہوں، آپ کہیں کہ آپ کی نماز نہیں ہوئی۔ اب وہ بے چارہ جو دس سال سے یہاں ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتا چلا آرہا ہے، آپ نے اس کی نماز کو شک میں ڈال دیا۔ کسی مالکی امام کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کے باعث وہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتا ہے تو آپ نے کہا کہ اس طرح تو نماز نہیں ہوتی۔ اب وہ غریب پریشان ہے کہ میں کیا کروں؟ میری نماز ہوئی کہ نہیں؟

یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو ان کی حدود میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک دفعہ مجھے بقرعید پر انگلستان کے ایک مسلم علاقے میں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ طے ہوا کہ سارے مسلمان ایک جگہ پر عید ادا کریں گے۔ اب ایک خاص علاقے کے لوگوں کا اصرار تھا کہ عید منانے کا طریقہ یہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ بچپن سے ہم اسی طرح مناتے چلے آرہے ہیں اور ہمارے آباواجداد اسی طرح کرتے آرہے ہیں۔ ایک دوسرے علاقے کے مسلمانوں کا اصرار تھا کہ ہم ایسے کریں گے۔ وہاں کے مقامی مسلمان تھے، جن میں ایک شخص ایسا تھا جس کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان سے اچھا مسلمان شاید زندگی میں نہیں دیکھا اور اگر دیکھا ہے تو ایسے بہت تھوڑے

ہوں گے۔ وہ نو مسلم انگریز اور اس کا بیٹا حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اسلام کیا ہے؟ کہنے لگے کہ آپ بتائیں کہ ہم کیسے عید منائیں؟ آپ جیسے کہیں گے، ہم ویسا کریں گے۔ ترک کہتے تھے ایسے کرو، پاکستانی کہتے تھے نہیں ایسے کرو، مصری کہتے تھے ایسے کرو۔ حال آں کہ عید کا حکم شریعت میں ہے، لیکن شریعت اس کی تفصیلات کے بارے میں کچھ نہیں کہتی۔ ہمارا ایک رواج ہے، جو شریعت کے مطابق ہے تو قابل قبول ہے اور شریعت سے متعارض نہیں ہے تو بھی قابل قبول ہے، لیکن وہ دین اور شریعت نہیں ہے۔ وہ بس ہمارے یہاں کا رواج ہے۔

اس لیے دین کے جو کلیات اور قرآن وسنت کی جو نصوص ہیں، وہ دین کی دعوت کا موضوع ہیں، باقی چیزیں دعوت کا موضوع نہیں ہیں۔ وہ تحقیق، رائے، فتویٰ اور اجتہاد اور ایک ذاتی ذوق کا موضوع ہیں، ان کو دعوت کا موضوع نہیں بنانا چاہیے۔ دعوت کا موضوع وہ چیزیں ہیں، جو قرآن پاک، سنت اور دین میں متفق علیہ ہیں، اور وہ چیزیں صحابہ کرامؓ سے چلی آرہی ہیں۔ جو چیزیں صحابہ کرام میں متفق علیہ نہیں تھیں، وہ دین نہیں ہو سکتیں۔ اگر آپ کہیں کہ ان اختلافی آرا میں سے کوئی ایک رائے ہی دین ہے تو جو صحابہ اس رائے سے اختلاف کرتے تھے، گویا نعوذ باللہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ جو چیز تابعین میں متفق علیہ نہیں تھی، وہ دین نہیں ہے۔ وہ اجتہاد ہے، رائے ہے اور فتویٰ ہے۔ اگر آپ اسی رائے کو دین کہیں گے تو دوسری رائے کو کیا کہیں گے؟

تیسری اور آخری چیز جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اور خاص طور پر جو بنیادی طور پر دین کا حوالہ رکھتے ہیں، وہ دوسروں کے بارے میں رائے دینے میں بعض اوقات جلد بازی کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں طرح طرح کے عقائد موجود ہیں۔ مسلمانوں کا جو تصور علم ہے، وہ اکثر وبیش تر عامۃ الناس کے لیے مانوس نہیں ہے۔ وہاں اصل بنیاد کو نظر انداز کر کے جب آپ کسی جزوی مسئلے پر رائے یا رویہ اختیار کریں گے تو وہ دین سے مزید دور ہو گا۔ ایسے بے شمار لوگ ملیں گے جو مسلمانوں سے ہم دردی رکھتے ہیں، اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور بہ حیثیت مجموعی اگر ان سے کہا جائے کہ آپ اسلام کو مانتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہاں مانتے

ہیں۔ اسلام کے خلاف کوئی بات ہو تو وہ دکھ بھی محسوس کرتے ہیں، لیکن کسی جزوی معاملے میں آپ کی بات نہیں مانتے تو ایسے لوگوں کے بارے میں جلد بازی میں کوئی فتویٰ صادر نہ کریں۔ ان کے تامل یا انکار کو اسلام کے بارے میں تامل یا اسلام کا انکار قرار نہ دیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دین کے نام پر ہم جو کچھ انہیں بتارہے ہیں، اس میں یہ تمام چیزیں یعنی نصوص، اجتہادات، انفرادی بزرگوں کا ذوق اور کسی مقامی علاقے کا اسلامی رواج سب کچھ شامل ہے۔ اب اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ میں اس رواج کو نہیں مانتا، یہ غلط رواج ہے تو آپ اس کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ اتنا ہی اچھا مسلمان ہو سکتا ہے جتنا کوئی اور۔ اسی طرح اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں بزرگ کی پگڑی کا اسٹائل بڑا فضول ہے، میں نہیں مانتا تو محض اتنی سی بات پر اس کو دین سے دور قرار نہ دیں، اس لیے کہ کسی بزرگ کی پگڑی کے اسٹائل کو فضول کہنے سے آدمی نہ فاجر ہوتا ہے، نہ فاسق اور نہ کچھ اور۔ اس حد تک بھی درست ہے کہ وہ کہے کہ میں امام ابو حنیفہؒ کے اجتہاد کو نہیں مانتا۔ آپ دلائل سے امام صاحب کے اجتہاد کی مدافعت تو ضرور کریں، مگر گستاخی اور جہالت کا کوئی عنصر نہ آنے پائے۔ یہ قابل اعتراض بات ہے۔

البتہ اگر کوئی شخص نصوص کا انکار کرے تو وہ مسئلہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی اصل ضرورت تعلیم اور تفہیم کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ جو چیزیں اسے بتائی جاتی ہیں، بہ ظاہر وہ غلط محسوس ہوتی ہیں۔ وہ اس لیے غلط معلوم ہوتی ہیں کہ وہ شریعت کا حکم ہی نہیں ہے۔ وہ شریعت کے حکم کے طور پر اس کو سمجھتا ہے۔ اس لیے اس میں کسی جلدبازی کا مظاہرہ نہ کریں، بل کہ یہ محسوس کریں کہ چوں کہ اس کی دینی بنیاد کمزور ہے، اس بنیاد پر جو عمارت کھڑی ہے، اس کی کبھی ایک اینٹ گرتی ہے اور کبھی دوسری۔ تو کسی ایک اینٹ کے گرنے کی وجہ سے اس فرد پر قدغن نہ لگائیں۔ اس اینٹ کو کچھ نہ کہیں، عمارت کو دیکھیں کہ اس کی بنیاد درست ہے یا نہیں۔ بنیاد کو درست کرنے کی کوشش کریں۔ جزوی اصلاحات پر اتنا زور دینا کہ اصل عمارت اور بنیاد نظر انداز ہو جائے، درست رویہ نہیں۔

مسلکی اختلاف اور اس کی حدود

پاکستان میں فرقہ وارانہ اختلاف رائے اور مسلکی آرا اور نظریات کا تنوع شروع سے رہا ہے۔ مسلک کا وجود فی نفسہ مذموم نہیں، کیوں کہ یہ آزادیٔ رائے کا لازمی نتیجہ ہے۔ آزادیٔ رائے کا حق دنیا کے ہر مہذب نظام میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلام وہ پہلا مذہب ہے، جس نے اختلاف رائے کی نہ صرف اجازت دی ہے، بل کہ اس کو ایک پسندیدہ چیز قرار دیا ہے۔ مسالک کا تنوع اور رائے کا صحت مندانہ اختلاف اسلام کی بہت بڑی خوبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایات میں اہل علم کے اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا ہے۔

صرف مذہبی عقائد ہی نہیں، بل کہ علم و دانش کے ہر شعبے میں آرا کا اختلاف ایک حقیقت ہے اور یہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی انسانی فکر کی تاریخ۔ یونانی فلسفہ ہو یا قدیم ہندو ریاضی، جاہلی عربی شاعری ہو یا بائبل کے مذہبی تصورات، اختلاف رائے اور اس کی بنیاد پر مسالک کا وجود ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔

اسلام نے اس اہم انسانی حقیقت کو روز اول سے نہ صرف تسلیم کیا، بل کہ اس کو صحت مندانہ اور تعمیری بنیادوں پر فروغ دینے کے لیے ایک فکری اور علمی بنیاد بھی فراہم کی۔ اسلامی عقائد کی رو سے کسی قوم کے بنیادی تہذیبی نظریات اور مذہبی تصورات ناقابل تغیر ہوتے ہیں۔ اسلامی اصطلاحات میں جن امور کو عقائد اور نصوص قطعیہ کہا گیا ہے، وہ اسلامی معاشرے کی فکری حدبندی کرتے ہیں۔ ان کی

وجہ سے اسلامی نظریے کو تسلسل اور دوام عطا ہوتا ہے، ان کی وجہ سے اسلام کے امتیازی اوصاف کو تحفظ ملتا ہے اور ان ہی کی وجہ سے اسلام نے مشکل سے مشکل حالات میں اپنے تشخص کو برقرار رکھا ہے۔ اسلامی تعلیم کی رو سے آزادئ فکر اور اختلاف رائے کا دائرہ عقائد اور نصوص قطعیہ کے تسلسل، دوام اور قطعیت پر اثرانداز نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں چیزیں بڑی حد تک اس دائرے سے ماورا ہیں، البتہ اس دائرے سے باہر اجتہاد اور اجماع کا ایک میدان ہے، جس میں اختلاف رائے کی اتنی گنجائش ہے کہ کسی اور مذہب میں اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ اجتہاد و اجماع اور قیاس واستدلال کی بنیاد پر اسلامی تاریخ کے بہترین دماغوں نے اسلامی فکر اور تہذیب کو وسعت بخشی۔ نہ صرف خالص مذہبی خیالات اور تصورات کے باب میں، بل کہ قانون، فلسفہ، عقلیات، سیاسیات، طب، سائنس اور نفسیات، بل کہ صرف ونحو اور ادبیات میں بھی مختلف مکاتب فکر کا وجود تاریخ میں روز اول سے رہا ہے۔ ان بے شمار علمی اور فکری رجحانات کی موجودگی نے اسلام کے فکری سرمائے میں وسعت پیدا کی اور جزیرۂ عرب کے مختلف قبائل کے علاوہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والی قریب قریب ہر قوم کے مثبت اور تعمیری عناصر کو اپنے اندر سمولیا۔

افکار وخیالات کا یہ اختلاف اور نظریات و آرا کا یہ تنوع بڑی مثبت اور خوش آئند چیز ہے، بہ شرطے کہ یہ اپنی حدود کے اندر رہے۔ جب یہ اختلاف اپنی فطری حدود سے نکلتا ہے تو یہ امت میں افتراق اور تشتت کا باعث بنتا ہے۔ یہ افتراق اگر جاری رہے تو تحزب (گروہ بندی) کا اور تشتت اگر جاری رہے تو تشدد کا موجب بنتا ہے۔ افسوس کہ ہمارے ملک میں مختلف اسباب کی بنا پر ایسا ہی ہوا۔ وہ مسالک جنھوں نے مل کر ۱۸۵۷ء میں انگریز کے خلاف آزادی کی جنگ شروع کی تھی، جنھوں نے مل کر تحریک خلافت اور دوسری دینی و ملکی تحریکات میں حصہ لیا تھا اور جن کی غالب اکثریت نے بہ یک آواز قیام پاکستان کے لیے قائداعظم محمد علی جناحؒ کا ساتھ دیا تھا، مختلف اسباب کی بنا پر اپنی وحدت کو برقرار نہ رکھ سکے۔ وہ یہ بھول گئے کہ اگر جماعت میں کثرت نہ ہو تو وہ استبداد اور کلیت پسندانہ رجحانات اختیار

کر لیتی ہے اور کثرت اگر وحدت کا رشتہ چھوڑ دے تو تباہی اس کا مقدر ہوتی ہے۔

اس وقت یہ بحث غیر ضروری ہے کہ مختلف مسالک میں تحزب اور تشدد کیسے پیدا ہوا، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں اس کے جراثیم پیدا ہوئے اور ۱۹۹۰ء کے عشرے کے آغاز میں اس تحزب اور تشدد نے ایک عفریت کی شکل اختیار کر لی۔ یہ پورا زمانہ مذہبی تشدد اور دہشت گردی کا دور ہے۔ اس کے اسباب نہ صرف اندرون ملک کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی پالیسیوں میں تلاش کیے جانے چاہییں، بل کہ خطے کی دیگر قوتوں کی پالیسیاں بھی اس کو ہوا دینے کا سبب رہی ہیں۔ مثال کے طور پر مخصوص مذہبی عقائد کی اشاعت میں غیر ضروری سختی، بعض مذہبی سیاسی تصورات کو بہ زور بازو بر آمد کرنے کی کوشش اور بعض اقلیتی خیالات اور تصورات کی غیر ملکی سرپرستی، یہ وہ چیزیں ہیں، جنہوں نے صورت حال کو کشیدہ بنایا، جس کے نتیجے میں متعدد تشدد پسند گروہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اگر فقہی اور کلامی اختلافات کو ان حدود کے اندر رکھا جاتا جو شریعت نے متعین کی ہیں تو اس کی گنجائش نہ ہوتی اور نہ اختلافات کسی تشدد اور منافرت کا ذریعہ بنتے۔ ہمارے ملک میں افسوس کی بات یہ ہے کہ دعوت، تبلیغ، فتویٰ، ذوق اور افتادِ طبع، ان سب چیزوں کے مابین اس طرح خلطِ مبحث ہوا ہے کہ ان سب کے تقاضے مجروح ہو کر رہ گئے ہیں۔

یہ بات ہم میں سے ہر ایک کو یاد رکھنی چاہیے کہ جہاں تک دین کی دعوت کا تعلق ہے تو وہ صرف ان اساسات اور ضروریات دین تک محدود رہنی چاہیے جو قرآن مجید کی نص قطعی، حدیث متواتر اور سنت ثابتہ کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے جہاں جہاں دین کی دعوت پہنچائی، انھوں نے ان ہی امور تک اپنی کاوشوں کو محدود رکھا۔ بہت سے مسائل کے بارے میں صحابہ کرامؓ کے مابین بھی فقہی اور کلامی اختلاف رائے موجود تھا، جس سے حدیث اور فقہ کے طلبہ بہ خوبی واقف ہیں۔ نہ صرف صحابہ کرامؓ، بل کہ تابعین اور تبع تابعین اور دیگر ائمہ مجتہدین اور ائمہ فقہ، کبار صحابہ کی آرا سے اختلاف کرتے آئے ہیں، لیکن ان

اختلافی مباحث کو انہوں نے نہ تو کبھی عام دعوت و تبلیغ کا موضوع بنایا اور نہ غیر ضروری طور پر ان مباحث کو عامۃ الناس کی مجالس میں زیر بحث لائے۔ یہ امور فتوے کا موضوع ہیں اور صرف اس وقت سامنے لائے جاتے ہیں، جب کسی (مسلم) فرد یا گروہ کو ان امور میں فتویٰ لینے کی کوئی حقیقی اور واقعی ضرورت پیش آئے۔ فتوے کا اصول یہ ہے کہ وہ مفتی کی طرف سے از خود نہیں دیا جاتا، بل کہ کسی مستفتی کے استفتا کے جواب میں جاری کیا جاتا ہے۔ فتوے کے دائرۂ کار میں جو مسائل آتے ہیں، وہ دعوت و تبلیغ کے مسائل سے قطعاً مختلف ہیں۔ جب بھی مسائل فتوے کو دعوت و تبلیغ کا اور مسائل دعوت و تبلیغ کو فتویٰ کا موضوع بنایا جائے گا، امت میں غیر ضروری تشویش اور تحزب پیدا ہو گا۔

فتوے سے اگلا مرحلہ تحقیق کا ہے۔ تحقیق کے موضوعات فتوے کے موضوعات سے مختلف ہیں۔ تحقیق ایک محقق کی ذاتی کاوش کے نتائج اور ثمرات ہیں۔ تحقیق سے دل چسپی صرف محققین ہی کو ہو سکتی ہے اور وہی اس کے بارے میں کوئی رائے دینے کے اہل ہیں۔ تحقیق ہی کی بنیاد پر کسی خاص شعبۂ علم میں کوئی مکتب فکر جنم لے سکتا ہے۔ کسی غیر محقق یا عامی کا اس میں دخل دینا یا محض گروہی جذبات، عصبیت یا ایسے ہی دوسرے غیر علمی اور غیر تحقیقی محرکات کی بنیاد پر اپنے آپ کو کسی خاص نقطۂ نظر کا موید یا حامی قرار دینا بھی بعض اوقات مسائل و مشکلات کا سبب بن جاتا ہے۔ فقہائے متقدمین نے اس صورت حال کا کافی پہلے اندازہ اور ادراک کر لیا تھا۔ ان کا وضع کردہ یہ اصول قدیم کتابوں میں ملتا ہے کہ **العامی لامذھب له**، یعنی کسی غیر محقق اور عامی کا کسی مکتب فکر سے وابستگی ظاہر کرنا بے معنی چیز ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی ایسا شخص جو فلسفے کی اصطلاحات سے بھی ناواقف ہو، وہ اپنے کو مشائی یا اشراقی قرار دے اور ان لوگوں کے خلاف شمشیر برہنہ لے کر میدان کارزار میں نکل آئے جو دوسرے مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں، یا کوئی ایسا شخص جو عربی زبان کی صرف و نحو سے نابلد ہو اور کسی علاقائی یا دوسری عصبیت کی بنا پر اپنے آپ کو کوفی یا بصری کہلوانے پر اصرار کرے اور اس کی بنیاد پر کسی جتھابندی میں

شریک ہو۔

جتنا کسی عامی کا اپنے آپ کو مشائی، اشراقی، کوفی یا بصری قرار دینا مضحکہ خیز ہے، اتنا ہی یہ بات بھی مضحکہ خیز ہے کہ ایک غیر محقق عامی خود کو اشعری یا ماتریدی قرار دے یا فقہی معاملات کی ابجد کی واقفیت حاصل کیے بغیر خود کو حنفی یا شافعی قرار دیے جانے پر اصرار کرے اور اس کی بنیاد پر غیر ضروری عصبیت یا جتھا بندی میں شریک ہو۔ یہ سب امور تحقیق کے موضوعات ہیں، جن سے صرف محققین ہی کو دلچسپی ہو سکتی ہے اور محققین تک ہی ان امور کو محدود رہنا چاہیے۔

تحقیق کے بعد اگلا درجہ مشرب، ذوق اور افتاد طبع کے مراحل کا آتا ہے، جہاں تحقیق و افتا کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے مختلف اہل علم اور اہل ذوق اپنے اپنے مزاج اور افتاد طبع کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اسلامی شریعت میں اتنی جامعیت موجود ہے کہ ہر ذوق اور ہر مزاج کے انسان کو اپنے اندر سمو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ شریعت کا یہ مطالبہ ہرگز نہیں ہے کہ لوگ اپنے ذاتی ذوق، مزاج اور افتاد طبع کو بالکلیہ ختم کر دیں۔ ان سب امور کو افراد کی زندگیوں میں باقی رکھنے اور ان کو ترقی دینے کی پوری گنجائش اسلامی شریعت میں موجود ہے۔ صحابہ کرام کو دیکھیے، ان میں ایسے حضرات بھی ملتے ہیں جو مختلف معاملات کو خالص عقلی اور غیر جذباتی پیمانوں پر پرکھنے کے عادی تھے۔ اس کے برعکس ایسے صحابہ کرام ؓ کی بھی کمی نہ تھی، جو مختلف معاملات کو بڑے عاشقانہ اور والہانہ انداز میں دیکھتے اور اسی انداز میں فیصلہ کرتے تھے۔

ذوق، افتاد طبع اور مزاج کے اس فرق اور تنوع کی وجہ سے اہل علم کے انداز تحقیق اور اہل تزکیہ وارشاد کے طرز تربیت میں بھی فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے اختلاف یا فرق کا وجود صرف اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت کے عمومی اور جامع نظام میں متنوع قسم کی چیزوں کو سمو لینے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ شریعت ان میں سے ہر ذوق اور مزاج کو اپنی حدود و شرائط کے مطابق قبول کرتی ہے، لیکن اس میں کسی بھی ذوق یا افتاد طبع کو کسی شخص کے لیے لازمی یا واجب

الا تباع ہر گز قرار نہیں دیتی۔ لازمی اور ضروری قرار دینا تو دور کی بات ہے، ان میں سے کسی ایک ذوق یا رویے کو دوسرے کے مقابلے میں قابل ترجیح قرار دینا اور دوسروں سے منوانا بھی شرعاً پسندیدہ نہیں۔

صحابہ کرام ؓ کے طرز عمل سے اس توازن کی نشان دہی ہوتی ہے، جو اس معاملے میں مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ صحابہ کرام ؓ میں جہاں حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن مسعود جیسے عاشقانہ مزاج رکھنے والے فدائی شامل تھے، وہاں ان میں حضرات شیخین جیسی شخصیتیں بھی موجود تھیں، جن کے فیصلے خالص عقل و شریعت کی بنیاد پر ہوا کرتے تھے اور کسی قسم کے جذبات یا شخصی احساسات کو ان میں اثر انداز ہونے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں رویوں کی بہ یک وقت تحسین و تصویب فرمائی ہے۔ اس ضمن میں سب سے نمایاں اور دل چسپ مثال بنی قریظہ کی گڑھی میں نماز عصر کی ادائیگی کے حکم کی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خندق کے خاتمے کے فوراً بعد حکم دیا کہ لشکر اسلام میں شریک تمام سپاہی فوری طور پر بنی قریظہ کی گڑھی کی طرف روانہ ہو جائیں اور اس کا محاصرہ کرلیں، تا کہ یہودیوں کو ان کی غداری کی فوری سزا دی جاسکے۔ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات ارشاد فرمائی، وہ یہ تھی کہ تم میں سے کوئی شخص ہر گز ہر گز بنی قریظہ کی گڑھی میں پہنچے بغیر عصر کی نماز نہ پڑھے۔ اس ارشاد گرامی کے مطابق صحابہ کرام ؓ کے دستے روانہ ہو گئے اور بنی قریظہ کی گڑھی کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ ابھی بنی قریظہ کا علاقہ کافی دور تھا کہ عصر کا وقت تنگ ہونا شروع ہو گیا اور صحابہ کرام کو یہ یقین ہو گیا کہ غروب آفتاب سے پہلے بنی قریظہ کے علاقے میں پہنچنا ممکن نہیں۔ اب یہاں صحابہ کرام ؓ کے مابین ایک اختلاف رائے سامنے آیا۔ کچھ حضرات کا خیال تھا کہ بنی قریظہ کے علاقے میں نماز عصر ادا کرنا فی نفسہ مقصود نہ تھا، بل کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں پہنچنے میں جتنی جلدی ممکن ہو، اس کی کوشش کی جائے۔ اس لیے اگر غروب آفتاب سے پہلے نماز عصر کے وقت کے اندر اندر وہاں پہنچنا ممکن نہیں تو اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ نماز

عصر قضا کر دی جائے۔ جو حضراتِ صحابہ کرام ؓ اس رائے کے حامی تھے، انہوں نے عصر کی نماز بروقت راستے ہی میں ادا کر لی اور بنی قریظہ کے علاقے میں پہنچنے کا انتظار نہ کیا۔ بہ ظاہر ان حضرات نے ایک صریح حکم کی خلاف ورزی کی اور اپنی ذاتی رائے سے ایک ایسی چیز طے کر لی، جو بہ ظاہر حضور رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایات سے متعارض تھی۔ اس کے برعکس صحابہ کرام کی ایک دوسری جماعت تھی، جس نے مذکورہ بالا رائے سے اختلاف کیا۔ انہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے واضح اور دوٹوک ہدایات آجانے کے بعد اب ہمارے لیے اپنی ذاتی رائے پر عمل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہم نماز عصر بنی قریظہ کے محلے میں جا کر ہی ادا کریں گے، چاہے وہاں پہنچنے میں ہمیں آدھی رات ہو جائے۔ ان حضرات نے ہدایات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر پر عمل کیا اور عصر کی نماز قضا کر دی۔ بعض روایات کے مطابق مغرب بھی قضا ہوئی اور ان حضرات نے رات گئے عصر، مغرب اور عشا کی نمازیں ایک ساتھ بنی قریظہ کے علاقے میں پہنچ کر ادا کیں۔

اگلے روز دونوں جماعتوں نے اپنا اپنا نقطۂ نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور حضور سے اس کی تصویب وتصحیح کے خواہاں ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تصویب فرمائی اور دونوں کے نقطۂ نظر کو حق بہ جانب قرار دیا۔

اس مثال سے یہ بات بہ خوبی واضح ہو جاتی ہے کہ شریعت کے کسی حکم کو سمجھنے اور اس کی تعبیر وتشریح کرنے میں دیانت داری سے اختلاف رائے کی پوری پوری گنجائش موجود ہے اور حکم شرعی کی تفسیر وتشریح میں کسی شخص کی افتاد طبع، مزاج اور رویے کی گہری تاثیر ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا مثال میں اول الذکر حضرات نے حکم نبوی کی تفسیر خالص عقلی اور منطقی انداز میں کی، جب کہ موخر الذکر کی تفسیر کا انداز عاشقانہ اور والہانہ نوعیت کا ہے۔

اس انداز کے اختلافات ہر دور میں رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ بزرگان دین اور اکابر اسلام میں بھی اس طرح کے اختلافِ ذوق اور اختلافِ مزاج کی مثالیں ملتی ہیں، جس کے اثرات ان کے دینی رویے اور روحانی انداز تربیت پر بھی پڑتے ہیں۔

مسلمانوں کا طریقہ روز اول سے یہی رہا ہے کہ عامۃ الناس میں سے جس کو جس بزرگ اور دینی شخصیت کے ذوق اور مزاج سے ہم آہنگی محسوس ہوئی، وہ ان کے حلقے سے وابستہ ہو گیا۔ ان حضرات کے آپس کے اختلاف مزاج اور اختلافِ ذوق کی کم وبیش وہی نوعیت تھی، جو ایک باپ لیکن مختلف ماؤں کی اولادوں میں عموماً پائی جاتی ہے۔ اس معاملے میں ان کے طرز عمل کی عکاسی اس عرب شاعر کے شعر میں ہوتی ہے، جس نے کہا تھا:

عباراتنا شتی وحسنك واحد
وكل الى ذاك الجمال يشير

گو ہمارے الفاظ مختلف ہیں، لیکن تمہارا حسن ایک ہی ہے، اور یہ سب رتمہارے حسن کا ہی چرچا کر رہے ہیں۔

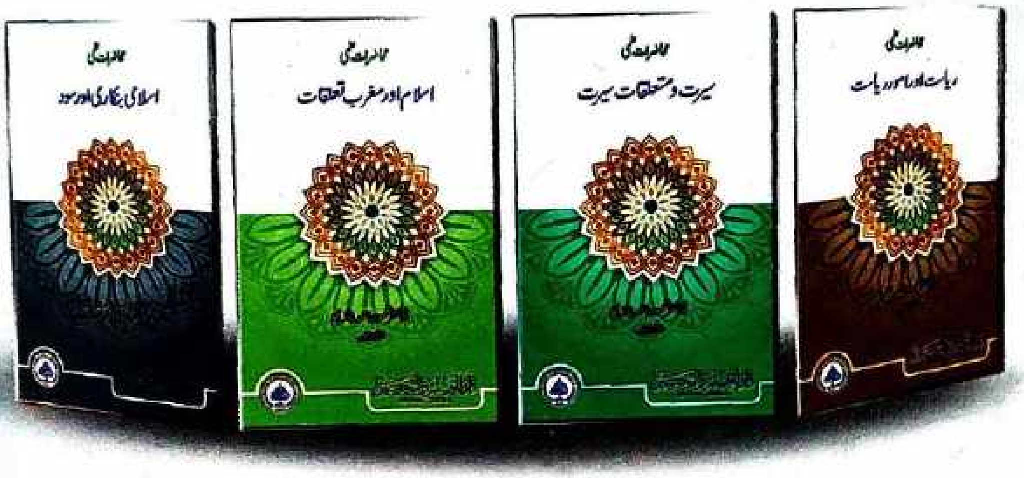
ہمارے ہاں اکثر وبیش تر کم علمی اور کم فہمی کی وجہ سے اور کسی حد تک دوسرے سیاسی اور مادی محرکات وعوامل کی وجہ سے اس اختلاف کو نمایاں کیا گیا اور اس کو وہ اہمیت دے دی گئی جو شریعت میں اس کو ہرگز حاصل نہیں اور مسلمانوں میں کبھی بھی حاصل نہ تھی۔ شروع شروع میں یہ چیزیں تقابلی گفت گوؤں کے انداز میں سامنے آئیں۔ پھر ہر شخص نے اپنے پسندیدہ بزرگانِ دین کے طرز عمل کو معیاری اور دوسرے بزرگانِ دین کے طرز عمل کو غیر معیاری قرار دے دیا اور ہوتے ہوتے یہ چیزیں باہمی تنازعات اور تحزب کا ذریعہ بن گئیں اور یوں مجتہدین کی اجتہادی آراضروریات دین قرار پائیں، محققین کی انفرادی تحقیق کو نصوص شریعت جتنی اہمیت دے دی گئی اور بزرگوں کے شخصی ذوق اور رجحانات کو مسلکوں کی شکل میں منظم کرلیا گیا۔

یوں تو یہ آفت انگریزی دور میں ہی پلی اور بڑھی، انگریزی استعمار کی مصلحتوں نے ہی اسے مہمیز دی اور انگریز نے ہی اس چیز کو مسلمانوں کی قوت کو کمزور کرنے کے لیے استعمال کیا، لیکن پاکستان بننے کے بعد بالخصوص ۱۹۷۰ء کے اوائل سے یہ سارے مسلکی اختلافات انتخابی میدان میں داخل ہو گئے، انتخابی رنجشوں نے

مسلکی اختلافات کی زبان اور محاورہ اپنایا اور یوں بہ تدریج یہ چیز مسلمانوں کو تقسیم در تقسیم کرنے کا ایک خود کار ذریعہ بن گئی۔ رہی سہی کسر اس اختلاف میں غیر ملکی عناصر کی دل چسپی نے پوری کر دی۔ بیرونِ پاکستان کی متحارب قوتوں نے اپنے آپس کے اختلافات کو پاکستان برآمد کر دیا اور اپنے اپنے حامیوں کی مدد سے اپنی ذاتی جنگ پاکستان کی سرزمین پر لڑنی شروع کر دی۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم از سر نو پوری صورت حال پر غور کریں اور اپنے دینی معاملات کو خود ہی طے کریں۔ غیر پاکستانی عناصر کو پاکستان کی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت ہرگز نہ دیں۔ جس طرح غیر مسلم قوتوں کا پاکستانی سرزمین کو حربی اور عسکری مقاصد کے لیے استعمال کرنا غلط ہے، اسی طرح دوسری قوتوں کا ہماری سرزمین کو اپنے سیاسی اور گروہی مقاصد کے لیے استعمال کرنا بھی غلط ہونا چاہیے۔

محاضرات علمی



ڈاکٹر محمود احمد غازی
رحمۃ اللہ علیہ

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز
info@rahet.org www.rahet.org